اردو کے بہترین شخصی خاکے

مرتبہ

مبین مرزا

محمد حسین آزاد　مرزا فرحت اللہ بیگ　مولوی عبدالحق　آصف علی　رشید احمد صد

برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی　مولانا عبدالماجد دریابادی　جوش ملیح آبادی　خواجہ غلام ا

سرت　بے نند کمار　رئیس احمد جعفری　عبدالماجد سالک　ملا واحدی　شوکت

سید ضمیر جعفری　اخلاق احمد دہلوی　انیس قدوائی　اشرف صبو

عصمت چغتائی　غلام عباس　سعادت حسن منٹو　دیوان

کتابی دنیا دہلی

اردو کے

بہترین شخصی خاکے

انتخاب و ترتیب

مبین مرزا

URDU KE BEHTREEN SHAKHSHI KHAKE

by

MUBEEN MIRZA

Year of Edition : 2004

ISBN-81-87666-85-4

Price Rs. 250/-

نام کتاب.......................... اردو کے بہترین شخصی خاکے

مرتب.......................... مبین مرزا

سنہ اشاعت.......................... ۲۰۰۴ء

قیمت.......................... ۲۵۰ روپے

مطبع.......................... کاک آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی

KITABI DUNIYA

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
Phone: 23288452, Reliance Mobile: 35972589
E-mail: kitabiduniya@rediffmail.com

ابا جان مرحوم کے نام

فہرست مضامین

جلد اول

1	پیش نامہ	مبین مرزا	9
2	ملک الشعراء، خاقانی ہند، شیخ ابراہیم ذوق	محمد حسین آزاد	18
3	ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	45
4	نام دیو مالی	مولوی عبدالحق	87
5	میرن صاحب	آصف علی	91
6	کندن	رشید احمد صدیقی	97
7	پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی	109
8	منشی پریم چند	جے نند کمار	117
9	مولانا محمد علی	مولانا عبدالماجد دریابادی	124
10	نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی	جوش ملیح آبادی	132
11	شمع محفل (سید راس مسعود)	خواجہ غلام السیدین	140
12	آغا حشر	چراغ حسن حسرت	152
13	مولانا حیدر حسین خاں	رئیس احمد جعفری	165

14	مولانا گرامی (مولانا غلام قادر)	عبدالمجید سالک	194
15	مصورِ غم علامہ راشد الخیری	ملا واحدی	205
16	عندلیب شادانی	شوکت سبزواری	211
17	عبدالمجید سالک	شورش کاشمیری	222
18	سنگار پور کا میجر حسرت	سید ضمیر جعفری	248
19	سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا (نہال سیوہاروی)	اخلاق احمد دہلوی	269
22	چودھری محمد علی ردولوی	انیس قدوائی	276
21	مٹھو بھٹیارہ	اشرف صبوحی دہلوی	284
22	ہندوستان کا مامِ دین (سوامی پارس ناتھ جی)	دیوان سنگھ مفتون	290
23	مرلی کی دھن (شیام)	سعادت حسن منٹو	302
24	راشد۔ چند یادیں	غلام عباس	322
25	دوزخی (عظیم بیگ چغتائی)	عصمت چغتائی	330
26	منٹو۔ میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک	339

دوسری جلد

27	جی.جی.جی (دیوندر ستیارتھی)	میرزا ادیب	413
28	باندی (اماں)	ممتاز مفتی	433
29	سید امتیاز علی تاج	شوکت تھانوی	441
30	میر ناصر علی	شاہد احمد دہلوی	447
31	جگر مرادآبادی	مالک رام	462
32	مولانا صلاح الدین احمد	عاشق حسین بٹالوی	483
33	یادِ ایامِ صحبت فانی	تابش دہلوی	495
34	ممتاز حسن	جلیل قدوائی	507

35 عابد صاحب	محمد طفیل	525
36 سید سجاد حیدر یلدرم	قرۃ العین حیدر	534
37 فالتو آدمی (زاہد ڈار)	انتظار حسین	553
38 ایک دوست کا مرقع (احمد ندیم قاسمی)	محمد خالد اختر	568
39 کنہیا لال کپور	فکر تونسوی	586
40 فراق صاحب سے میری ملاقاتیں	گیان چند	602
41 بسمل سعدی ٹونکی	نثار احمد فاروقی	625
42 ان داتا (کرشن چندر)	فارغ بخاری	634
43 ساحر لدھیانوی	حافظ لدھیانوی	642
44 شاہد احمد دہلوی	صادق الخیری	672
45 مینا کماری	خواجہ احمد عباس	699
46 سچا اور سُچا قہقہہ (ابراہیم جلیس)	رحیم گل	706
47 لذت آشنائے تلخی دوراں (شوکت)	ڈاکٹر اسلم فرخی	713
48 اباجان مرحوم (محمد اقبال)	داؤد رہبر	738
49 سروجنی نائیڈو	آغا حیدر حسن	754

تیسری جلد

50 ہمارے مولوی صاحب (مولوی عبدالحق)	حمیدہ اختر حسین رائے پوری	771
51 سراج الدین خان سائل	جمیل الدین عالی	823
52 استاد رسا دہلوی	ڈاکٹر خلیق انجم	846
53 محمد حسن عسکری	ڈاکٹر آفتاب احمد	858
54 سید سبط حسن	حمید اختر	888
55 رسالہ در معرفت ابنِ انشا	مشفق خواجہ	905

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
56	فیض احمد فیض	ساقی فاروقی	918
57	چھپن چھری (کشور ناہید)	احمد بشیر	935
58	پورٹریٹ (اطہر نفیس)	اسد محمد خاں	953
59	صادقین: رنگ و نور کا آدمی	مجتبیٰ حسین	959
60	چچی (محمد النساء)	اسلم پرویز	972
61	انگنا کہار	سید ضمیر حسن دہلوی	980
62	میراجی	سحاب قزلباش	986
63	اُپندر ناتھ اشک	کوشلیا اشک	996
64	نظیر صدیقی مرحوم	نظیر صدیقی	1012
65	جوگی (احمد بشیر)	یونس جاوید	1023
66	منٹو ماموں	حامد جلال	1037
67	ڈاکٹر زور: شخصیت	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	1060
68	بھائی ابا (یگانہ چنگیزی)	بلند اقبال بیگم (بنت یگانہ)	1082
69	بھاء جی (اختر شیرانی)	پروفیسر مظہر محمود شیرانی	1099
70	طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ	انور ظہیر خاں	1106

پیش نامہ

اوکتاویو پاز کی ایک کتاب کے دیباچے میں شمٹ نے اس کی شخصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑے لطف کی بات کہی ہے کہ اس سے ملتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ اس کی پوری شخصیت سے مل رہے ہیں۔اس کی دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ پاز اپنی زندگانی کے تمام ادوار میں بہ یک ساعت زیست کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔شمٹ نے پاز کے جس رویے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ اصل میں ایک طرزِ زیست ہے۔اگر ہم اپنے اطراف ایک ذرا سی توجہ کریں تو دور و نزدیک کچھ لوگ ایسے ضرور دکھائی دیں گے جن کی کیفیات اور احساسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی اُن کے اندر ایک ایک گھڑی میں کئی کئی سوانگ رچاتی ہے اور یہ گردشِ دوراں کا ایک ایک پل اُن پر پورا پورا جیون بن کر بیت جاتا ہے۔ایسے ہی لوگ ادب اور آرٹ کے لئے خام مواد ثابت ہوتے ہیں۔

یوں تو ادب کی تمام اصنا اپنے اپنے دائرے میں اسی قبیل کے لوگوں سے زندگی کا لمس پاتی ہیں لیکن خاکہ نگاری وہ صنفِ ادب ہے جس کے حسن اور چاشنی ہی کا نہیں بلکہ وجود و شہود تک کا انحصار سراسر ایسے لوگوں کی روش اور رونق پر ہے۔ اس لیے کہ خاکہ نگاری میں ایسے لوگوں کو اگر ایک طرف raw material کے طور پر برتا جاتا ہے تو دوسری طرف جو فنش پروڈکٹ ہمارے سامنے آتی ہے وہ بھی عین مین انھی کا نقشہ اور ہو بہو انھی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ہاں خاکہ نگار خطوط کو اُجاگر کرنے کے لیے ان

تصویروں میں کہیں کہیں رنگ و روشنی میں تناسب اپنے حسابوں پیدا کرتا ہے اور ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے ہمیں ایک زاویۂ نگاہ دیتا ہے۔ جس طرح اچھا ادیب اپنے مضمون یا افسانے کو نظریے کی جبریت اور فلسفے کی یبوست کا شکار نہیں ہونے دیتا، اسی طرح اچھا خاکہ نگار اپنے خاکوں پر ذاتی پسند ناپسند کے غیر فطری رنگوں کا رَدّا نہیں رکھتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ زیرِ تحریر شخصیت کو اس کے پورے سجاؤ کے ساتھ اور فطری انداز میں پیش کرے۔

منٹو کے مطابق سیدھے سادے، شریف اور قاعدے کے مطابق زندگی گزارنے والے لوگ دنیا اور اس کے نظامِ کار کے لیے تو مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں لیکن اُس کی کہانی کے لیے وہ کسی مصرف کے نہیں۔ منٹو نے یہ بات یوں تو صرف اپنی کہانیوں کے آڑے ترچھے بانکے ٹیڑھے کرداروں کے حق میں دفاعی انداز سے کہی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس کے اِس موقف کا اطلاق وسیع معنوں میں کہانی کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔ بندھے ٹکے انداز سے زندگی کرنے والے اِکہرے اور سپاٹ لوگ کسی عنوان خاکے کا موضوع نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ کہانی کی طرح خاکہ بھی جس حرارت سے نمو پاتا اور جس وضع سے معنی حاصل کرتا ہے اُس کے لیے کوئی فارمولا طے نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح ایک ہی سمندر کا پانی اپنی مختلف سطحوں پر حرارت اور تغیر کے مختلف پیمانے رکھتا ہے کچھ اسی طرح کا احوال اُن انسانوں کی زندگی کا ہوتا ہے جو مسلسل متحرک اور سرگرمی سے اپنے وجود کا اثبات چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ ڈھلے ڈھلائے سانچوں کو قبول نہیں کرتے بلکہ اپنی ساخت خود وضع کرتے ہیں۔ کہانی اور خاکے کا سروکار ایسے ہی لوگوں سے ہے جو اپنی انگلیوں کی پوروں تک زندگی سے لبریز ہوتے ہیں۔

بات کرتے کرتے مجھے معاً خیال آیا کہ میں خاکے کے ساتھ ساتھ مسلسل کہانی کا حوالہ دے رہا ہوں، کہیں اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں ان دونوں کو فن کا ایک ہی سلسلہ گردانتا ہوں اور دونوں کے لیے یکساں معیارات کا قائل ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ کہانی اور خاکے کے مابین ہیئت اور فن کا جو خطِ امتیاز کھنچا ہوتا ہے، میں اسے صاف دیکھ سکتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ کہانی ہی کی طرح خاکہ بھی حقیقت اور تخیل کے تال میل سے تخلیق ہوتا ہے لیکن کہانی کے برعکس خاکے میں لکھنے والے کے تخیل کی کارفرمائی آرائشِ بیاں اور لطفِ کلام کے لیے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کہانی کے فن کا بنیادی نکتہ suspension of belief ہے جب کہ خاکہ نگاری کا پہلا اور اہم ترین تقاضا suspension of disbelief ہے۔ یہ

دونوں اصول اُن دو کناروں کے مانند ہیں جن میں چاہے کتنی ہی مشابہتیں کیوں نہ تلاش کر لی جائیں لیکن انہیں کسی طور ایک نہیں کیا جا سکتا۔۔۔اس لیے کہ اُن کے بیچ حدِ امتیاز کی صورت جیتا جاگتا دریا بہتا ہے۔ کہانی اور خاکہ نگاری کی مثال ایسے ہی دو کناروں کی ہے۔

کہانی کا معاملہ کہانی کار کے اختیارِ کل سے ہے کہ اُس کے کرداروں کی بری بھلی تقدیر کلیتاً اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ چوں کہ اُن کا خالق ہوتا ہے اس لیے اُن کے ظاہر و باطن سے کماحقہ واقف ہوتا ہے، ان کا کوئی عمل نہ تو اُس سے پوشیدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کے لیے ناقابلِ فہم، گویا کہانی کے کرداروں کی مثال چاک پر دھری اُس مٹی کی سی ہوتی ہے جو کوزہ گر کی انگلیوں کے لمس سے صورت پاتی ہے۔ ادھر ماجرا یہ ہے کہ خاکے کی شخصیت ایک تراشیدہ مجسمہ ہوتی ہے جس کے ناک نقشے اور چہرے بشرے میں خاکہ نگار کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ اُسے تو بس اِس مجسمے کو اُٹھا کر طاق پر اس طور آویزاں کرنا ہے کہ وہ ریمبراں کی تصویروں کی طرح بہ یک وقت دُھوپ چھاؤں کی توسین کے قائمہ زاویہ پر ٹھہرا ہوا نظر آئے۔ بہ ظاہر سادہ اور آسان نظر آنے والا یہ کام اس قدر دشوار اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ کوئی خاکہ نگار اسے اُس وقت تک انجام دے ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنے موضوع کے خارج کے ساتھ ساتھ اُس کے داخل سے بھی بہ خوبی واقف نہ ہو۔ گویا خاکہ نگار کا ایک اہم فرضِ منصبی یہ بھی ٹھہرا کہ وہ زیرِ تحریر شخصیت کی درزوں سے اُس کے اندر جھانکنے اور ٹوہ لینے کے بعد جب اسے بیان کرنے بیٹھے تو اس کا انداز ایسا ہو کہ قاری زیرِ مطالعہ شخصیت کو تہ در تہ دیکھ سکے۔ اس بیان میں شرح و اختصار کا تناسب بھی بے حد اہم ہے کہ جو کچھ کہے بغیر بات بن سکتی ہے وہ ہرگز نہ کہا جائے اور جو کہنا از بس ضروری ہو اسے صحیح مقام پر اور موزوں تر پیرائے میں کہا جائے۔ گویا خاکہ نگار کی اپنے موضوع سے قربت اور شناسائی اور اپنے فن کا پختہ شعور ہی اسے نکتے سجھاتا اور راہ دکھاتا ہے۔

خاکہ نگاری کا فن وقائع نویسی اور تاریخ نگاری سے بھی حدِ فاصل رکھتا ہے۔ اس لیے کہ وقائع اور تاریخ لکھنے والوں کو پہلا آموختہ ہی یہ پڑھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے بیان پر اپنی ذات کو کسی طور اثر انداز نہیں ہونے دیں گے، خاکہ نگار پر ایسی کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ وہ اپنے موضوع کے ساتھ اپنے جذبے اور تعلق کو نہ صرف ظاہر کر سکتا ہے بلکہ ان کی شدت اور نوعیت کے بیان میں بھی چنداں مضائقہ نہیں۔ ہاں اِس قدر خیال خاکہ نگار کو رکھنا چاہیے کہ اُس کی شوخی اور سرشاری اُس سطح کو نہ پہنچے جہاں اُس کی ذات مقدم معلوم

ہو اور موضوع کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جائے۔ خاکہ نگار اپنے بیان کو عمیق رنگوں سے آراستہ کرنے کے لیے موضوع کے سماجی روابط کو بھی گفتگو کے دائرے میں لا سکتا ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ہر حوالہ زیرِ مطالعہ شخصیت سے ایسی مناسبت رکھتا ہو کہ اُس کا بیان موضوع گفتگو شخصیت کی نقشہ کشی کے زاویے کو ایک خاص رخ دینے میں معاون ثابت ہو۔ چیسٹرٹن نے برنارڈ شا پر اپنے تفصیلی مضمون میں اُس کے فن کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اُس کی شخصیت پر بھی خامہ فرسائی کی تھی۔ بعد ازاں کچھ لوگوں نے برنارڈ شا سے دریافت کیا کہ اِس مضمون کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟ برنارڈ شا کا جواب تھا کہ بھئی میں صرف وہ نہیں ہوں جو کہ گاہے گاہے میں خود کو بنا کر پیش کرتا ہوں بلکہ میں اتنا ہی وہ بھی ہوں جو عام طور سے دوسروں کو نظر آتا ہوں۔ خاکہ نگاری کے فن کے حوالے سے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔۔۔ یعنی پیشِ نظر شخصیت جو کچھ اور جیسی کچھ ہے اُس کی وقعت اپنی جگہ مسلم، لیکن دیکھنے والا اُسے دیکھ کس زاویے سے رہا ہے، یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں۔ پھر یہ معاملہ بھی توجہ طلب ہے کہ اپنے موضوع کا مشاہدہ کرتے ہوئے خود خاکہ نگار کی ذہنی کیفیت کیا ہے؟ ہر شخص زندگی کے ہر واقعے، ہر قصے اور رابطے میں آنے والے ہر آدمی کو اپنی ذہنی کیفیت کے فلٹر سے گزار کر دیکھتا ہے۔۔۔ لہٰذا جو رنگ اس گھڑی خود خاکہ نگار کے ذہنی فلٹر کا ہوتا ہے وہی اس پیشِ نظر شے کا نظر آتا ہے:

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

ایک ہی شخص کے بارے میں دو آدمیوں کی دو مختلف نہیں متضاد آرا کا اظہار۔۔۔ کس آن میں دیکھا کی تفسیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے!!

صنفِ ادب کی حیثیت سے اردو میں خاکہ نگاری کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہ ان اصنافِ ادب میں سے ہے جن کی صحیح معنوں میں ساخت پرداخت اور نمود کا زمانہ ابھی بہ مشکل پون صدی کو پہنچا ہے۔ یوں تو تذکروں اور روزنامچوں میں ہمیں پہلے بھی ایسے شخصی مرقعے نظر آتے ہیں جنھیں خاکہ نگاری کی ابتدائی شکلیں قرار دیا جا سکتا ہے لیکن مولانا محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں شخصی مرقعے اس طرح متحرک اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ ان میں سے اگر دیگر شخصیات کے ضمنی حوالوں اور شاعری کے جائزوں کو چھانٹ لیا جائے تو انہیں ایک الگ فن یا صنفِ ادب قرار دیا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے ایسی

شخصیات جن کے لیے مولانا آزاد عقیدت ومحبت کے جذبات رکھتے تھے، اُن کا نقشہ تو ''آبِ حیات'' میں کچھ اس طور کھینچا کیا گیا ہے کہ اُن کی جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ ابراہیم ذوق کا تذکرہ پڑھیے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ذوق کے زمانے میں جی رہے ہیں اور بہ چشمِ خود اُن کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ یہ مولانا آزاد کے قلم کا اعجاز ہے کہ ہم تذکرہ نویسی کے فنِ قدیم کے بطن سے ایک نئی صنفِ ادب کو جنم لیتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم اُس زمانے میں معجزۂ فن کی یہ نمود کچھ مولانا آزاد ہی تک محدود رہی، ان کے ہم عصر کسی دوسرے تذکرہ نگار کے یہاں ہمیں فن کی یہ نئی transformation دکھائی نہیں دیتی۔

زیرِ نظر انتخاب کے عمل سے گزرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ شخصی خاکہ نگاری کے باب میں ہمارے یہاں لگ بھگ پون صدی میں خاصا کام ہو چکا ہے اور اس سرمائے میں سے ایک ایسا کڑا انتخاب اِس اعتماد کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ اُسے اردو کی دوسری اصنافِ ادب کے کسی بھی معیاری انتخاب کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک ایسا مضمون ہمیں ملتا ہے جسے فنی قواعد پیشِ نظر رکھتے ہوئے باضابطہ طور پر اردو کا پہلا خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی: کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی''۔ اس مضمون میں فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کے حوالے سے شخصی یادوں اور معاشرتی حوالوں کو بیان کی سادگی، اسلوب کی شگفتگی اور تخیل کی پرکاری کے ساتھ اِس خوبی سے گوندھا ہے کہ یہ مضمون اردو کا پہلا ہی نہیں بلکہ اب تک لکھا جانے والا بہترین خاکہ قرار پاتا ہے۔ ایک نئی صنفِ ادب کے حق میں یہ مضمون بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا کہ آگے چل کر خاکہ نگاری نے ادب میں بذاتہٖ ایک صنف کی حیثیت حاصل کی اور اپنی الگ عمارت تعمیر کی تو اِس عمارت کی بنیاد کا پتھر بھی مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا خاکہ قرار پایا۔ اس لیے کہ اس خاکے نے خاکہ نگاری کے صنفی قواعد اور حدود اس طور وضع کیے کہ انہیں معیار بنایا جا سکے۔ خاکہ نگاری کے حوالے سے اپنے ادب کی پون صدی کی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہوئے آج ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی، ممتاز مفتی، خواجہ احمد عباس، احمد بشیر، اشرف صبوحی دہلوی، مالک رام، حمید اختر ایک سے بڑھ کر ایک نکتہ رس اور لطف نشاں ادیب نے اس صنف میں وہ وہ نکتہ آفرینی کی اور ایک گل ہی کے نہیں خار کے مضمون کو بھی

یوں سورنگ سے باندھا اور زبانِ قلم سے اس طرح شرح آرزو کی کہ ادب میں شیشہ گری کا فن تازہ ہوا۔۔۔
اور یہ اہتمام ہوا کہ خاکہ اور خاکہ نگار دونوں کے نام کی قلم تا دیر روشن رہے۔

مختصر افسانے اور ناول ہی کی طرح شخصی خاکے کی بابت بھی ایک تأثر یہ پایا جاتا ہے کہ یہ صنفِ ادب بھی ہم نے مغرب سے لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تأثر کے پس منظر میں ہماری مغرب پسندی اور مغرب سے مرعوبیت کا رویہ کارفرما ہے ورنہ خاکہ نگاری کے فن نے جس طرح ہمارے یہاں سوانحی مضامین، یادداشتوں اور شخصیت وفن کے ملے جلے تجزیوں سے بہ تدریج گزر کر اپنے فنی معیارات اور قواعد وضوابط قائم کیے ہیں، کچھ ایسا ہی سفر اس نے مغرب میں بھی کیا ہے اور اس فن کی تمام تر نمود مغرب میں بھی کم وبیش اسی صدی کی دین ہے۔ یہاں انگریزی میں لکھی جانے والی چند نمائندہ کتابوں کا حوالہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس طرح بات دلیل سے واضح ہو سکے گی۔ مثال کے طور پر آپ گارڈیز کی کتاب Certain People of Importance کو لیجیے، اس میں اپنے عہد کی نمایاں شخصیات کے مرقعے ان کے سیاسی، سماجی اور ادبی حوالوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں یا اسی طرح دلچسپ مرقع نگار میکارتھی کی کتاب Portraits ہے، اس کتاب میں بھی شامل بیش تر مضامین کا انداز شخصی یادنگاری کا ہے اور ان یادوں میں فنی حوالے بھی در آتے ہیں۔ اور تو اور برنارڈ شا نے بھی اپنے شخصی اور تبصرہ نما مضامین کو Pen Portraits and Reviews نامی کتاب میں اِس انداز سے یک جا کیا ہے گویا یہ مختلف النوع مضامین نہیں ہیں بلکہ اپنی نہاد میں ایک ہی قبیل سے تعلق رکھنے والی تحریریں ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ برنارڈ شا کے تبصروں اور شخصی خاکوں دونوں ہی میں ہمیں ایک دوسرے کی overlapings نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ہمیں آربری کی کتاب Oriental Essays میں بھی سوانحی مضامین، یادداشتوں اور شخصیت و فن کے تجزیے کا ملا جلا تأثر ملتا ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ کتابیں نہ صرف اسی صدی میں چھپی ہیں بلکہ ان کا عرصۂ تصنیف بھی ہماری خاکہ نگاری کے ارتقائی دور سے بہت زیادہ زمانی فصل نہیں رکھتا۔ چناں چہ یہ تأثر درست نہیں کہ ہم نے خاکہ نگاری کا فن مغرب سے لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شجرِ بہار آفریں کا بیج خود ہماری اپنی زمین میں تھا، اس فنِ لطیف کے ابتدائی نقوش خود ہماری پرانی اصنافِ ادب میں موجود تھے۔ زمانے کے تغیرات کے زیرِ اثر عوامی ذوق اور ادب اور آرٹ کی ہیئتوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کے ذریعے یہ ابتدائی نقوش بعد ازاں اس طور اُجاگر ہوئے کہ خود صنفِ

ادب بن گئے۔

اردو میں خاکہ نگاری نے صنفِ ادب کے طور پر اپنی شناخت کا سفر مختصر عرصے میں طے کیا اور عوامی پسندیدگی کا response بھی اسے جلد ہی مل گیا، لیکن دیگر اصناف ادب کے برعکس نقادوں کی توجہ تا حال اس کی طرف نہیں ہوسکی اور نہ ہی غزل، نظم، افسانے اور تنقیدی مقالات کی طرح اس کے خاطر خواہ انتخاب سامنے آئے ہیں۔ اس صنف کے تنقیدی مطالعے کی حد تک ہمیں صرف ڈاکٹر بشیر سیفی کی کتاب ''خاکہ نگاری: فن و تنقید''(۱) ملتی ہے جس میں خاکہ نگاری کے فن اور اس کے سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس صنف کا مختصر مطالعہ ہے لیکن پھر بھی غنیمت ہے کہ اردو میں اس موضوع پر کم سے کم ایک کتاب تو دستیاب ہے۔ ترتیب و تدوین کے حوالے سے دیکھا جائے تو ''نقوش، شخصیات نمبر'' خاکہ نگاری کے باب میں پہلا اور اہم ترین کام ہے۔ اس کے بعد ہمیں دو انتخاب ملتے ہیں، اوّل شمیم احمد کا کیا ہوا ''چند تصویرِ بتاں'' دوم شمیم حنفی کا جو ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ میرے ناچیز مطالعے کی حد تک اس ذیل میں ہمارے اعداد و شمار بس اس مقام پر آ کر رک جاتے ہیں اور ہمیں خاکوں کا مزید کوئی قابلِ توجہ انتخاب نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مذکورہ بالا دونوں انتخاب ہندوستان سے شائع ہوئے ہیں، گو کہ اوّل الذکر تو پاکستان (کراچی) کے معروف نقاد شمیم احمد کا ترتیب دیا ہوا ہے لیکن وہ بھی پاکستان میں شائع نہیں ہوا۔

اس انتخاب کو ترتیب دیتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ ''آبِ حیات'' سے لیے گئے ذوق کے مرقعے سے لے کر عصرِ رواں تک اردو خاکہ نگاری میں تکنیک، ہیئت، جمالیات، اسلوب اور بیانیہ کی سطح پر جس قدر کمالات رونما ہوئے اور جو تجربے کیے گئے ہیں، ہر ممکن حد تک ان کا احاطہ کیا جائے۔۔۔ تاکہ اردو کے بہترین شخصی خاکوں کی رنگا رنگ اور جامع تر دستاویز پیش کی جا سکے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس انتخاب میں اگر ایک طرف ''شیخ ابراہیم ذوق'' (مولانا محمد حسین آزاد) ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی'' (مرزا فرحت اللہ بیگ)، ''میرن صاحب'' (آصف علی) ''شمعِ محفل'' (خواجہ غلام السیدین) اور ''مولانا محمد علی'' (مولانا عبدالماجد دریابادی) ایسے بیانیہ اسلوب میں لکھے گئے واقعاتی خاکے ہیں تو دوسری طرف ''نام دیومالی'' (مولانا عبدالحق)، ''کندن'' (رشید احمد صدیقی) اور ''مٹھو بھٹیارہ'' (اشرف صبوحی دہلوی) ایسے گم نام کرداروں کے خاکے بھی شامل کیے گئے ہیں، جن میں افسانے کی تکنیک اور اسلوب کو بروئے کار لایا گیا

ہے۔اس طرح ''دوزخی'' (عصمت چغتائی) اور ''رسالہ در معرفتِ ابنِ انشا'' (مشفق خواجہ) بالکل الگ اسلوب کے خاکے ہیں۔ یہ دونوں خاکے داستانوی بیانیہ کی طرح کچھ یوں نشیب وفراز سے گزرتے ہیں کہ ان کے موضوع کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہے۔ ''دوزخی'' کا کاٹ دار طنزیہ رنگ اور ''رسالہ در معرفتِ ابنِ انشاء'' کا پرمزاح اور شگفتہ پیرایہ ان دونوں خاکوں کو اپنی اپنی جگہ منفرد بناتا اور بیش از بیش معنویت عطا کرتا ہے۔ یادوں کے حقیقی رنگوں اور فن کارانہ ہنرمندی کے ساتھ لکھے گئے خاکوں میں ''مرلی کی دُھن'' (سعادت حسن منٹو)، ''چھپن چھری'' (احمد بشیر)، ''جوگی'' (یونس جاوید) اور ''بھا جی'' (پروفیسر مظہر محمود شیرانی) بھی حوالہ بننے والی تحریروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ خاکے ایک طرف خاکہ نگار کی سفاکی اور حقیقت پسندی کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری طرف اُس کی فنکارانہ چابک دستی کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں کہ ان خاکوں میں ہم جن شخصیات سے ملتے ہیں اُن کی کم زوریوں اور خامیوں کو جاننے کے باوجود اُن کے لیے ہمارے اندر نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہم انہیں زندگی کی بوقلمونی اور ریزہ کاری کا نمونہ جانتے اور ان کے لیے ہمدردی کا احساس رکھتے ہیں۔ان خاکوں کے برعکس ایک اسلوب یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے موضوع کی طرف رومانی رویے کا حامل نظر آتا ہے۔ یہ رویہ کبھی زیرِ تحریر شخصیت اور خاکہ نگار کے باہمی رشتے کی وجہ سے پیدا ہوتا اور کبھی خاکہ نگار کی اپنے موضوع سے مرعوبیت کے باعث۔اس ذیل میں ''سید سجاد حیدر یلدرم'' (قرۃ العین حیدر)، ''ابا جان مرحوم'' (داؤد رہبر)، ''منٹو ماموں'' (حامد جلال) کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

آخری بات زیرِ نظر کتاب کے حوالے سے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا، اس انتخاب کے پس منظر میں یہ خیال وخواہش کارفرما رہے ہیں کہ اردو خاکہ نگاری کی ایک ایسی جامع دستاویز مرتب کی جائے جو اس صنف کے پورے سفر کا جائزہ اور اس کے نمایاں سنگ ہائے میل کا اشاریہ ثابت ہو، اس کتاب میں حتی المقدور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہر انتخاب، خواہ وہ کسی بھی دائرے میں اور کتنی ہی معروضیت کے ساتھ کیوں نہ کیا جائے، آخری تجزیے میں انتخاب کرنے والے کی ذاتی پسند ناپسند کا آئینہ دار اور خود اس کی اپنی شخصیت کی توسیع ہوتا ہے۔اس لیے اُسے حتمی معیار بنا کر پیش نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس میں ردّ و بدل کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ کام کرنے والوں کو اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے اپنا کام کر

گزرنا چاہیے۔اس لیے کہ اگر وہ ردّ و قبول کے خوف اور حتمی معیار کی خواہش میں مبتلا رہیں گے تو پھر دنیا میں کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے گا۔اسی بات نے ڈھارس بندھائی،سو یہ انتخاب پیشِ خدمت ہے۔

اس انتخاب کے سلسلے میں کئی دوستوں کی محبتیں اور تعاون شاملِ حال رہا لیکن سب سے بڑھ کر میرے بزرگ و محترم محب مکرم مشفق خواجہ صاحب کہ مجھ سے خصوصی شفقت و لطف کا معاملہ رکھتے ہیں اور میری ادبی سرگرمیوں کو نگاہِ استحسان سے دیکھتے ہیں،اس انتخاب کے سلسلے میں بھی اُن کی طرف سے حوصلہ افزائی نے اس کام کو میرے لیے دلچسپ اور بامعنی بنائے رکھا۔اُن کے شان دار ذخیرۂ کتب تک میری ہمہ وقت اور بہ سہولت رسائی نے اِس منصوبے کی دقتوں اور مشکلوں کو میرے لیے سہل سے سہل تر کر دیا۔ اُن کی عنایتیں رسمی الفاظِ تشکر سے ماورا ہیں۔

مبین مرزا

۱۵/ جون ۲۰۰۰

محمد حسین آزاد

ملک الشعراء، خاقانیِ ہند، شیخ ابراہیم ذوقؔ

جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہان میں پھیلی۔ اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا۔ اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چناں چہ اب ہرگز اُمید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اُس زبان کے لیے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امراء کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں، جو بات بات دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں۔ وہ اور، اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔ کیسا مبارک زمانہ ہوگا۔ جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے۔ تحصیلِ علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفولیت میں ہوگی۔ صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی۔ اور ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔ ان نیک

نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ اِن کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گرانبہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ اس سبب سے کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں! اس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا۔ اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات اِن کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔ شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضانؔ ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انہیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دِلّی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علی خاں نے انھیں معتبر اور باقیات شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کسے خبر ہوگی کہ اِس رمضان سے وہ چاند نکلے گا۔ جو آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رُسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلّے کے اکثر لڑکے انھی کے پاس پڑھتے تھے۔ اُنھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ شوق تخلّص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلّے کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ لکھوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے، غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی۔ اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آ جائے۔ ایک دن خوشی میں آ کر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے۔ اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا۔ کہ ایک حمد میں تھا۔ ایک نعت میں۔ اِس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو۔ دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک

کوسُنا تا تھا۔اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سما تا تھا۔غرض کہ اسی عالم میں کچھ کہتے رہے۔اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اِسی محلّہ میں میر کاظم حسین نام ایک اِن کے ہم سن سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں مرحوم کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلّص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی بادوباراں۔ انہیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لیے اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔ انھیں دنوں کا شیخ مرحوم کا ایک مطلع ہے۔ کہ نمونہ تیزیِ طبع کا دکھاتا ہے:

ماتھے پہ تیرے جھمکے ہے جُھومر کا بڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سُنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا۔ یہ غزل کب کہی۔ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ صلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اور ان کے ساتھ جا کر شاگرد ہو گئے۔

سلسلے اصلاح کے جاری تھے۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ واطبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے، اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے اِن کی غزل کو بے اصلاح پھیر دیا۔ اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اُس سے بے پروائی پائی گئی۔ اِدھر انہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چناں چہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے۔ جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لیے انہیں زیادہ رنج ہوا۔

منیر مرحوم کو جس قدر دعوے تھے اُس سے زیادہ طبیعت میں نوجوانی کے زور بھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اس زمین پر کون قدم رکھ سکتا ہے۔

مشکل سے مشکل طرحیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کون پہلوان ہے جو اس نال کو اُٹھا سکے۔ غرض اُن سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی۔ اور مباحثے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شیخ علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ گھر کے کہے ہوئے شعر صحیح نہیں شاید آپ اُستاد سے کہوالاتے ہوں گے۔ ہاں ایک جلسہ میں بیٹھ کر میں اور آپ غزل کہیں۔ چنانچہ اس معرکہ کی منیر مرحوم کی غزل نہیں ملی۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی غزل کا مطلع مجھے یاد ہے:۔

یاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے

جو تو مانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

اگر چہ اُن کی طبیعت حاضر و فکر رسا، بندش چست اُس پر کلام میں زور سب کچھ تھا۔ مگر چوں کہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لیے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس قیل و قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوش نقش پا۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے! اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ ان دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق لئے بے قرار ہو کر گھر سے نکلا۔ مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے۔ احتیاط شرط ہے۔ قریب شام افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک آ نکلے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی۔ حوض پر آئے وہاں میر کلو حقیر بیٹھے تھے۔ چوں کہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا۔ اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے اُنھیں پاس بٹھایا۔ اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو، خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل میں تھا، انھوں نے بیان کیا۔ میر صاحب نے کہا کہ بھلا وہ غزلیں ہمیں سُناؤ؟ انھوں نے غزل سُنائی۔ میر صاحب کو اُن کے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارا ذمہ ہے اور ہاتھ اُٹھا کر دیر تک اُن کے لئے دُعا کرتے رہے۔ اگر چہ میر صاحب کا قدیمانہ انداز تھا۔ مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا۔ اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی۔ اور مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔

اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانہ

کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذہ سلف کی یادگار باقی تھے۔ مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دِل بڑھاتے۔ بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سنتے۔ غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اڑانے لگیں۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انہیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا ابوظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے عاشق شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لیے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، میر غالب علی خاں سیدؔ، عبدالرحمٰن خاں احسان، برہان الدین خاں، رازؔ، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشقؔ، میاں شکیباؔ شاگرد (میر تقی مرحوم)، مرزا عظیم بیگ عظیم (شاگرد سوداؔ)، میر قمر الدین منتؔ، ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنونؔ وغیرہ سب شاعر وہیں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سُناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولی عہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا۔ کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ لیکن اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چناں چہ میر کاظم حسینؔ کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولی عہدی میں جانے لگے۔

شاہ نصیرؔ مرحوم کہ ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔ انہیں دنوں میں جان اَلفنٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ انہیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی، کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لیے ولی عہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ ان دنوں میں اُن کے مختارِ کل تھے۔ اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے۔ کہ جس پر ولی عہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اُسے کس طرح سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسینؔ کو شقہ سفارش آسان حاصل ہو گیا اور وہ چلے گئے۔

چندروز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے۔ تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے۔ میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی۔ کہ ذرا اسے بنا دو۔ یہ وہیں

بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سُنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آ کر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولی عہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس گورنمنٹ میں دائرہ تھا۔ اور ولی عہد کو بجائے ۵ ہزار روپیا کے فقط ۵ سو روپے مہینہ ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح رہی اور آخرکار سرکار ولی عہدی سے للعہ۔ مہینہ بھی ہوگیا۔ اُس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رُعب وداب کچھ اور تھا۔ چناں چہ کچھ ولی عہدی کے مقدمہ پر خیال کر کے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اِس نوکری سے روکا۔ لیکن اِدھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اِدھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ/ نہ سمجھنا۔ یہ ایوانِ ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چناں چہ شیخ مرحوم ولی عہد کے اُستاد ہو گئے۔

دِلّی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک عالی خاندان امیر تھے۔ علومِ ضروری سے باخبر تھے۔ اور شاعری کے کہنہ مشاق۔ مگر اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنافی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ چوں کہ لطفِ کلام کے عاشق تھے۔ اس لیے جہاں متاع نیک دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی کے ساتھ شاعروں کی نظر سے ان کا کلام گزرانا تھا۔ چناں چہ ابتداء میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ اُستادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے اہلِ فقیر کی برکتِ صحبت سے ترکِ دنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چناں چہ اُستاد مرحوم فرماتے تھے۔ کہ میری ۱۹۔۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی۔ ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک چوبدار آیا۔ اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا وظیفہ سے فارغ ہو کر اُسے دیکھا تو اس میں ایک خوشہ انگور کا تھا۔ ساتھ ہی چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دُعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوئے معمولی کے شعر کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی۔ اُس کا مطلع پڑھا

نگہہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی!
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا۔ مگر تمہاری زبان سے سُن کر اور لُطف حاصل ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوقؔ (۵) یعنی استاد مرحوم کے قدیمی استاد اسی وقت آ نکلے۔ نواب دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح سلام کیا جو سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ اِن سے خفا رہتے تھے۔ کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا۔ اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض انھوں نے اپنے شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا۔ کان بدمزہ ہوگئے۔ کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ اُستاد نے اُنھی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلع اس کے پڑھے:۔

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا!!
گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا!!
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اُس دن سے معمول ہوگیا کہ ہفتہ میں دو دن جایا کرتے اور غزل بنا آیا کرتے تھے۔ چناں چہ جو دیوان معروف اب رائج ہے۔ وہ تمام وکمال انھی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نواب مرحوم اگر چہ ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کولفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے۔ مگر اس کے حقائق ودقائق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے اُس عالم میں اُستاد مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اِن کی فرمائش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی۔ شیخ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگر چہ بڑی بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں۔ مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔

اِدھر ولی عہد بہادر کی فرمائشیں اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں کہ کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی مشقیں خوب زوروں

---

(۵) حافظ غلام رسول کے سامنے ہی شیخ مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ گلی میں ٹہل رہے تھے میں بھی ساتھ تھا۔ حافظ غلام رسول صاحب سامنے سے آ گئے۔ چنانچہ شیخ مرحوم نے اسی آداب سے جس طرح بچپن میں سلام کرتے تھے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا مگر اس ترش روئی سے گویا سو شیشے سرکے کے بہا دیئے۔ جب وہ بازار میں نکلتے تو لوگ آپس میں اشارے کر کے دکھاتے کہ دیکھو میاں وہ استاد ذوق کے استاد جاتے ہیں۔

پر چڑھ گئی تھیں۔ اُنھوں نے بھی مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی۔ جس کی ردیف تھی۔ آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں سُنائی۔ اور کہا کہ اِس طرح میں جو غزل لکھے۔ اُسے میں اُستاد مانتا ہوں [۶]۔ دوسرے مشاعرہ میں اُنھوں نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر کچھ اعتراض ہوئے۔ جشن قریب تھا۔ شیخ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے۔ کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ انھوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی کہ ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا۔ اور یہ شعر بھی لکھا

بود بگفتہِ من حرف اعتراض چناں!!
کہ بدیدۂ بینا فرد برو انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہوگیا۔ اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سُنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے۔ اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں۔

شیخ مرحوم قصیدہ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو برسر معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چناں چہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کے لئے قابل خطاب ہوں۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ انہوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا غیر تحریر تو اُسی وقت تک ہے کہ فاصلہ دُوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمایئے قصیدہ کا مطلع تھا

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد
آج نہ چل سکیں گے پر، آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔ معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ انھوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے

(۶) یہ طنز ہے شیخ مرحوم پر کہ ولی عہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں کی غزل بناتے تھے، اور استاد کہلاتے تھے۔

کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرین مشاعرہ اِن جواب وسوال کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے۔ اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتاً شیخ نے یہ شعر محسنؔ تاثیر کا پڑھا:۔

پیش از ظہور جلوۂ جاناں نہ سوختیم
آتش بہ سنگ بُود کہ ما خانہ سوختیم

سُنتے ہی مشاعرہ میں غل سے ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سوداؔ کا مصرع گزرانا۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر سوال وجواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُنھوں نے یہ اعتراض کیا۔ کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں ہے۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے کہا یہاں تغلیب ہے۔ اِس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ اُنھوں نے کہا۔ کہ **تغلیب کا قاعدہ** عام ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو۔ جائز نہیں ہوسکتی۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہیے تو ہم اُسے اُستاد جانیں۔ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی اُستاد نہ ہوا۔ معترض نے کہا۔ کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہوسکتا۔ کل پر منحصر رکھنا چاہئے اور جلسہ برخاست ہوا۔

اُسی دن سے اُنہیں تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے۔ انھیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی استاد تھے وہی ان کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ اِن کی تیزی طبع کا شہرہ ہوگیا تھا۔ راجہ صاحب رام نے اُن سے کہا کہ میاں ابراہیم! تم ہمیشہ درس میں شریک رہو۔ چناں چہ نوبت یہ ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب رام کا آدمی انھیں ڈھونڈھ کر لاتا۔ اور نہیں تو اُن کا سبق ملتوی رہتا۔

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالمؔ ولی عہدی میں تھے۔ تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی۔ اِس کی بحر مثنوی کی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گل کشتی ہماری دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا محمد صاحبؒ زندہ تھے۔ اور میرے والد مرحوم انھیں کا علاج

کرتے تھے۔ وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے اِن سے جا کر پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ رواج اتفاقی ہے جو مثنوی انھی آٹھ بحروں میں منحصر ہوگئی ہے۔ ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے، جو روکے۔ جس بحر میں چاہو، لکھو۔ اُستاد کے مسودوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اس کے نکلے تھے۔ اُن میں ساچق کا مضمون تھا۔ دو شعر اب تک یاد ہیں:

ٹھلیاں تو نہ تھیں وہ مے عشرت کے سبو تھے
یا قلزم مستی کے حباب لب جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں
ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

چند سال کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سُنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنایع و بدایع صرف کئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا۔ ان کی تعداد ۱۸ تھی۔ مطلع اس کا یہ ہے:

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو نمائے گلشن

اِس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے۔ بہت لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا پیالہ لئے کھڑے ہیں۔ اور شیخ علیہ الرحمۃ کو اس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے اور جنازہ کس کا ہے۔ اُنھوں نے کہا یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے۔ اور میاں ابراہیم اُن کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں۔ خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کئے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعراء بنایا اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا۔ ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب عطا ہوا ہے۔ اُسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چناں چہ قصیدہ مذکور لا کر پڑھا گیا۔ میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سُن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے۔ جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا۔ اُس وقت بھی کہا تھا۔ اور

ارباب زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بے خبری اور بے صبری سے دق ہوکر کچھ کہتا تو فرماتے تھے۔ کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی باانصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ ۳۶ برس کی عمر تھی جب کہ جملہ منہیات سے توبہ کی اور اس کی تاریخ کہی۔

اے ذوق بگو ۳ بار توبہ

مرزا ابوظفر بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا:۔

روکش ترے رُخ سے ہوگیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہے ذرّہ تیرا پرتو انور سحر رنگِ شفق

اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انھیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور دِلی رازوں کے لیے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولی عہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے۔ جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقعے آئے تو اُستاد کے لئے یہ ہوا کہ للعہ/ مہینہ سے صہ/ ہوگئے۔ صہ/ سے معہ/ روپے ہوگئے۔ جب بادشاہ ہوئے اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا۔ مگر اُستاد شاہی کو ۳۰ مہینا! پھر بھی اُنھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لئے عرض نہیں کی۔ اِن کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے۔ اور شعر موزوں کیا کرتے تھے۔ چناں چہ اِن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چُستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا۔ تو اس کے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے:۔

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے۔ شیخ مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے۔ اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ لیکن اب یہ عالم ہے الف کے نام ب نہیں جانتے۔ زبان تک درست نہیں۔ مگر جو کچھ ہیں۔ مرزا مغل بیگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے میں اگرچہ عقل ظاہر میں کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے۔ وہ اس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعویٰ سے تم دربار میں کھڑے ہوکر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہوسکتا ہوگا۔ ادنےٰ ادنےٰ منشی متصدی اس کے لکھتے پڑھتے ہوں گے۔ وہ کیسا ترستا ہوگا۔ کہ نہ اِن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اِن کا جھوٹ سچ معلوم کرسکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا۔ اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترقی تمام ہوگئی۔ تمام کنبہ قلعہ سے نکالا گیا۔ نواب حامد علی خاں مرحوم مختار ہوگئے۔ جب اُستادشاہی کا سوروپیہ مہینہ ہوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارکباد کے پڑھتے تھےاور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔

اواخرِ ایّام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی۔ اور انھوں نے ایک قصیدہ غرّا کہہ کر گزرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خاں بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔

پھر ایک بڑے زورشور کا قصیدہ کہہ کر گزرانا۔ جس کا مطلع ہے۔

شب کو میں اپنے سر بستر خوابِ راحت

اُس پر گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔

جس رات کی صبح ہوتے انتقال ہوا۔ قریب شام میں بھی موجود تھا۔ کہ انہیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی۔ خلیفہ صاحب نے اُٹھایا۔ چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور اُنھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی تو کہا۔ آہ ناتوانی۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا شاعروں ہی کا ضعف ہوگیا۔ حافظ ویراں بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں۔ مُسکرا کر فرمایا کہ اب تو کچھ اُس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا۔ سُبحان اللہ! اس عالم میں بھی مبالغہ قائم رہے۔ خدا اسی مبالغہ کے ساتھ توانائی دے۔ میں رُخصت ہوا۔ رات اِسی حالت سے گذری۔ صبح ہوتے کہ ۲۴/ سفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں اُن کی کہیں۔ اُج تک کسی بادشاہ یا صاحب کمال کو نصیب نہیں ہوئیں۔ اردو اخبار ان دنوں دہلی میں جاری تھی۔ برس دن تک کوئی اخبار اس کا ایسا نہ تھا جس میں ہر ہفتہ کئی کئی تاریخیں نہ چھپی ہوں۔

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قد و قامت میں متوسط اندام تھے۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں:۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ!
پست ہمّت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا۔ چیچک کے داغ بہت تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے۔ اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ اور وہ اُن کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آئند۔ جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اُٹھتی تھی۔ اُن کے پڑھنے کی طرز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتی تھی۔ اور اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے۔

صانع قدرت جنہیں صاحب کمال کرتا ہے انہیں اکثر صفتیں دیتا ہے۔ جن میں وہ ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ چناں چہ اُن کی تیزیٔ ذہن اور براقی طبع کا حال تو اب بھی اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوت حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالم شیر خواری کا اُنھوں نے بیان کیا، جسے سُن کر سب تعجب کریں گے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اوڑھا دیا۔ اور آپ کسی کام چلی گئیں۔ ایک بلّی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اس سے اور اُس کی غُرغُر کی آواز سے نہایت تکلیف معلوم ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا۔ نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آ گئیں۔ اُنھوں نے اُسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونوں کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چناں چہ میں جب بڑا ہوا تو میں نے والدہ سے پوچھا اُنھوں نے یاد کر کے اس واقعہ کی تصدیق کی۔ اور کہا فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔

صلاحیت طبع کے باب میں خدا کا شکر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک دن آم کے درخت میں کنکو اٹک گیا۔ میں اُتارنے کو اُوپر چڑھ گیا۔ اور ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا۔ وہ ٹوٹ گئی۔ میں نیچے آ پڑا۔ بہت چوٹ لگی۔ مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوا اُڑایا۔ نہ درخت پہ چڑھا۔

عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرب نسخہ قوتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہو کر اُس کے بنانے کی صلاح ٹھہری۔ ایک ایک جز کا بہم

پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمہ ہوا۔ چناں چہ ۴۰ چڑوں کا مغز ہمارے سر ہو۔ ہم نے گھر آ کر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلا دیے۔ اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے۔ ان کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے مزے کے لئے ۴۰ بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے۔ یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں۔ اور اپنی پیاری زندگی کے لئے ہر قسم کی لذتیں رکھتے ہیں۔ اُسی وقت اُٹھا، اُنھیں چھوڑ دیا۔ اور سب سامان توڑ پھوڑ کر یاروں میں جا کر کہہ دیا کہ بھئی ہم اِس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے۔

اِن کی عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازہ کے آگے لمبی گلی تھی۔ اکثر اس میں پھرا کرتے تھے۔ رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے تجھے گے رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر یہ قطعہ پڑھا:۔

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد
کہ رحمت برآں تربتِ پاک داد
میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ 'شب کو میں اپنے سربستر خواب راحت۔' چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور اُن کے تنکے جو گرتے تھے۔ انھیں لینے کو بار باراُن کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا۔ تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ اُستاد نے کہا کہ بیٹھے کیوں کر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی احل لکم الصید کی آیت پڑھ کر کلو ا واشربوا. بسم الله الله اکبر کردے گا۔ دیوانی ہے؟ جو تمہارے سر پر آئے۔

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خانِ

آرزو کی تصنیفات اور ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پہ تھیں۔ مگر مجھے اس کا تعجب نہیں اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر اُنھیں یاد تھے۔ تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس تڑاتے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے۔ مجھے اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مورخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا۔ جب تقریر کرتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں کہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں علمِ اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے، کبھی محی الدین ابن عربی۔ پھر جو کہتے تھے ایسے کانٹے کی قول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سُن لیا ہے۔ آج تک دل پر نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگر چہ مجھے اس قدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا تعجب ہے مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ اِن کے حافظہ میں اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے۔

وہ کہتے تھے کہ اگر چہ شعر کا مجھے بچپن سے عشق ہے۔ مگر ابتداء میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا۔ اور کچھ حاصل بھی کیا۔ مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے۔ اس کے لئے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیے۔ ۱۰۰ برس سنتا پھرے اور جو سیکھا ہے اسے مطابق کرے۔ پھر سو برس بیٹھ کر اوروں کو سُنائے۔ اور اس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہوگا۔ وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بنا کیا ضرور۔

نجوم و رمل کا بھی شوق کیا۔ اُس میں دست گاہ پیدا کی۔ نجوم کا ایک صاحب کمال مغل پورے میں رہتا تھا۔ اُس سے نجوم کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی سوال کا نہایت درست جواب اُس نے دیا۔ اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ستارہ کا حال اور اس کے خواص معلوم کرنے کے لئے ۷۷ برس چاہیے ہیں۔ سُن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

طب کو چند روز کیا۔ اس میں خون ناحق نظر آنے لگے۔ آخر جو طبیعت خدا نے دی تھی۔ وہی خوبی قسمت کا سامان بنی۔

مکھن لال کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے۔ ایک مرد دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی۔ اور ایک دن قرار پا کر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں اُنھوں نے بے اظہار نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا۔ کہ وہ شخص صاحبکمال ہو۔ اور غالباً کمال اس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعثِ تفریح ہو۔ اس کا کمال رواج خوب پاوے۔ اس کے حریف بھی بہت ہوں۔ مگر کوئی سامنے نہ ہو سکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کہے جاتے تھے۔ جو شیخ مرحوم نے پُوچھا کہ اس کی عمر کیا ہو۔ اُنھوں نے کہا کہ ۶۷۔ ۶۸ حد ۶۹۔ یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرہ پر آثار ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اگر چہ عقلاً اور نقلاً احکامِ نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیے۔ لیکن واقعہ پیش نظر گذرا تھا۔ اس لئے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا تھا کہ انہیں آخر عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُنھوں نے مبارک باد کا قصیدہ کہا۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہ اس وقت قصیدہ ہی لکھ رہے تھے۔ چناں چہ کچھ اشعار اس کے سُنانے لگے۔ مطلع تھا:۔

زہے نشاط کہ گر کیجیئے اُسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے سریر

اُس کے آگے شعر سُناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:۔

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سُبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور۔ ظہوری کا ساقی نامہ ہوگیا۔ چپ ہو گئے اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے۔ میں گُھلا جاتا ہے۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے۔ حافظ ویران سلمہ اللہ نے بیان کیا۔ اشعار بہاریہ کیسے ہیں۔ دو تین دفعہ فرمایا۔ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں موقع سے تضمین کریں گے:۔

مے دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

ایک دن جو میں گیا تو جو شعر پرچوں پر پریشان تھے اُنہیں ترتیب دیا تھا۔ چناں چہ سُناتے سُناتے پھر شعر مذکور پڑھا۔ بعد میں اس کا قطعہ پڑھا کہ خود کہا تھا:۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبیر
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھی! میں نے عرض کی۔ سبحان اللہ اب اس کی کیا ضرورت رہی۔ آنکھیں بند کر کے فرمایا اُدھر ہی کا فیضان ہے۔

دِلّی میں نواب زینت محل کا مکان لال کنوئیں کے پاس اب بھی موجود ہے بادشاہ نے وہیں دربار کر کے یہ قصیدہ سُنا تھا۔ اِس برس ایک شادی کی تقریب میں مجھے دِلّی جانا ہوا۔ اسی مکان میں برات بیٹھی تھی۔ فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ نے وہ مکان سرکار پٹیالہ کو دے دیا ہے۔ بند پڑا رہتا ہے۔ اب اتنے ہی کام کا ہے۔ کہ اُدھر کے ضلع میں کوئی برات یا شادی کا جلسہ ہوتا ہے تو داروغہ سے اجازت لے کر وہاں آن بیٹھے ہیں۔ واہ

کشتوں کا تیری چشم سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی تو خرابات ہوئے گا

وہ زمانہ اور آج کی حالت دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔

ان کی طبیعت کو خدا تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا۔ اور اسی میں خوش تھے۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا۔ جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ ایک آدمی چل سکے۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھری چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی، جاڑا، برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ۔ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دُنیا کی شادی و غم سے اُنھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اوّل روز بیٹھے وہیں بیٹھے اور جبھی اُٹھے کہ دُنیا سے اُٹھے۔

نمازِ عصر کے وقت میں ہمیشہ حاضر خدمت ہوتا تھا۔ نہا کر وضو کرتے تھے۔ اور ایک لوٹے سے برابر کلیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسفانہ طور سے بولے کہ خدا جانے کیا کیا

ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک ہے۔ پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہہ کر پڑھا:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں مُنہ میں ترے مسواک سے

اُن کا معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کلیاں کر کے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیرِ آسماں کبھی ٹہلتے جاتے کبھی قبلہ رو ٹھہر جاتے۔ اگر چہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے۔ مگر اکثر اوقات اِس جوشِ دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا گویا سینہ پھٹ جائے گا۔

وظیفہ پڑھ کر دعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا کہ نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیک خواہی کا۔ اس میں سب سے پہلے یہ دُعا تھی۔ الٰہی میرے بادشاہ کو بادولت باقبال صحیح و صالم رکھ۔ اس کے دشمن روہوں وغیرہ وغیرہ، ایک شب اس موقع پر میرے والد مرحوم انہی کے ہاں تھے۔ ساری دعائیں سُنا کیے۔ چناں چہ اُن کے دروازہ کے سامنے محلّہ کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دُعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آ گیا۔ کہا کہ الٰہی جما حلال خور کا بیل بیمار ہے۔ اُسے بھی شفا دے۔ بچارا بڑا غریب ہے۔ بیل مر جائے گا تو یہ بھی مر جائے گا۔ والد نے جب یہ سُنا تو بے اختیار ہنس پڑے فقراؔ اور بزگانِ دین کے ساتھ اُنہیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علماء اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ انھوں نے فکرِ سخن اور کثرتِ مشق میں فنانی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا۔ اور انشاء پردازیٔ ہند کی رُوح کو شگفتہ کیا۔ مگر فصاحت کا دل کملا جاتا ہوگا۔ جب اُن کے دیوانِ مختصر پر نگاہ پڑتی ہوگی۔ اس کے سبب کا بیان کرنا ایک سخت مصیبت کا افسانہ ہے۔ اور اس کی مرثیہ خوانی کرنی میرا فرض ہے۔ اُن کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسماعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں۔ بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے۔ کہ جو کچھ کہتے تھے۔ گویا بڑی احتیاط سے اُن میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی۔ کیونکہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک کا کلام اُنھی میں تھا۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی، بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔

چناں چہ اوّل اُن کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لئے۔ یہ کلام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام میں نے جاری کیا۔ مگر با اطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکا یک زمانہ کا ورق اُلٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعتاً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چناں چہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسماعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزند روحانی بھی دُنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاتِ لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا۔ اور میں حیران کھڑا تھا، کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں اُن کی غزلوں کی جنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسینؔ! اگر خدا نے کرم کیا۔ اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے۔ جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دِلّی بھی ایک بہشت ہے۔ اُنھی کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیوں نہ نکلوں۔ غرض میں تو آمادہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا۔ مگر حافظ غلام رسول ویران کہ محبت کے لحاظ سے میرے شفیق دوست اور حضرتِ مرحوم کی شاگردی کے رشتہ سے روحانی بھائی ہیں اُنھوں نے شیخ مرحوم کے بعض اور درد خواہ دوستوں سے ذکر کیا۔ کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دِلّی کے ساتھ برباد ہوا۔ اِس وقت یہ زخم تازہ ہے۔ اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہوگا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد ہے۔ اور خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی ہیں۔ کہ بصارت کی آنکھوں کے محتاج نہیں۔ اس لئے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی۔ غرض کہ ایک مشکل میں کئی کئی مشکلیں تھیں۔ اُنھوں نے اس مہم کا سرانجام کیا۔ اور اپنی یاد کے علاوہ نزدیک بلکہ دُور دُور سے بہت کچھ بہم پہنچایا۔ سب کو سمیٹ کر ۱۲۷۹ھ میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اور اکثر ناتمام، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں چھاپ کر نکالا۔ مگر دردمندی کا دل پانی پانی ہو گیا۔ اور عبرت کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دُنیا کی لذتیں۔ عمر کے مختلف موسم، اور موسموں کی بہاریں۔ دن کی عیدیں، رات کی شب براتیں۔ بدن کے آرام۔ دل کی خوشیاں، طبیعت کی امنگیں سب چھوڑ دیں۔ اور ایک شعر کو لیا۔ جس کی انتہائے تمنا یہی ہوگی کہ اس کی بدولت نامِ نیک باقی رہے گا۔ تبہ کار

کے زمانہ ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا۔ اور جس نے ادنیٰ ادنیٰ شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا۔ اس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔ خیر

یونہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے

میرے پاس بعض قصیدے ہیں۔ اکثر غزلیں ہیں۔ داخل ہو جائیں گی۔ یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی۔ مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں۔ چناں چہ یہ تذکرہ چھپ لے تو اس پر توجہ کروں۔ مسب الاسباب سرانجام کے اسباب عنایت فرمائیے۔

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں۔ اگر جمع کی جائیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوتیں۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ اُن کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لئے اُنہوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسہ کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ وا کے نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے۔ چناں چہ وہی شکل طرحیں، چُست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی، الفاظ کی شکو ہیں۔ ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں۔ اور ولی عہد کے دربار میں پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ اِن کی پسند طبع کے بموجب انھیں بھی تصوف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ اِدھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جرأت اور سید انشاؔء و مصحفیؔ کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُنھیں کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا۔ کہ ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کی ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے دو تین معاملے کے۔ اور بیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُسی میں بندھے تو لطف دے۔ نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا۔ اسی میں باندھ دیتا تھا۔ اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہی اصول کے لحاظ سے میرؔ، مرزاؔ، دردؔ، مصحفیؔ، سید انشاؔء، جرأتؔ بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے۔ گویا انھیں کے

شاگرد ہیں۔ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے۔گویا اُسی دستور العمل سے انھوں نے تہذیب پائی ہے۔اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے۔پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان اِن کی طبیعت کا سوداؔ کے انداز پر زیادہ تھا۔نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔اُن کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔اور انُھوں نے مرقع کو ایسی اُونچی محراب پر سجایا۔کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا، انوریؔ، ظہیرؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں۔لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دکھایا۔ ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے۔اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں۔وہ الگ تھیں۔اس لئے اگر جمع ہوتے تو خاقانی ہند کے قصائد خاقانی شروانیؔ سے دو چند ہوتے۔جب تک اکبر شاہ زندہ تھے۔تب تک اُن کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولی عہد کو سناتے۔دوسرے دن ولی عہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سنواتے۔افسوس یہ ہے کہ عالمِ جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے ہیں کہ بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہے۔

نواب حامدؔ علی خاں مرحوم نے نہایت شوق سے ایک عاشقانہ خط لکھنے کی انھیں فرمائش کی تھی۔بادشاہ کی متواتر فرمائشیں یہاں ایسے کاموں کے لئے کب فرصت دیتی تھیں۔مگر اتفاق کہ انھی دنوں میں رمضان آ گیا۔اور اتفاق پر اتفاق یہ کہ بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔اس سبب سے غزل کہنی موقوف کر دی۔خیر ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا بھی جی چاہتا تھا۔انھوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کیا۔اُس نے ایسا طول کھینچا کہ تخمیناً ۳۰۰ شعر اس کے ہو گئے۔اس عرصہ میں تین تختیاں اُس سے سیاہ ہوئی تھیں۔مگر ادھر رمضان ہو چکا۔بادشاہ کی غزلیں پھر شروع ہو گئیں۔مثنوی وہیں رہ گئی۔بیچ میں کبھی کبھی پھر بھی طبیعت میں اُمنگ اٹھی۔مگر کبھی ایک دن کبھی دو دن ۲۰۔۲۵ شعر ہوئے پھر رہ گئے۔میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا۔تو کئی دفعہ اس کے مختلف ذکر کرتے اور جا بجا کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ایک دن وہ تختیاں اور کاغذی مسودے نکلوائے۔بہت کم تھا۔جو کچھ کہ پڑھا جاتا تھا۔آخر فرصت کے وقت نکال نکال کر اُن سے پڑھوا تا گیا۔اور آپ لکھتا گیا۔کل ۵۵۰ شعر سے زیادہ ہوئے۔اگرچہ نامہ ناتمام تھا۔مگر ایک ایک مصرع سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق تھا۔میرے صاف کیے ہوئے مسودے بھی انھیں متفرق غزلوں میں تھے۔جو میں خلیفہ صاحب کے پاس جا کر صاف

نیا کرتا تھا۔ چناں چہ اُن کے ساتھ وہ بھی گئے۔ اس کا نام نامۂ جانسوز تھا۔ اوّل حمد و نعت تھی۔ پھر ساقی نامہ۔ پھر القاب معشوق، اسی میں اُس کا سراپا اس کے بعد یادِ آیام۔ اس میں چاروں موسموں کی بہار۔ مگر اس کے معنوں کی نزاکت لفظوں کی لطافت، ترکیبوں کی خوبیاں، اندازوں کی شوخیاں۔ کیا کہوں! سامری کے جادو اور جادو کے طلسم اُس کے آگے دھواں ہو کر اڑ جاتے تھے۔

کئی مخمس تھے۔ کئی رباعیاں تھیں۔ صدہا تاریخیں تھیں۔ مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی۔ کیونکہ بہت بلکہ کل تاریخیں انہی کی فرمائش سے ہوئیں۔ اور اُنھی کے نام سے ہوئیں۔ مرثیہ سلام کہنے کا اُنھیں موقع نہ ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ ہزاروں گیت، ٹپے، ٹھمریاں، ہولیاں کہیں، وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہوئیں۔ اور ان باتوں میں اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔ میرے نزدیک ان کے اور ان کے دیکھنے والوں کے لئے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادرالکلامی کا انھیں دیا۔ اور ہزاروں آدمیوں سے اُنھیں ناراضی یا رنج پہنچا ہوگا۔ مگر اُنہوں نے تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی۔ مگر خدا نے اُن کی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔

اکثر نئے ایجاد و اختراع اِن کے ارادے میں تھے۔ اور بعض بعض ارادے شروع مگر ناتمام رہے۔ کیوں کہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا۔ کہ بات نکالتا مگر اُسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ اس کا کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اُس تک پہنچ جاتی۔ تو وہ اُسی غزل پر خود غزل کہتا تھا۔ اب اگر نئی غزل کر دیں۔ اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اُس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں ناچار اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زورِ طبع نہ خرچ کریں۔ جب ان کے شوقِ طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا۔ کہ جو کچھ خوش طبع ہو ادھر ہی آ جائے۔

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے وہ شاید کسی اور مُرشدزادی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا۔ اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ انہوں نے عرض کی۔

صاحب عالم اس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ اُستاد صاحب نے بے توقف عرض کی کہ حضور

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے!
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ اواخر عمر کی غزل ہے اس کے دو تین ہی برس بعد انتقال ہو گیا۔

ایک دن دربار سے آ کر بیٹھے۔ جو میں پہنچا۔ افسردہ ہو کہ آج عجیب ماجرا گزرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے۔ وہیں بلا لیا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ اُستاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال پوچھا کہا کہ وہ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لئے کہا تھا۔ اُس کے وہ اشعار آج مجھے یاد آ گئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لطف حاصل ہوا۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو۔ ہم مر جائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا۔ اس کے لئے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردّد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے۔ میخیں اور طنابیں پہلے ہی اکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائیں گے۔ اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرام گاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امراء اُن کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرمگاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرام گاہ کے امراء آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں۔ بس یہی فرمالیجیے جو جس کے ہوتے ہیں۔ وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے۔ اور اپنا سامان مجلس میں اپنے ہی ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سُن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا۔ مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ خدا شاہد ہے۔ اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے۔

شیخ مرحوم ضعفِ جسمانی کے سبب سے روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پُوچھا۔ کہا میاں خدا کے گناہ گار ہیں۔ وہ عالم نہاں و آشکار کا ہے۔ اس کی تو شرم نہیں ہو سکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت، عصر کا وقت، نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تو تشریف لے چلیے۔ چوں کہ وہ اس وقت کچھ لکھوار ہے تھے۔ مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے۔ اور سبب پُوچھا۔ اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آئیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا، جب اُس نے کٹورا لا کر دیا۔ تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا:

پلائے آشکار ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

محبوب علی خاں خواجہ سرا سرکار بادشاہی میں مختار تھے۔ اور کیا محل کیا دربار دونوں جگہ اختیار قطعی رکھتے تھے۔ مگر بشدت جوا کھیلتے تھے۔ کسی بات پر ناخوشی ہوئی۔ میاں صاحب نے حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن میں اُستاد مرحوم کے پاس بیٹھا تھا۔ کہ کسی شخص نے آ کر کہا۔ میاں صاحب کعبۃ اللہ جاتے ہیں۔ آپ ذرا تامل کر کے مسکرائے اور یہ مطلع پڑھا:۔

جو دل قمار خانہ میں بُت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لئے کہا۔ اُسی وقت تامل کر کے کہا۔ تعزیت گاہِ امام دارین۔ پُوری تاریخ ہے۔ حکیم میر فیض علی مرحوم ان کے اُستاد بھی تھے۔ اور انھی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے ایک دن میں بھی موجود تھا۔ نوکر نے آ کر کہا۔ کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتاً بولے کہ ہائے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔

ایک شخص نے آ کر کہا کہ میرے دوست کا نام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے اس نے نہایت تاکید سے فرمائش لکھی ہے۔ کہ حضرت سے ایسا سجع کہوا دو کہ جس میں دونوں نام آ جائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آیئے گا۔ انشاء اللہ ہو جاوے گا۔ وہ رُخصت ہو کر چلے، ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہوں گے جو نوکر سے کہا کہ محمد بخش بُلا نا انھیں لینا، خوب ہوا ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہوگئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

پدر غلام محمد پسر غلام علی

دیوان چندو لال نے اِن کا کلام سُن کر مصرع طرح بھیجا اور بُلا بھیجا۔ غزل کہہ کر بھیجی اور مقطع میں لکھا:۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

انھوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے۔ مگر یہ نہ گئے۔ ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پُوچھا فرمایا:۔
نقل:۔کوئی مسافر دِلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کتا ہل گیا تھا۔ وہ وفا کا مارا ساتھ ہولیا۔ شاہدرہ پہنچ کر دِلّی یاد آئی اور رہ گیا۔ وہائی کے کتوں کو دیکھا۔ گردنیں فربہ، بدن تیار، چکنی چکنی پشم۔ ایک کتا انھیں دیکھ کر خوش ہوا۔ اور دِلّی کا سمجھ کر بہت خاطر کی۔ حلوائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائی کی دوکان سے ایک بادشاہی اُڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارہ کی دُکان سے ایک کلّہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھاتے اور دِلّی کی باتیں سُناتے رہے۔ تیسرے دن رُخصت مانگی۔ اس نے روکا۔ انھوں نے دِلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کیے۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دِلّی آنے کی تاکید کر آئے۔ اُسے بھی خیال رہا۔ اور ایک دن دِلّی کا رُخ کیا پہلے ہی مرگھٹ کے کتے مردار خوار، خونی آنکھیں کالے کالے مُنہ نظر آئے۔ یہ لڑتے بھڑتے نکلے۔ دریا ملا، دیر تک کنارہ پر پھرے۔ آخر کود پڑے۔ مرکھپ کے پار پہنچے۔ شام ہوگئی تھی۔ شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی، جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے بظاہر خوش ہوئے اور کہا او ہو اس وقت تم کہاں۔ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا اور نہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا۔ اسے لے کر اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ یہ چاندنی چوک ہے۔ یہ دریبہ ہے۔ جامع مسجد ہے۔ مہماں نے کہا۔ یار بُھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ سیر ہو جائے گی۔ کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا۔ عجب وقت تم آئے ہو۔ اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جانی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا۔ لو یار بڑے قسمت والے ہو۔ وہ دن بھر کا بھوکا تھا۔ مُنہ پھاڑ کر گرا اور ساتھ ہی مُنہ سے مغز تک گویا باروت اُڑگئی۔ چھینک کے پیچھے ہٹا۔ اور جل کر کہا۔ واہ یہی دِلّی ہے۔ انہوں نے کہا۔ اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں۔

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹی کے دن اس وقت جایا کرتا تھا اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے تھے۔ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چار پائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے اجی ہمارا وہ شعر اُس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اس کے پڑھتے، میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے، ہاں اب اسے یوں بنالو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پائخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لو جی ۳۳ برس کے

بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا۔ حضرت کیوں کر؟ فرمایا۔ ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائے مشق تھی اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا؟ فرمایا۔

کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کمر کو اوپر ڈال دو عرض کی پھر وہ کیونکر، ۳۔۴ مصرع اُلٹ پلٹ کیے تھے ایک اِس وقت خیال میں ہے

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے بیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کابلی دروازہ پاس ہی تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامین کتابی، خیالات علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں۔ ہاں۔ غوں۔ خاں کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا۔

سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا ہاں درست ہے

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دِلّی جانا ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر گزر ہوتا ہے۔ تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔

فرماتے تھے کہ ایک باشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے ابھی درست کر کے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوانِ خاص میں جا کر اسی رُخ میں ایک طرف بیٹھ گیا اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غزل ہے پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دُعا گوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا۔ کس زبان میں۔ میں نے کہا اُردو میں۔ پوچھا آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے۔ میں نے کہا

کوئی خاص موقعہ ہوتا تو اِس میں بھی کہنا پڑتا ہے ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کرسکتا ہے غیر کی زبان میں نہیں کرسکتا۔ پوچھا آپ انگریزی جانتا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا ہمارا لب لہجہ اِس سے موافق نہیں وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ صاحب نے کہا۔ وَل یہ کیا بات ہے۔ دیکھیے ہم آپ کا زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا۔ پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی، بہت مشکل معاملہ ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا وَل۔ ہم آپ کی تین زبان ہندوستان میں آ کر سیکھنا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے۔ یہ کیا بات ہے؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا۔ صاحب ہم زبان کا سیکھنا اُسے کہتے ہیں کہ اس میں بات چیت ہر قسم کی تحریر تقریر اس طرح کریں۔ جس طرح خود اہلِ زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ ام آپ کا تین زبان سیکھ لیا۔ بھلا یہ کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے اسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی

کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور دانی (ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب مرحوم) مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے۔ اُن کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی۔ اُن کا طرزِ بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا۔ ان کی خوش مذاقی خود ان کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی۔ ان کی تکلیفیں خود ان کو پُرنم اور ہم کو تڑپاتی تھیں۔ اور آج وہ دن ہے کہ اُن کے حالات زبانِ قلم پر لانے سے ڈر لگتا ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی ''اخوتِ اسلامی'' کا سبق پڑھے ہوئے تھی اس کو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا، وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتے تھے، اس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دِکھایا، وہ کسی کی خوشامد کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑہ۔ وہ اپنے دست و بازو کے بھروسہ پر اس میدان میں اُترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو بآسانی ہٹائی نہ جا سکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ I am a self made man کا فقرہ ضرور استعمال کرتے اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے، جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے، جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نااہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں، یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری، ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے جو اپنے آباؤ اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے "میاں اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ، دس روپیہ کے اہلکار ہو کے باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔"

بہرحال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا، بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں اخلاق چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں لیکن رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا خواہ کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو۔ میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔ جس موقعہ پر جو کچھ سنا یا دیکھا اس کو جوں کا توں لکھ دوں گا اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کئے جائیں۔ انشاءاللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔ اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پروا نہیں میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں، اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدان حشر میں سود در سود لگا کر تاوان وصول کر لیں گے۔

اب رہا طرز بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا ان کا منہ چڑانا ہی نہیں ان کی توہین کرنا ہے بلکہ یوں کہو سید انشاء کو میر اور مارک ٹوین کو امرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں انھوں نے میری شوخ چشمی کی جنس

ہنس کر دادی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضع داری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں۔

چل رے خامہ بسم اللہ

۱۹۰۳ء میں، میں نے اور میاں دانی نے، ہندو کالج دہلی سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ ایف۔ اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا، انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی۔ اے میں عربی لے لو۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔ القصہ ہم دونوں بی۔ اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے، بڑے اللہ والے لوگ تھے۔ عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوّف کی باتوں میں گذر جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صرف ونحو تو اس میں تو کورا کا کورا ہی رہا سنتے آئے ہیں کہ ''مصیبت کہہ کر نہیں آتی'' لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ ''عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے''۔ ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر کعبۃ اللہ چلے گئے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے، ان سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو انھوں نے کورا جواب دے دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو، میں نے دانی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی۔ اب میرے کہنے سے تم سائنس لے لو۔ جس سہولت کی بناء پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا۔ اب اسی سہولت کے مدنظر اپنا مضمون بدلو، بقول شخصے کہ ''مرتا کیا نہ کرتا'' وہ راضی ہو گئے۔ دفتر میں جا کر جو لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔ لکچر کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریکِ امتحان ہونا پڑے گا ''سنگ آمد وسخت آمد'' جب ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے'' کی صورت آن پڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی، دونوں سر ملا کر بیٹھے مشورے کیے، ریزولیوشن پاس ہوئے۔ آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ ''خاک از تودۂ کلاں بردار'' کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیے، دلّی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے۔ ایک

مولوی محمد اسحٰق صاحب، دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی، اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی اس لئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، قرعہ دوسرے صاحب کے نام پر پڑا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، مولوی ضیاء الدین صاحب جامع مسجد دہلی میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیئے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے، مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک کر خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہوگئے۔ ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے اس لیے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سرگیں آنکھیں، سفید ریشِ مبارک، سفید جبہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں، آہستہ آہستہ انہوں نے سیڑھیوں سے اترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر ان کو جالیا اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فراشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے وہی پہلے والی ترکیب کی کہ چکر کھا کر پھر سامنے آگئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے پوچھا ''میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے''۔ ہم رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے، فرمانے لگے'' تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں'' بجنسہ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے جیسے اس زمانے میں کوئی کہے '' تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا انسپکٹر ہوں''۔ لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں، فرمانے لگے کہ '' تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجئے'' ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جز و ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو، بہر حال کچھ بھی ہو انھوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر اور نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو، وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے

طرزِ عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے، چلو اُمید نمبر ۲ پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لئے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے ایسے رستم کو پکڑنے کے لئے شغال بننا ضرور ہے۔ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور ریزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے۔ اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سن لیجئے۔ ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا۔ نہایت نیک اور پرہیز گار شخص تھے، جوتوں کی دوکان تھی مولوی نذیر احمد صاحب اس دوکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آ کر بیٹھتے تھے عبدالرحمٰن گو میرے ہم جماعت نہ تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا۔ مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چناں چہ انہی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کے امتحانات پاس کیے، انہی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دہلی میں ان کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔

بہر حال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد اُن سے اظہارِ مطلب کیا، کہنے لگے کہ ''بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے کہیں انکار نہ کر بیٹھیں'' میں نے کہا کہ ''میاں عبدالرحمٰن تم ان تک ہم کو پہنچا دو اگر ہو سکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت'' وہ راضی ہو گئے اور کہا کہ ''شام کو آٹھ بجے دوکان پر آ جانا میں مولوی صاحب سے ملوادوں گا'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دوکان پر پہنچے، یہ دوکان فتحپوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فراشی سلام کیے اور خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمٰن ہمارے پاس آ بیٹھے، مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا، میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا، دھتکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔ سچ ہے مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے ''مرتا کیا نہ کرتا'' میں نے یہی سوچ لیا کہ آج اِس پار یا اس پار۔ مولوی ضیاء الدین صاحب تو بچ کر نکل گئے۔ لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔ قصہ مختصر، مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا یہ دونوں صاحب کون ہیں، عبدالرحمٰن نے ہمارے نام

بتائے کچھ اُلٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کیے۔ اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا ''پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ مو اکل موا۔''

اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل و مرام باضابطہ پسپائی ہو، میں نے نہایت رقّت آمیز لہجہ میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا تو فرمانے لگے ''تو عربی چھوڑ دو سائنس پڑھو، بیٹا آج کل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے ہاں مثل ہے ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل''، فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لو گے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا۔'' ان کی اس پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے، ہم رہنے والے ٹھہرے جامع مسجد کے نیچے کے بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون در آ سکتا ہے۔ ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا، مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے۔ اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس دیے۔ دانی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ ''یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔ بیٹا جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو۔ دِلّی میں کیا مولویوں کا کال ہے۔ مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔'' میں نے عرض کی کہ ''جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں۔۔۔ اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں ہیں''۔ کہنے لگے ''نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمس العلماء مولوی ضیاء الدین صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، انکو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں''۔ میں نے کہا اُس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں''۔ کہنے لگے ''میں اس کا مطلب نہیں سمجھا'' یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے، جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ ''بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہیے ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصافِ حمیدہ و خصائل پسندیدہ سراج الدین کی دوکان پر اسی طرح معرضِ بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں۔ اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا۔ مگر تم بھاگ جاؤ گے'' ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ''نہیں ہرگز نہیں'' مولوی صاحب نے کہا کہ ''چھٹی ایک دن کی بھی نہ ہوگی'' ہم نے کہا ''بہت خوب مولوی صاحب نے کہا کہ ''عید بقر عید کو بھی آنا پڑے گا'' ہم نے کہا کہ ''بہت مناسب کل کس وقت حاضر ہوں'' مولوی صاحب تھوڑی دیر تک انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے، اس کے بعد کہا ''دو پہر کو ڈیڑھ بجے'' ہم نے کہا ''بہت خوب'' چوں کہ ان باتوں میں رات زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے مولوی صاحب دوکان پر سے اٹھے ہم سب نے سلام

کیا۔ اور وہ وعلیکم السلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے، یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر اس فیصلے میں بڑی مدد کی، ہم دونوں بھی خوش خوش اُٹھے اور سلام علیکم وعلیکم السلام کر کے دوکان سے چلے۔ راستہ میں دانی نے کہا۔ ''میاں مرزا، بڑے میاں نے مار ڈالا، بھئی گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں چلنے کی تیاری کرنی پڑے گی، کہاں چاوڑی اور کہاں کھاری باؤلی، جون کا مہینہ کہیں راستہ میں لو لگ کر ٹیں نہ ہو جائیں۔'' میں نے کہا میاں دانی کچھ دنوں چل کر دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آ جائے مگر ان کو آخر تک رحم نہ آنا تھا نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے چھ بجے سے تعلیم کا وقت مقرر ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہی کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے، بے چاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور انھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔ تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے، نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے، نہ ان دو سال میں ایک دن ناغہ کیا، یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ ''بیٹا جب تم دونوں آتے ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے، کیوں کہ میں تم میں طالبِ علمی کی بُو پاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے، جس طرح ہم نے پڑھا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس زمانے کے لونڈوں پر اگر ایسی پتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں مگر (میری طرف دیکھ کر) اُستاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں، تم صرف بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو، دانی کو شوق ہے یہ عربی میں ترقی کرے گا مگر تم کورے کے کورے ہی رہو گے اور انشاء اللہ پانچ چھ ہی برس میں میری ساری محنت اکارت کر دو گے'' خدا کے فضل سے ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں، میں مولوی صاحب کی شکل وصورت، مکان کی حالت، ان کے رہنے سہنے کے طریقے اور اُن کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں تا کہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہو سکے لیکن سینو میٹو گراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرزِ بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں، کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حدِ تجاوز سے بڑھ جائے گی لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اس رنگ میں لکھتے اور اگر آپ ان کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی ان کے حالات لکھتے وقت میری ہی طرح

معافی مانگنی پڑتی، ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے کسی ٹھیٹھ ملا کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی، خدا بہتر جانتا ہے کہ اس وقت بھی لکھتے لکھتے پینسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالمِ بے خودی مجھ پر چھا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو، کوئی قصہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو، کوئی طرز بیان نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے، وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں، یہی وجہ تھی کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ ''مجھے مقطع اور مسمسے شاگردوں سے نفرت ہے''۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دوں گا کہ

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

لیجئے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنیئے:۔

رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا، مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا، دوہرا بدن، گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل، فرماتے تھے کہ ''بچپن میں ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے''۔۔۔ بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے قد چوں کہ ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی تر کی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا، کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا، توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلو اڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے، اوّل تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے، سر بہت بڑا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، جو تھوڑے سے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ گگر سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، بھوئیں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں، آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی

جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اگر میں ان کو مسکراتی ہوئی آنکھیں کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلّہ جبڑا ابڑا زبردست پایا تھا، چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی اس لیے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے، آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ، کوئی دور سے جو سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو، جوش میں آ کر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے اسی لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا، ناک کسی قدر چھوٹی تھی، اور نتھنے بھاری، ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں ''گاجز'' اور دِلّی والوں کی بول چال میں ''پُھلکی'' کہا جاتا ہے، گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی، داڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال با سانی گنا جا سکتا تھا کلّے تو کبھی قینچی کے مِنت کش نہیں ہوئے، البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کر لیا جاتا تھا۔ داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنا دی تھی، بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی جیسے ایکس ریز (x-rays) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز، ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی۔ لیجئے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خان صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجئے، جنہوں نے انجمن پر ان کو شالی رومال باندھے، کشمیری جبہ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انھوں نے عالی جناب شمس العلما، مولوی، حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل، ڈی مدظلہ العالے کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا، ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا، تو لباس کی مد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے، گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پیجامہ ہوتا اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبہ، چوں کہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اس لئے لال نری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے پھر بھی وقت بے وقت کے لئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑ نک ہو گئے تھے، انہیں کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کو برداشت کرتا تھا۔ جرابوں سے انھیں ہمیشہ سے نفرت تھی گو دربار میں جانے کے لئے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں، یہ تو

پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔

اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھیے، آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلئے۔ چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آیئے، الٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سر کی والوں سے گزر کر لال کنویں پہنچئے، آگے بڑھیے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آیئے، یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے۔ نکڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے، بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے، یہاں اچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دوکانیں ہیں انھی دوکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے، تھوڑی ہی دور جا کر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دومنزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے، صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا، دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں، دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے، سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پڑھا کیا کرتے ہیں۔ اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے، چولہے بنے ہوئے ہیں آگ جل رہی ہے مگر برتن اور ہنڈیا وغیرہ جو باورچی خانہ کا جزو لاینفک ہیں سرے سے ندارد ہیں، آگ صرف حقہ کے لئے سلگائی جاتی ہے کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے، دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے اور اندر ایک لمبا کمرا، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں کمرے کے دروازے بند ہیں، ایک کھلا ہے، باہر ایک بڑھیا پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رسی کھینچ رہی ہے۔ ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے، نہ کرتہ ہے نہ ٹوپی نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے، بندھی ہوئی نہیں محض لپٹی ہوئی ہے لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے، کمرے میں نہایت اجلی چاندنی کا فرش ہے، ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے۔ کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے، سرہانے تکیہ رکھا ہے مگر اس کی رنگت کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے، البتہ جس گاؤ تکیے سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے، قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ ''مولانا ایں چہ کارست کہ کردہٗ'' تو انشاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ ''محتسب را درونِ خانہ چہ کار'' جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصہ میں رہتے تھے، چلئے وہاں کا رنگ بھی دکھادوں، صدر دروازہ سے ملا ہوا زینہ ہے اور

سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلا ہے، اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے، دروازے سے گذر کے چھت پر آتے ہیں، سامنے ہی ایک کمرہ ہے اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسل خانہ کے بالکل مقابل دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی، یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے، اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقہ اس کی حقیقت کما حقہ، بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا، مگر تمبا کو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی، فرشی قیمتی تھی، مگر چلم پیسہ کی دو والی، اور نیچہ تو خدا کی پناہ، اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی، ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا، مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بے چارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے، مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں، سر پر کنٹوپ ہے، مگر بڑا دقیانوسی، کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں لٹکتی ہوئیں، کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا، جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے، اوپر صندلی رنگ کا ڈھسہ پڑا ہوا۔ لیجئے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو؟ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی "پانی تیار ہے؟" جواب ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسل خانہ میں گئے کپڑے بدل (یا یوں کہو کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو، لیجئے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استغناء کے کئی باعث تھے، اوّل تو یہ بات تھی کہ ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں تھی۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں ان کا سارا دن گذر جاتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے جس کو ملنا ہوتا تھا شام کو ٹاؤن ہال کی لائبریری میں جا کر ان سے مل آتا تھا، جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا تو ان کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال، اور ظاہر ہے ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں، لباس سے اس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے، کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے

تھے۔ ان کو جس طرح آرام آتا اسی طرح رہتے۔ جی چاہتا پہنتے نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ جب باہر جاتے تو ''کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا'' پر عمل کرتے، اصل عالم تو گھر پر تھے، باہر نکل کر ظاہری عالم بن جاتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر پر کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی یا کم سے کم اُن کا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی، گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کانزا ٹٹو بدھو نفر، ان کا نوکر خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پروا کہ خدا کی پناہ، ظالم نے بہرا بن کر کام سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا، مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبر میں چونک پڑیں اس کو کبھی نہ سنائی دی، اور جب تک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا، اس نے ہمیشہ سنی کو اَن سنی کر دیا، البتہ حقے کے معاملہ میں بڑا تیز تھا، یا تو اس کو یہ خیال تھا کہ حقے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا دشوار ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمبا کو زیادہ صرف کرنے میں اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے۔ غرض یہ حال تھا کہ حقہ پورا سانگا بھی نہیں کہ وہ چلم اٹھا کر چلا، مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہی رہے اس نے جا چلم اُلٹ دی دوسرا سلفہ رکھ، آگ بھر، چلم حقہ پر لا کر رکھ دی، تو آگرم حقہ بھڑک گیا، میاں نوکر صاحب کو پھر بلا کر توا ٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی، غرض سارے دن ان کا یہی کام تھا اور وہ اس میں بہت خوش اور مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے، بعض یورپ پرست اس کی پابندیٔ اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں میں تو یہ کہتا ہوں کہ میں نے صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں کہ آندھی آئے، مینھ آئے، روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے، اِدھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور اُدھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے۔ لطف یہ ہے کہ اُن میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں۔ یہ تین شخص کون تھے؟ ایک منشی ذکاء اللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب، اور تیسرے مولوی صاحب، ایک چیلوں کے کوچہ سے آتا ہے، دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آ کر دوسرے کا انتظار کیا ہو، اگر ان سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جا کر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ اب آتے ہی ہوں

گے چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں، دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں۔ ان کے اس نظامِ اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیر ہو جاتا تھا، وہ ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے، گرمیوں میں اُٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے ان کی صبح اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے، نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا، صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے، ادھر ذرا دن چڑھا اور مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا، اس جماعت میں بخارا، کابل سرحد وغیرہ کے لوگ تھے، ان کی تعداد کوئی ۱۵۔۱۶ تھی، محنت ایسی کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مر جائے لیکن ٹھونٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی ان سے زچ ہو جاتے تھے، خوش مذاقی تو انھیں چھو کر نہیں نکلی تھی، خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے، متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اُٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوءِ ادبی سمجھتے تھے، اب ان کے "وہ عمامے اونچے اونچے، یہ یہ لمبی لمبی ڈاڑھیاں" دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو، بے چارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض اتارتے جاتے تھے، عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ان فتحپوری کے ملانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے، کیا کہوں "میں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں" کا نقشہ ہے، یہ جماعت اُٹھی اور مولوی رحیم بخش آ نازل ہوئے، کاغذوں کا مٹھا بغل میں ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، اِدھر فتحپوری کی جماعت نے کمرے سے قدم نکالا اور اُدھر انھوں نے کمرہ میں قدم رکھا، اب سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع ہوا۔ چوں کہ آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا، اس لئے لکھوانے کا کام اکثر انھیں سے لیا جاتا تھا، سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کی جاتی، اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا، یہ کام سمٹتے سمٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے، رحیم بخش صاحب کے اٹھتے ہی کھانا آتا، کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے، ادھر ڈیڑھ بجا اور اُدھر ہم دونوں داخل ہوئے ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے، ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزنی کرتے رہے، اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے۔ چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانے میں گئے، نہائے دھوئے، کپڑے پہن کر نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھہرے، یہاں بھی اُن کا حساب کتاب تھا، وہاں کا کھاتہ دیکھا، جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے۔ سات بجے تک وہاں ٹھہرے، جس کو ملنا ہوا وہاں مل لیا، سات بجے وہاں سے اٹھ کر سراج الدین

صاحب کی دوکان پر آئے یہاں بھی حساب کیا، عبدالرحمٰن کو پڑھایا، گھنٹہ بھر وہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے، کھانا کھایا، کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے، جاڑے میں پروگرام میں تبدیلی ہو جاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے، اس کے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے، ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا، ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا، پڑھاتے جاتے تھے، اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہو سکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلاح کرتے ان کے لئے تو مولوی صاحب کا ناشتہ ''اونٹ کے منہ میں زیرہ'' ہو جاتا البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے ''بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے میاں کیا مزہ کا آم ہے'' مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ ''بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے''۔ میں نے تو یہ تہیہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی اِرادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں اُن کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا۔ بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے، کہا کرتے تھے۔ ''میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں۔ پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے فائدہ پہنچا ہے، اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے۔ بیٹا تم بھی تجارت کرو، روپیہ میں دیتا ہوں نوکری کی کھکھیڑ اٹھاؤ گے تو مزہ معلوم ہو گا۔'' جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے، اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینھ، قرض داروں کے یہاں ان کا روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا، گئے اور جاتے ہی پہلے ''غلق'' پر قبضہ کیا، اس کے بعد کھاتہ دیکھا، گروی دیکھی، سامان دیکھ کر بکری کا اندازہ کیا، روپیہ جیب میں ڈالا اسلام علیکم وعلیکم السلام کیا اور چل دیئے۔ دوسرے دوکاندار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دوہرایا، کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے اعتراضوں کی بوچھاڑ سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے ''بھئی حساب جو جو بخشش سو سو'' فقرے کے پہلے جزو سے تو بے چاروں کو روز واسطہ پڑتا۔ لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے ان کے کسی قرضدار کا نقصان ہو جاتا یا دیوالہ نکل جاتا تو پھر اس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے، ان کو خیال تھا کہ دہلی کے پنجابی تجارت کو

خوب سمجھتے ہیں ان کو دل کھول کر روپیہ دیتے تھے اور اکثر اُن ہی کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے تھے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، ایک صاحب جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں مولوی صاحب کے پاس آئے۔ تجارت کا ذکر چھڑا، اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز بلا کسی ضمانت کے گیارہ ہزار روپیہ کا چک مولوی صاحب نے ان کے نام لکھ دیا۔ بڑے ٹھاٹھ سے سنہری مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی۔ مولوی صاحب جاتے گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے دوکاندار صاحب کی لچھے دار باتیں سنتے چلتے وقت کچھ روپیہ جیب میں ڈالنے کو مل جاتے اس لئے خوش خوش بغیر حساب کیے گھر آ جاتے۔ یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی صاحب کو چوکنا کر دیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔

قصہ مختصر، اصل میں سے دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما اس نے دیوالہ نکال دیا۔ قرقی ہوئی مال نیلام چڑھا اور اس میرے یار نے کُل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا۔ مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی، اس کے بعد آیا، بہت رویا بہت ٹسوے بہائے، مولوی صاحب سمجھے بے چارے کو بڑا رنج ہوا، کہا بھئی جاؤ تجارت میں یہی ہوتا ہے یا اس پار یا اُس پار، چلو گئی گذری بات ہوئی۔ ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جا رہے تھے کچھ جھٹپٹا ہوا تھا کیا دیکھتے ہیں کہ دوکاندار صاحب خوب بنے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے، ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اُترے اور آ کر ایک کھلی گاڑی میں سوار ہوئے، مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹک گئے۔ اتنے میں انھوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا، بہت مسکرا کر سلام کیا رنڈی نے چپکے چپکے کچھ دریافت کیا تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ ''یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے'' مولوی صاحب کے آگ لگ گئی، دوسرے ہی دن نالش ٹھونک دی اور آخر اِن کو ٹھکانے لگا کر ہی دم کیا، لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، اُنھوں نے خود بھی آ کر بہت کچھ توبہ تلا کی لیکن یہ نہ ماننا تھا، نہ مانے اور آخر جب اس کو کھک کر دیا اس وقت اُن کو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے، مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا ان کے دل میں تھا، کچھ تھوڑا بہت لوگوں کے کہنے سننے سے متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا، لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لئے جیسا دفتر چاہیے وہ انھوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔ سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے، اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے، ایک تو حافظ، دوسرے عالم، تیسرے لستان بھلا ان سے کون در آ سکتا تھا اور تو

اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے، خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے، قرضہ کس سے لیا جائے یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا، کہنے لگے ''کتنا روپیہ چاہیے'' میں نے کہا ''بارہ ہزار'' بولے ''ضمانت'' میں نے کہا ''چوڑی والوں والا مکان'' پوچھا ''کتنی مالیت کا ہے'' میں نے کہا ''کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا'' فرمایا ''کل قبالہ لیتے آنا'' میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی، بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا۔ دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا، پڑھ کر کہا ''ٹھیک ہے، مگر بیٹا سود کیا دو گے''۔ میں نے کہا ''مولوی صاحب آپ اور سود'' کہنے لگے ''کیوں اس میں کیا ہرج ہے، میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لو گے، اس کو خوشی سے سود دو گے، ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہونچاؤ گے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا، آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں، میرا بھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں، جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے جا کر تصفیہ کر آؤ، کل ہی چک بنگال بنک کے نام لکھے دیتا ہوں'' میں نے کہا ''مولوی صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں اور لیتے ہیں کس سے کہ اپنے شاگردوں سے۔'' کہنے لگے ''اس کی پروانہ کرو جب مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا، جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں، تم سے چودہ آنے لوں گا''۔ میں نے آ کر گھر میں ذکر کیا۔ ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑہ پر روپیہ مل گیا، اس لیے یہ معاملہ یونہی کا یونہی رہ گیا۔ لیجیے یہ قصے تو سنا چکا۔ اب اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کے واقعات جو ان کی زبانی سنے تھے بیان کرتا ہوں۔

ایک دن مولوی صاحب ''معلقات'' پڑھا رہے تھے، عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا جب اس شعر پر پہنچے

ابا هند فلا تعجل علینا   وانظرنا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے کتاب رکھ دی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے، ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ شعر میں تو کوئی ہنسی کی بات نہیں، پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مرض اُٹھا ہے۔ آخر جب ہنسنے کا ذرا زور کم ہوا تو وجہ دریافت کی، مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے ''میاں بعض شعر قصہ طلب ہوتے ہیں، یہ شعر میری زندگی کے قصے کا آغاز ہے، اچھا لو سناتا ہوں، مگر پہلے تمہید سن لو، بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، تعلیم کا شوق تھا، اس لئے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں آ کر ٹھہر گیا، یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے، ان سے پڑھتا اور توکل پر گذارہ کرتا۔

مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے، انھیں بھی پڑھاتے مجھے بھی پڑھاتے، دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا، تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا، چار پانچ برس میں ''معلقات'' پڑھنے لگا، گو میری عمر بارہ سال کی تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا، پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں ہاتھ میں چھڑی لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا، کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی، کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا، غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے تھے، ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ اِدھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، اُدھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی، جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوالیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلّہ بھر کا مصالحہ اٹھالاتی تھی، پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے، جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا، بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر انھوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی، چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا، بہر حال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی، تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، اور بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے، خدا غریق رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا۔ بھئی دیکھنا میں نے بھی کیسی مزے کی تاریخ کہی ہے''۔ اس کے بعد انھوں نے عربی کے چار پانچ اشعار کا قطعہ سنایا، مادۂ تاریخ ''لہا غفر'' تھا، میں نے بڑے زور سے ''اوں ہوں'' کی۔ بگڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا'' کیوں آپ کو اس پر کچھ اعتراض ہے''؟ میں نے عرض کی،'' جی نہیں لیکن اس قطعہ کو سن کر مجھے دبیر کی ایک رباعی یاد آ گئی۔ فرماتے ہیں

ہم شانِ نجف نہ عرش انور ٹھہرا
میزان میں یہ بھاری وہ سبک تر ٹھہرا
اس پلّے میں تھا نجف اور اس پلّے میں عرش
پہنچا وہ فلک پر یہ زمیں پر ٹھہرا

بڑے غور سے سنتے رہے پھر کہنے لگے "یہ تو بے معنی ہے نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھ دو اس سے یہ رباعی متعلق ہوجائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہوگی" میں نے عرض کی کہ "آپ کے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کردو متعلق ہوجائے گا۔اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔اوّل تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابلِ تعریف نہیں ہوتیں۔دوسرے سرسیّد کی تاریخ انتقال "غفرلہ" پرآپ نے صرف الف کا اضافہ کر کے اس کو اپنا مال کرلیا ہے" مسکرا کر کہنے لگے "اچھا بھئی تو ہی سچا سہی" خیر اب اس جھگڑے کو چھوڑو اور میری اصلی کہانی کو لو، ہاں تو فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کا چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے،ایک روز جو کشمیری دروازے کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے، کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدر الدین صاحب آئے ہیں۔ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں، برآمدے میں پہنچا،قد چھوٹا تھا۔لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا، دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے،اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں،ایک ایک لڑکا آتا ہے اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔یہ مدرسہ کے پرنسپل صاحب تھے۔ہم تماشے میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لئے اٹھے۔ چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو دروازہ روکے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے، چپراسی زبردستی دھکیل رہے تھے،غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہوگیا، دروازے کے سامنے سنگِ مرمر کا فرش تھا،اس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا،اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آ گئے تھے،انھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اُٹھایا، پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی،ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر "کالنقش فی الحجر" ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا،میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا، پھر پوچھا، میں نے پھر وہی جواب دیا میری عمر پوچھی، میں نے کہا "مجھے کیا معلوم" وہ میرا ہاتھ پکڑ بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے کہ میں "معلقات" پڑھتا ہوں، ذرا دیکھئے تو سہی سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں بناتا ہے"۔ مفتی صاحب نے کہا "تو کیا پڑھتا ہے؟" میں نے کہا "معلقات"! کہنے لگے "کہاں پڑھتا ہے"؟ میں نے کہا "پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں" پھر کہا "معلقات دوں پڑھے گا؟" میں نے کہا "لایئے" انھوں نے میز پر سے

کتاب اٹھائی میرے ہاتھ میں دی اور کہا "یہاں سے پڑھ" جس شعر پر انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا

ابا هند فلا تعجل علینا
وانظرنا نخبرک الیقینا

میں نے پڑھا معنی بیان کئے، انھوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی، میاں دانی تمہاری طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحت تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب کا یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا۔ اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ مفتی صاحب بہت چکرائے پوچھنے لگے "تجھے کون پڑھاتا ہے"؟ میں نے کہا "مسجد کے مولوی صاحب" کہا "مدرسہ میں پڑھے گا" میں نے جواب دیا "ضرور پڑھوں گا" مفتی صاحب نے قلم اٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا "اس کو پریذیڈنٹ صاحب کے پاس پیش کر دینا" ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے، مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا، کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا، اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہوگئی ہے، کل سے اس کو آپ کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجئے، اس کا وظیفہ بھی ہوگیا ہے، چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا، مولوی صاحب نے مجھ کو بلایا، خط دکھایا، پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے"؟ میں نے کچھ جواب نہ دیا، جب ذرا سختی کی تو میں نے واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں منشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے، میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا، ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہوشیار تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں میں نے اپنی سب جماعت والوں کو دبالیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی انھوں نے لہک لہک کر یہ شعر

ابا هند فلا تعجل علینا
وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی" کہنے لگے "پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی، دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی

جماعت''۔ دانی نے کہا''مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے''؟ مولوی صاحب ہنسے اور کہا ''میاں دانی! ہم پڑھتے تھے آج کل کے طالب علموں کی طرح چوتڑوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے (مولوی صاحب اس فقرہ کا استعمال اکثر کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے) ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں۔ آج پڑھا کل بھولے، تمہاری تعلیم ایسی دیوار ہے، جس میں گارے کا بھی رڈا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے پتھر بھی ہے کہیں کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے، ایک دھکا دیا اور اڑا اڑا دھم گری، ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے تھے، پڑھانے والے بھی ایرے غیرے بچکلیاں نہیں ہوتے تھے، ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آجکل کے عالم محض کاٹھ کے الّو ہیں۔ اچھا بھئی اچھا آگے چلو''۔

بانا نورد الروایات بیضا
و نصدر هن جمراً قد روینا

میں نے کہا''مولوی صاحب پہلے شعر کے معنی تو رہ ہی گئے'' کہنے لگے''اتنا بڑا قصہ سنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے، پس اس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک ملا کا بیٹا، ڈاکٹر، ڈپٹی، شمس العلماء ایل۔ ایل۔ ڈی ہو گیا ساتھ آسانی کے بیچ اسی دِلّی کے، بوجہ اس شعر کے۔''

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سن چکے، اب ہماری تعلیم کا حال سنیئے اور قصہ کو سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے دن سے لیجیے۔

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسہ سے آئے اور کھانا وانا کھایا، سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے، مکان کا پتہ، پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ میں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے، دروازے کی ایک چوکی پر میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا، بی چماری رسّی ہاتھ میں لیے اونگھ رہی تھیں، کبھی کبھی رسّی کو ایک آدھ جھٹکا دے دیتی تھیں، کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لئے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا، اندر زنانہ تو نہیں ہے۔ غرض اسی شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا، ہم دونوں اُٹھے اور دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا۔ بی چماری نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ اس میں گردن ڈال کر جھانکا، چوں کہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے اس لئے کچھ دکھائی نہ

دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا ''کون ہے'' اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے مگر بی چماری اچھل پڑی اور بے اختیار ان کے منہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا ''کون ہے'' میں نے کہا ''میں اور دانی'' مولوی صاحب نے کہا ''آؤ بیٹا، اندر آؤ'' مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اُتر آئے، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی، تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اس کے بعد کہا ایک کتاب میرے لئے بھی لیتے آنا۔ ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دے دی اور دوسری سے مل کر کام نکالا۔ کیا پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اس کا میں آئندہ ذکر کروں گا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اُٹھے تو سب کچھ یاد تھا مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ معلوم ہوتا تھا خوشی خوشی گھر آئے چلو ''اللہ دے اور بندہ لے''۔

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے، یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلباء کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالب علم مسٹر رضا کے دل میں گدگدی اُٹھی، وہ آئے، ہم سے ملے اور کہا ''بھئی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں، مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے'' ہم نے کہا ''چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے، دو کو نہ پڑھایا تین کو پڑھایا'' انھوں نے کہا ''نہیں پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو'' ہم نے کہا ''یار چلو بھی، اگر انھوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمہ'' وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہ پہلے پوچھ لو، اس عرصہ میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا، انھوں نے کہا ''لیتے کیوں نہ آئے'' ہم نے کہا ''وہ ذرا شرمیلے ہیں بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے'' انھوں نے کہا ''طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا، خیر کل ضرور ساتھ لانا، ذرا ان کا بھی رنگ دیکھ لوں'' شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہہ دیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر دھرنا دیئے بیٹھے تھے ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے، مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور کہا لاؤ کتاب، ہم نے کتاب طاق پر سے اُتار کر ان کے ہاتھ میں دے دی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آبیٹھے اور کہا، ''اچھا یہ ہیں میاں رضا''! بیچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا ''جی ہاں'' مولوی صاحب نے کہا ''اچھا بھئی شروع کرو''۔

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں دانی اب اس کو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے۔ جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا ''ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں، کیا منہ میں گھنگنیاں بھر کر آئے ہو، اچھا میاں رضا! تم ہی

شروع کرو!'' رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، مگر اعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر میاں دانی سے زیادہ بنا دیا۔ ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے، اس کے بعد کہنے لگے ''واہ بھئی واہ، ہم کو عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں، میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے'' رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا کر کہا ''بسر وچشم'' مولوی صاحب نے کہا ''دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا'' انھوں نے کہا ''جی نہیں'' مولوی صاحب نے کہا ''اچھا تو میری یہ صلاح ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا'' یہ سن کر وہ بیچارے کچھ پژمردہ سے ہوگئے مولوی صاحب نے کہا ''بھئی رضا یہ میں نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو، میں تم کو ضرور پڑھاؤں گا مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت ''کالی جان'' کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو، اتنے دنوں کے آتے جاتے میں تمہارے کانوں کو نظم ونثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا، بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھرتے دیکھا نہیں جاتا، بے چارے متنبّی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کمرے میں ان کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے'' بیچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے۔ راستہ میں ہم نے ان کو بہت بنایا، دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سن چکے اب ہماری بے حیائی کی داستان بھی سن لیجئے! میری صرف ونحو بہت کمزور تھی اور کمزور کیوں نہ ہوتی، شروع کیے ہوئے کے دن ہوئے تھے، اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا، نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقّت پڑتی تھی، شعر خود بھی کہتا تھا دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اس لیے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جز بز ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا، معلوم نہیں کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا ''ہیں! کیا پڑھا'' میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا، انھوں نے، پھر بڑے زور سے ''ہوں'' کی ہم نے پھر اعراب بدل دیئے۔ اس سے ان کو غصہ آ گیا، کہا ''دانی تم پڑھو'' انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارہ ایک سودس ڈگری پر چڑھ گیا کتاب اٹھا کر جو پھینکی تو کمرہ سے گذر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں جا پہنچی اور نہایت غصیلی آواز میں کہا ''نکل جاؤ، ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ، نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہوا اور نہ میں تمہارے پڑھانے کے

لائق'' دانی نے میری طرف دیکھا، میں نے دانی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا ''چلو'' میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا ''ہرگز نہیں'' اُنھوں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبا دیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے، آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے اب جاتے ہو یا نہیں، میں نے کہا ''مولوی صاحب جب تک کوئی دھکے دے کر نہ نکالے گا اس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو پھر ابھی آ جائیں گے''۔ مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے '' کہنے لگے اچھا نہیں جاتے ہو نہ جاؤ، مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤں گا''۔ میں نے کہا '' نہ پڑھایئے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ہلے ہیں نہ ہلیں گے۔'' کہنے لگے ''بیٹا اس وقت میری طبیعت خراب ہوگئی ہے، اب چلے جاؤ کل آ جانا''۔ دانی نے بچ جانا، میں سمجھا کہ اس وقت اٹھے تو مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ دانی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر ان کو بٹھا لیا مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے، میں نے کہا ''مولوی صاحب پڑھیں گے تو اس وقت پڑھیں گے، پڑھانا ہے تو پڑھایئے ورنہ ہم کو یہاں سے جانا ہے نہ جائیں گے'' آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے، کہنے لگے '' خدا محفوظ رکھے تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہو گئے، اچھا بھئی میں ہارا، اچھا خدا کے لیے کتاب اٹھا لاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو، دیکھئے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے'' میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھا لایا اور مولوی صاحب جیسے تھے ویسے کے ویسے ہو گئے، کہا کرتے تھے ''اگر اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں نے تمہارے شوق کو آزماتا تھا مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا، خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے، یہ بے حیائی نہیں میاں یہ شوق ہے۔ علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے وہ بری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں''۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب الٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے دانی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف ونحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے ''بارہ پتھر باہر'' سمجھ لیا جاتا تھا کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا ''آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے'' اس کے بعد معنی بیان کیے، نکات بتائے اور پھر اس مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا، اب میاں دانی خارج از بحث ہو گئے۔ اول تو مجھے یونہی ہزاروں اشعار یاد تھے، دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔

مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا، غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعراء اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا، اس میں دائی بھی شریک ہو جاتے اگر کوئی شعر قصہ طلب ہوا اور اسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گذرا ہوتا تو اس قصہ کے ساتھ اپنا قصہ بھی ضرور بیان کر دیتے۔ غرض ایک شعر کی تصریح میں آدھ آدھ گھنٹہ گذر جاتا مگر اس کے بعد جو شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا۔ چناں چہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں۔ اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا تو اس سلسلہ میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شرفائے دہلی پر اس طوفانِ بدتمیزی میں گذری تھی اس کی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے۔ اکثر کہا کرتے تھے ''میاں بے چارا بہادر شاہ مجبور تھا، کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا، یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑے آئے تھے، ان کا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا وہ پورا ہوا اور انہوں نے دہلی کو ٹھک کر دیا۔'' ''ایک روز میں دریبہ میں جا رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تلنگوں کی آ رہی ہے، میں بھی دب کر گلاب گندھی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ، پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے، مگر ان کی عجیب کیفیت تھی، گھوڑے کیا تھے دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے، بیچ میں سوار تھے، مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا یہ گٹھریاں کیا تھیں دہلی کی لوٹ، جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا، اس کے کپڑے تک اتر والیے، جس روپیہ پیسے والے کو دیکھا، اس کے گھر پر جا کر دھنی دے دی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعہ کو، تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے، جب تک کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ چھوڑا، اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے، غرض خدائی فوجداروں کا یہ لشکر غل مچاتا، دین دین کے نعرے لگاتا، میرے سامنے سے گذرا۔ اس جمِ غفیر کے بیچوں بیچ دولہا میاں تھے، یہ کون تھے، عالی جناب بہادر خاں صاحب سپہ سالار، لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولہا معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور سے لدے ہوئے تھے، پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ، صافے پر بجائے طرے کے سراسری لگائی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور میں لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان ہی کے ہاتھ آ گئی ہے۔ گلاب گندھی نے جوان لٹیروں کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی اور اندر دروازوں سے

بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اسی کی دوکان کے سامنے آ کر رکا، بہادر خاں نے اِدھر اُدھر گردن پھیری، پوچھا "یہ کس کی دوکان ہے" ان کے ایڈی کانگ نے عرض کی کہ گلاب گندھی کی" فرمایا "اس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ مابدولت ادھر سے گذر رہے ہیں، دوکان بند کرنے کے کیا معنی، ابھی کھلواؤ" خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کا بے چارے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا، ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ "دروازہ کھولو" اور جس طرح "سم سم کھل جا" کے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا اُسی طرح اس حکم سے گلاب کی دوکان کھل گئی، بجنسہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اٹھ گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ لالہ جی ہانپتے کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے، کچھ بولنا چاہتے تھے مگر زبان یاری نہ دیتی تھی، اس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے کسی موٹی اسامی کو مار کر آئے تھے۔ کہنے لگے "تمہاری ہی دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے"؟ لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا، حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو، وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کئے۔ معلوم نہیں بیس روپے تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے کا، بہادر خاں نے دونوں کنٹر لئے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں، عطر سونگھا، کچھ پسند آیا ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا اور دوسرا دم پر، کنٹر پھینک کر حکم دیا گیا "فارورڈ" اس طرح بچارے گلاب گندھی کا سینکڑوں روپے کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے، ادھر اس خدائی فوجدار کا جانا اور اُدھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا بچارے لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دوکان بند کر دی۔ غرض غدر کے طوفان بے تمیزی میں نقصان جو ہونا تھا وہ ہوا مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین نصب تھی پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کی نذر کی تھی۔ اس کا سامنے کا شیشہ بڑی دِقت سے تیار ہوا تھا۔ اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا غرض یہ کہ دوربین کالج کا سرمایۂ ناز تھی، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے۔ غدر کے زمانے میں کسی بدمعاش کی اس پر بھی نظر پڑ گئی اس نے جا کر فوج میں اڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری دروازہ سے آ کر کالج کے اوپر توپ لگا دی ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے، یہ سننا تھا کہ ساری فوج کالج پر

چڑھ آئی، سیڑھیاں لگا کر، سینکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے، ایک کندۂ ناتراش نے بندوق کا کندہ سامنے کے شیشہ پر مارا، چھن سے شیشے کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی، ان نابکاروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، دور بین کی دور بین اٹھا نیچے پھینک دی اور چند ہی منٹ کے اندر دین دین کے نعروں میں اس یادگار سلف کا ان ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہوگیا۔''

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سنے ہیں لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ ان کا موجودہ زمانے میں دُہرانا خطرناک ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے۔ ہم بی۔ اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک لاجواب مضمون پر انعام مقرر ہوا۔ اس مضمون کے لئے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے جو کچھ لکھا جائے شہر کے بڈھے بڑھیوں سے دریافت کر کے لکھا جائے۔ میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور مجھ ہی کو یہ انعام ملا۔ میں نے اس مضمون میں ایک باب مولوی صاحب کے بیان کردہ قصوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ میں کرید کرید کر مولوی صاحب سے اس مضمون کے لیے واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے اب وہ مضمون دریابُرد نہیں تو دریا پار ضرور ہوگیا۔ مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے اس لئے اب اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سُن چکے، اب مولویوں کی جماعت کا حال بھی سن لیجیے۔ اس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار کے ہی لوگ تھے، لمبے لمبے کرتے، بڑی بڑی آستینیں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو تھان کی شلواریں، شملہ بمقدار علم کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے پگڑ، لمبی لمبی ڈاڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اٹھا کر بتاشوں کی گلی میں رکھ دیا گیا ہے۔ محنت کی یہ حالت کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے، گھونٹا ایسے کہ باوجود اس محنت کے کورے کے کورے رہتے، مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ ان کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور کہتے ''بھئی میں ان ملانوں سے عاجز آ گیا ہوں، اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی۔ جواب اس لئے نہیں دے دیتا کہ دل شکنی ہوگی۔ مگر کیا کروں اللہ میاں نے ان لوگوں کو ادب سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بھلا ان کو ''حماسہ'' یا متنبی'' پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے، فوج میں نوکر ہو جائیں، محنت مزدوری کریں یا ہینگ کا توبڑا گلے میں ڈال کر بیچتے پھریں!'' ہم کہتے ''مولوی صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں، رگڑ سے پتھر بھی گِس جاتا ہے۔ آخر متنبی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں کہ جو غور کرنے سے سمجھ میں نہ آئیں'' ایک روز فرمانے لگے ''لو آج تم ٹھہر جاؤ اور ان مولویوں کا رنگ بھی دیکھ لو، مگر دیکھو کہیں ہنس نہ دینا ورنہ چھری بھونک دیں

گے" اس روز ہم کو بھی چھٹی تھی، ہم پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ یہ جماعت آ گئی یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے اور ہم اُٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اس روز مقامات حریری کا سبق تھا، کتابیں کھولی گئیں اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں اعوذ باللہ سے سبق شروع کیا۔ زید بن حارث کے سفر کا حال تھا اور رات کے وقت سفر کرنے کو "فی اناءِ اللیل" سے ادا کیا تھا، ان بھلے آدمیوں نے رات کو قاموس دیکھ کر مطالعہ کیا تھا اُس میں شامتِ اعمال سے "اناء" کے معنی مٹکے کے بھی ہیں "اللہ دے اور بندہ لے" انھوں نے یہاں مٹکا پھنسا دیا اور نہایت متانت سے "فی اناءِ اللیل" کے معنی "رات کے مٹکے میں سفر کیا" سے کر دیے، مولوی صاحب نے فرمایا "اناء" کے دوسرے معنی بھی تو ہیں پڑھنے والے نے کہا "جی ہاں کئی معنی ہیں لیکن اس مقام پر مٹکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے" ہم کو ہنسی آئی، مولوی صاحب نے مسکرا کر اور ان لوگوں نے نہایت بڑے بڑے دیدوں سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سوچا بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں، یہاں سے کھسک ہی جانا مناسب ہے کہیں کوئی اُٹھ کر گلا نہ گھونٹ دے، ہم نے اجازت چاہی مولوی صاحب کہتے ہی رہے "بیٹھو ذرا اور کچھ سن جاؤ" ہم نے کہا "مولوی صاحب ہم کو کام ہے کسی اور دن دیکھا جائے گا" یہ کہہ جوتیاں پہن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے، کوٹھے سے اتر جو ہنسنا شروع کیا تو گھر پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رکی۔ اب جب کبھی خیال آتا ہے تو اس جماعت کا نقشہ آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے اور رات کے مٹکے میں سفر کرنے کا فقرہ ہنساتا نہیں تو مسکراہٹ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمہ پر ناز تھا اور اکثر اس کا ذکر فخریہ لہجے میں کیا کرتے تھے۔ اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچا دی ہے وہ ان کے نزدیک بہت معمولی چیزیں تھیں، وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ اس میں مجھے جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ کے ترجمہ میں میرا سارا سارا دن صرف ہو گیا ہے، میاں سچ کہنا کیسا محاورہ کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے، ہم نے کہا "مولوی صاحب بٹھایا نہیں ٹھونسا ہے"۔ جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی صاحب اچھل پڑے، بڑے خفا ہوتے اور کہتے "کل کے لونڈو میرے محاوروں کو غلط بتاتے ہو، میاں میری اُردو کا سکہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے، خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے"۔ محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ کہا کرتا تھا، مولوی صاحب آپ نے محاوروں کی فہرست تیار کر لی ہے اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں، خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو، جناب والا اہل زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاروں پر حاوی ہے، یہ صرف وہ

لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں دہلی والے ہیں" تھوڑی دیر تو حجت کرتے، اس کے بعد کہتے "اچھا بھئی تم ہی دہلی والے سہی، ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے، تم ہم کو دہلی والوں کی فہرست سے نکال دو، مگر میاں اپنا ہی نقصان کرو گے۔"

مجھ کو مولوی صاحب کی طرز تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اوّل تو میرے لئے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے، دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گذر کر مفقود کی سرحد میں آ گئی ہے لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا، تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے، ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستہ میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے، غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں مولوی بھی ہوں، بہر حال ان کی تحریر کا ایک رنگ ہے اور اس کی نقل اتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ ترجمہ کرنے کا انھیں خاص ملکہ تھا، وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اس کا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا، ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوبصورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے۔ ہم نے اجازت لے کر کتاب اٹھائی اور اول سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں، اول تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے "بیٹا! یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو گھر لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو، مگر دیکھو خراب نہ کرنا۔"

ہم دونوں نے دل میں سوچا کہ خدا معلوم کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں۔ خوش خوش کتاب بغل میں مار گھر آئے، دو ایک روز میں پڑھ ڈالا، ایک آدھ تصویر بھی غائب کر دی، چوتھے روز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالہ کی۔ پوچھا "کہو پسند آئی" ہم نے کہا "مولوی صاحب خوب کتاب ہے"۔ کہنے لگے "اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو" ہم نے کورا جواب دے دیا۔ کہا

"دیکھو، سنو اس کتاب کا مجھے ترجمہ کرنا ہے، تم سے ترجمہ کراؤں گا، صحیح میں کروں گا اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں، اگر اب کے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دوں گا، یہ کہتے کہتے کتاب کی جلد توڑ دس صفحہ میرے اور دس میاں دانی کے حوالہ کر دیے۔ ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی اور وہ آئے اُن کو حکم دیا کہ "ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا ان دونوں کو دے دو۔" "قہرِ درویش بر جان درویش" کی صورت تھی جس طرح پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے تھے اسی طرح منہ بنائے ہوئے ان پلندوں کو بغل میں مارا گھر آ کر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا، دوسرے روز جا کر پڑھنے کے لئے کتاب اُٹھائی، پوچھا "ترجمہ لائے" ہم نے دبی ہوئی آواز میں کہا "لائے"۔ کہا "پہلے وہ پڑھو" ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب اصل کتاب دیکھ کر اس کی درستی کرتے جاتے، اب اگر میں یا میاں دانی کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانیے کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ مولوی صاحب کی اصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہو گیا اور تھوڑی ہی دنوں میں کتاب ختم ہو گئی۔ اس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی کیوں کہ بندۂ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا، مگر کچھ پروا نہیں اس کا بدلہ اب ہم لئے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں، یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کاٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چوں کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اس لئے اُن کو کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ ادائے مطلب کے لئے ضرور مل جاتا تھا مثلاً اسی جشن تاجپوشی کی کتاب میں ایک جگہ لفظ stallion آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اس کے معنی "سیاہ بڑا جنگی گھوڑا" نکلے، یاروں نے ترجمہ میں وہی الفاظ ٹھونک دیے، جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سُنے تو بہت ہنسے، کہنے لگے "واہ بیٹا واہ کیوں نہ ہو، دہلی والے ہو، خالص اردو لکھی ہے، بندۂ خدا "شبدیز" لکھ دو، چلو چھٹی ہوئی"۔ کوئی صاحب اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں۔ ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے، لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اٹھا کر دیکھو وہی لفظ پر لفظ، معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا، سینکڑوں کتابوں کے ترجمہ ہوئے، دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ جوں کا توں ہے، ایک لفظ ادھر سے اُدھر نہیں ہوا۔ کہا کرتے تھے کہ

تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے، اس کتاب کے ترجمہ کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا، ان میں ایک مولوی عظمت اللہ صاحب تھے اس کی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمہ تھی اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے سررشتہ دار تھے، روزانہ ایک دو دفعات کا ترجمہ آتا ہم ڈئرکٹر صاحب کو سناتے، وہ بڑا غل مچاتے کہ "یہ لفظ خلاف محاورہ ہے، اس لفظ سے مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے" غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں، مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی یہ یہ باتیں سنے کوئی، مگر بھئی یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا "باون تولے پاؤ رتی" کی کہتا تھا، جو اعتراض کرتا تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ میاں پُرانے زمانے کے انگریز غضب کی اُردو سمجھتے تھے گو اچھی اُردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمہ کی وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دہلی والوں کے کان پکڑوا دیں۔ میں نے بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا۔ میں نے کہا کہ نذیر احمد تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آجاتا، اُردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہے، کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کرلے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا، رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار، لنگوٹ باندھ ترجمہ پر پل پڑا، جن دفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونے والا تھا ان کا ترجمہ خود کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا، ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا ان لوگوں کے ترجمہ کو سن کر وہی گڑ بڑ شروع کی، خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی۔ میں نے کہا کہ "کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے"۔ کہا "اچھا کہو" میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے۔ لینے کو ہاتھ بڑھایا میں نے کہا "عرضی نہیں ہے، آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے بھی کیا ہے"۔ ڈائرکٹر صاحب یہ سن کر اچھل پڑے، کہنے لگے، تم نے، تم نے ترجمہ کیا ہے، تم کو تو انگریزی نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا؟ میں نے کہا "رائل ڈکشنری سے"، انھوں نے ہنس کر کہا "تعزیراتِ ہند کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا" میں نے کہا "سن تو لیجئے" کہا "اچھا سناؤ" میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کہنے لگے "یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے؟" میں نے کہا "ہاں" کہنے لگے "کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کر کے لاؤ" میں دوسرے دن لے کر گیا، بہت پسند کیا اور کہا "تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کرسکتا ہوں جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا، جاؤ تم بھی ان ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ" اس دن سے ہم بھی پانچوں سواروں میں مل گئے اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیے ہیں۔ اگر کوئی کہتا بھی

کہ ''مراۃ العروس'' پر تم کو انعام ملے گا تو میں اس کو دیوانہ سمجھتا، اصل یہ ہے کہ میں نے یہ کتاب اپنی لڑکی کے لئے لکھی تھی وہی پڑھا کرتی تھی، میاں بشیر کو ''چند پند'' لکھ دی تھی۔ میں اس زمانہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلا تھا، بال بچے ساتھ تھے، ایک جگہ ٹھہرے تھے کہ مسٹر کیمپ سن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرہ بھی قریب میں آ لگا۔ شام کا وقت تھا، میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلے، اُدھر ڈائرکٹر صاحب آ رہے تھے میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا، صاحب ٹھہر گئے، پوچھا ''میاں تمہارا کیا نام ہے؟'' انھوں نے نام بتایا، پھر پوچھا ''تمہارے والد کون ہیں''؟ انھوں نے میرا نام بتایا، پھر پوچھا ''کہو میاں کیا پڑھتے ہو'' انھوں نے کہا ''چند پند'' ڈائرکٹر صاحب سمجھتے تھے کہ اردو کی پہلی یا دوسری کہے گا ''چند پند'' کا نام سن کر پریشان ہوئے کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے ان کے کان نا آشنا تھے، کہا، ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے، بشیر نے کہا ''جی ہاں ابھی لاتا ہوں، ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھیے گا'' انھوں نے کہا ''اس کتاب کا کیا نام ہے''؟ انھوں نے کہا ''مراۃ العروس'' یہ دوسرا نیا نام تھا، صاحب نے کہا ''ہاں وہ بھی لاؤ'' میاں بشیر ٹٹوانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے اور اپنا جز دان کھول ''چند پند'' نکالی، اس کے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا، اس نے جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی، اتنے میں بشیر ''مراۃ العروس'' لے کر بھاگا یہ اس کے پیچھے بھاگی، دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی، خوب رونا پیٹنا ہوا، بشیر بہن کو دھکا دے، کتاب لے، یہ جا وہ جا۔ بہن صاحبہ نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا، میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالہ کیں۔ انھوں نے اُلٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا ''ہم یہ کتابیں لے جائیں گے کل بھجوا دیں گے۔'' انھوں نے کہا ''لے جایئے، کل ہم کو چھٹی رہے گی'' میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے۔ لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کر لی ہیں، میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا ہے، میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے۔ پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا، وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی، آخر بڑی مشکل سے اتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا، میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے پڑے ہیں ان میں وہ اترے ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں سے کیا کام، خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دوں گا، نہیں تو دوسری دونگا، اس نے کہا کہ میں لوں گی تو وہی کتاب لوں گی بڑی مشکل سے اس

کا غصہ ٹھنڈا کیا، اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں، سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہوسکتا ہے۔ غرض اس شش و پنج میں صبح ہوگئی کوئی سات بجے ہوں گے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں۔ وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے ''مراۃ العروس'' پڑھ رہے ہیں، سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا ''مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند ہی روز میں بچوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں اگر آپ اجازت دیں تو ''مراۃ العروس'' کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصابِ تعلیم میں داخل ہوسکیں''، میں نے کہا ''آپ کو اختیار ہے'' یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی، وہاں سے انعام ملا، یہاں شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں، جو کتاب لکھی اس پر انعام، جو لکھا وہ پسند کیا گیا، غرض ہم مصنف بھی بن گئے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ انسان کا عہدہ جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اس کی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے یہی مصیبت ہم پر پڑی، ادھر کام کی زیادتی، اُدھر سرسیّد کی فرمائشوں کی بھرمار، آج یہاں لیکچر دیا، کل وہاں دیا، تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا، خدا خدا کر کے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کر لیا، اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کر لو، لوگوں کو بھی مفید ہوگا اور شاید تمہاری نجات کا بھی ذریعہ ہو جائے، غرض جتنی محنت ممکن تھی اتنی محنت کی، اسی ترجمہ کے سلسلے میں ''الحقوق والفرائض'' کا مواد بھی جمع کر لیا، کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک پنتھ کئی کاج ہو گئے۔ مگر بھئی سچ کہنا ''کیسا ترجمہ کیا ہے''میں تو خاموش رہا مگر دانی نے کہا کہ ''مولوی صاحب ہم کو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' مولوی صاحب نے کہا ''ہیں میاں دانی! یہ کیا کہا تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا، بھئی غضب کیا، ارے میاں رحیم بخش ذرا ادھر تو آنا، وہ سنہری جلد کی حمائل شریف ہے میاں دانی کو دے دو، بیٹا ذرا اس کو غور سے پڑھو، دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے۔'' غرض حمائل شریف میاں دانی کے قبضہ میں آ گئی۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی۔ جب ہم اُٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا ''ارے بھئی ایک بات تو کہنی بھول گیا۔ اس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپے ہے، کل ضرور لیتے آنا'' بچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے روز ساڑھے پانچ روپیہ مولوی صاحب نے دھروا لیے۔

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رتی حملے کیے لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں کبھی ایک پیسہ نہ دیا، یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا، میں اس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ ''اچھا بھئی تو یونہی لے جا، مگر میرا پیچھا چھوڑ'' میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا، مولوی صاحب قیمت مانگتے میں حجت کرتا، وہ جواب دیتے، میں اس کا جواب دیتا، غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا، مگر خدا غریق رحمت کرے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مجھ کو دے دیتے تھے اور جان بوجھ کر جھگڑتے تھے۔ ریویو کے لئے جو کتابیں آتیں۔ وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں، وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحہ اول پر میرا نام درج ہو کر شہادت دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل اختیار کر لیتا اس وقت بھی میرے پاس اس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں، معلوم نہیں کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ اُن کے پاس رہی یا نہیں، کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل۔ ایل۔ ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا، ہوا یہ کہ جب میں اور دانی۔ بی۔ اے میں پاس ہوئے تو جلسہ تقسیم اسناد کے لئے لاہور جانا پڑا، گون بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا، اب خیال ہوا کہ گون کسی کی چھینیں۔ دانی کو تو گون مل گئی میں نے مولوی صاحب کی گون تا کی۔ ہم دونوں مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا، کہنے لگے ''بیٹا میری گون بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھ سو روپے میں دو گونیں پڑی ہیں بھلا میں کیا خریدتا۔ یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں، وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے۔ مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجئے، سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں، سر ولیم میور ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر تھے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے میں نے مشرف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کی جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں۔ ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ بھی تھا وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں اور ہمیں گھر بیٹھے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری مل گئی مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی۔ پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل۔ ایل۔ ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سُرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے۔ براہ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپے روانہ فرمائیے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر رہا ہے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پلندہ بھی آ گیا۔

غرض اسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گذر گیا، دوسری ڈاک سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا۔ ''قہر درویش بر جان درویش'' درزی صاحب کو رقم روانہ کی، مشرف کو بُرا بھلا لکھا کہ وہاں سے یہ تھیلے بنوا کر بھجوانے کیا ضروری تھے میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوالیتا، بہرحال یہ گونیں ساڑھے چھ سو روپے کی ہیں۔ معاف کیجئے میں نہیں دے سکتا، جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا۔ جو میرے پیچھے پڑا ہے''۔ میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا اس کے بعد بغیر کچھ کہے سُنے اٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رخ کیا۔ وہ ''ہاں ہاں'' کہتے ہی رہے۔ میں نے کنڈی کھول اندر گھس الماری میں سے کالی گون نکال ہی لی۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اٹھے میں اتنی دیر میں دروازہ بند کر، گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آ گیا۔ مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے اور اب انھوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات۔ بی۔ اے اور ایل ایل ڈی کی گون کے اختلاف، غرض اسی طرح بیسیوں چیزوں پر لکچر دے ڈالے۔ مگر میں بیٹھا سنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا، استادوں کی غیبت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت۔ وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں نے بھی اسپیچ دے دی اور آخر میں صاف کہہ دیا کہ یہ گون میں لے کر جاؤں گا اور ضرور لے کر جاؤں گا۔ اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے ''واپس کب کرو گے'' میں نے کہا ''آپ سُرخ گون پہنتے ہیں، کالی گون مجھے دے دیجیے، آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا فائدہ ہو جائے گا''۔ مولوی صاحب نے کہا ''نہیں بیٹا لاہور سے آ کر دے دیجیو، مجھے دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے'' یہ الفاظ انھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ ہی کرتے بن پڑی۔ آخر میں گون لے کر گیا اور لاہور سے آ کر واپس کر دی، جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کر لیا، اس وقت بہت خفا ہوئے، کہنے لگے ''اب کے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا نہ ہوگا، کل کو میرا کیش بکس اٹھا کر لے جائے گا، خیر دانی گون لے جاتا تو کچھ حرج نہ تھا، کیونکہ واپسی کی تو اُمید رہتی، مجھے کب اُمید تھی کہ آپ بزرگ واپس بھی کریں گے وہ تو کہو میرا حلال کا مال تھا جو واپس آ گیا'' میں نے کہا ''مولوی صاحب اگر پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی تمام عمر شکل بھی نہ دیکھتے''۔ ہنس کر کہنے لگے ''چلو ''مشتے بعد از جنگ'' کی صورت ہے۔ آئندہ میں دینے میں احتیاط کروں گا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا''۔ اس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں مگر اب افسوس ہوتا ہے کہ گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار رہتی، کیا

یہ ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیج دے، کیوں کہ اس میں میرا بھی حق ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی لیکن وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ ہاتھ سے گئی میری غلطی تھی جو اس کو لے جا کر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

جس طرح مسز مشرف نے یہ گونیں مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں اسی طرح نواب محسن الملک نے حیدرآباد میں فرنیچر ان کے سر چپک دیا تھا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں نواب محسن الملک کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کی تجویز اور سرسید کی تحریک پر مولوی صاحب حیدرآباد آئے۔ پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا، اس کے بعد علیحدہ کوٹھی میں جا رہے۔ ہندوستانی وضع کا سامان، تخت چوکیاں وغیرہ خرید لیں، بھلا محسن الملک یہ کیوں کر دیکھ سکتے تھے کہ ان کا دوست پُرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے، ایک روز سکندرآباد جا ایلین اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دے دیا اور کہہ دیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچا دو اور بل بنا کر بھیج دو، ایک روز جو مولوی صاحب اُٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے پر چھکڑا، فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے، بہت چکرائے لینے سے انکار کر دیا۔ مگر وہ نواب محسن الملک کا پڑھایا ہوا جن تھا، وہ کب ماننے والا تھا، آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے اور دن بھر میں مولوی صاحب کا مکان صاحب بہادر کی کوٹھی ہو گیا، مگر یہ بھی نذیر احمد صاحب تھے، کچھ ایسی چال چلے کہ جب ان کا تقرر پنچرو کی صدر تعلق داری پر ہوا تو وہ سب کا سب سامان بہت ہی تھوڑی کمی پر ایلین کے سر مارا۔ پنچر و وہی اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے، نواب محسن الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے، نواب محسن الملک دورے پر نکلے، پنچرو قیام کیا، مولوی صاحب خود کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ ''میں آیا ہوں میرے قیام کا انتظام کر دو''۔ ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں، ایک دو میزیں تھیں کھول دیا گیا۔ وہ ایلین والے فرنیچر کی تلاش میں تھے، سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا رکھا ہو گا اندر کہلا بھجوایا کہ ''میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھیروں گا'' پہلے تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہو گی، مگر جب اِدھر سے اصرار ہوا تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا، اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفا چٹ میدان ہے، نہ دری ہے نہ چاندنی، نہ میز ہے نہ کرسی، کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے اس پر ایک چھوٹا سا کمبل پڑا ہوا ہے، بازو میں ایک چوکی پر رحل اور جانماز رکھی ہے، کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت چکرائے، لوگوں سے پوچھا ''وہ فرنیچر کہاں گیا'' معلوم ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اس کے کوڑے کر آئے۔ بچارے ایک رات ٹھہرے اور صبح ہی

کوچ بول دیا۔

کچھ عرصے تک تو نواب محسن الملک اوران کی بنی رہی بعد میں اتنی کھنچی کہ ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہوکر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔ غرض جب عمادالسلطنت کا زمانہ آیااور محسن الملک بہادر کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کومیدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا۔ دوسرے حیدر آباد میں صحبت کا جو رنگ تھاوہ ایسانہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اس زمانے کے جو حالات مولوی صاحب بیان کیا کرتے تھے ان کا زبانِ قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے، بعد میں دونوں بظاہر ملتے جلتے تھے لیکن موقعہ پڑتا تو ایک دوسرے کو پردے ہی پردے میں سنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ ۱۹۰۳ء کے دربار کے موقع پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ہوا۔ اس زمانہ میں نواب محسن الملک علی گڈھ کالج کے سکریٹری تھے۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائی نس سر آغا خان تھے۔ آدمیوں کی کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ ملتی تھی، ہر جلسہ میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے، ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کے لئے مقرر ہوا، مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا، اس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے خلقت ٹوٹ پڑی، لکچر شروع ہوا تھا کہ لارڈ کچز نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤں گا، نواب محسن الملک نے ایسے باوقعت اور ذی وجاہت مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں، مولوی صاحب کے لکچر میں اس سے کھنڈت پڑتی تھی۔ پنڈال کے باہر گڑبڑ ہوئی اور نواب محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچز آئے۔ اُٹھ کر باہر جاتے اور پھر آبیٹھتے۔ اسی طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے، مولوی صاحب بہت جز بز ہوئے، خفا بھی ہوئے مگر ان کی کون سنتا تھا۔ قصہ مختصر آخر لارڈ کچز آ ہی گئے، نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا، مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کرایا۔ لارڈ کچز کہنے لگے ''مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' مولوی صاحب نے کہا ''لاٹ صاحب مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمہ حل ہوگیا۔'' لارڈ کچز نے کہا ''وہ کیا معمہ تھا؟'' مولوی صاحب نے کہا ''ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرادے گی، مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔ جب

آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرادیے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرادے"۔ تمام پنڈال میں سناٹا ہوگیا مگر مولوی صاحب کو جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے اور اس طرح اپنے دل کا بخار نکال لیا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید وشاید، چناں چہ امیر حبیب اللہ خاں ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقرعید کے دن دہلی میں تھے۔ اس روز جمعہ تھا صبح کو بقرعید کی نماز عیدگاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا، اس دربار میں آٹھ یا نو دہلی کے ہندو امیر اور اسی قدر مسلمان مشاہیر بلائے گئے۔ ان میں ایک مولوی صاحب بھی تھے، سرہنری میک موہن نے ان لوگوں کا تعارف امیر صاحب سے کرایا۔ جب مولوی صاحب کی باری آئی اور ان کی تعریف سرہنری نے کی تو امیر صاحب نے کہا "آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں میں خود ان کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں، دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہوگیا"۔ اس کے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا "آپ شعر بھی کہتے ہیں۔" مولوی صاحب نے کہا "جی ہاں کہتا ہوں لیکن آج آپ کی تعریف میں اپنا نہیں دوسروں کا شعر سناؤں گا، یہ کہہ کر متنبی کا یہ شعر پڑھا

عید و عید و عید مجتمعاً

وجه الحبیب و یوم العید والجمعا

موقع کے لحاظ سے یہ ایسا برمحل ہوگیا کہ متنبی کو نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات اور خاص کر حبیب کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی۔ تمام دربار چمک اُٹھا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اُٹھ کر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور اتنے بوسے لئے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے۔ دوسرے روز جوانھوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا۔ اس کو انھیں کے الفاظ میں دہرانا اچھا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے "بھئی میں تو شعر پڑھ کے مصیبت میں پھنس گیا، شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آ کر مجھے دبوچ لیا۔ اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ، میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی، اس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ادھر تو ہڈیاں پلپلی ہوگئیں اُدھر دم گھٹنے لگا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں، جنبش تک نہیں ہوتی، قسم خدا کی اس وقت سے ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے۔ بارے خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علیحدہ ہوا ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسے پر بوسہ لینا شروع کیا، بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو، کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم

ہوتا ہوگا، مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہہ کر پھر لپٹ جاتا، لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسہ پر بوسہ لینا شروع کرتا، بے چارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے۔ جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی سے پانی رستا ہے، نا بھائی نا ایسے درباروں کو میرا دور ہی سے سلام ہے، کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈیاں تڑوائے" مولوی صاحب گو اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے، مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جا رہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔

اسی تیزی طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی، جو کہنا ہوتا تھا وہ بغیر کہے نہ رہتے تھے، اس میں کسی لفٹنٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے۔ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندوستانی یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اس وقت تک ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا۔ اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بڑا غصہ آیا، خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے چند ہی روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے جو ہندوستان کے لاٹ پادری تھے تشریف لائے۔ شامتِ اعمال سے انھوں نے بھی اپنے لکچر کا موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لارڈ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مولوی صاحب تجویز کیے گئے اب کیا تھا "اللہ دے اور بندہ لے" جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا خوب اچھی طرح نکال لیا۔ کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے مولوی صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات۔ مگر انھوں نے جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی خاموش نہیں ہوئے، سب سے پہلے انھوں نے ہندوستان کے مغربی اثر کو نہایت پر مذاق پہلو سے بیان کیا فرمانے لگے "حضرات پیجامہ اچھا ہے یا پتلون۔ ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے، اٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامہ ہی کو اچھا کہیں گے، مگر آج کل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے، یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے، اس سے سَتر ڈھکتا ہے، آدمی بھاری بھر کم معلوم ہوتا ہے، ہمارے یورپ کے دلدادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے، کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے نرم نرم اور سبک ہوتی ہے، ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز

کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے، ان کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں اور بھئی ہے بھی یہی بات، قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے، ان کی ہر چیز ہمارے لئے قابلِ تقلید ہے اور ان کا ہر فعل ہمارے لئے چراغِ ہدایت، اب افعال سے گذر کر اقوال تک نوبت آ گئی ہے پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑ و اور انگریزی سچ بولا کرو۔ آج ہمارے پادری لیفرائے بھی ان کے ہمنوا ہوئے ہیں۔ یا تو انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آ گیا ہے کہ پجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اتار پھینک دیا جائے اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے، یا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال دساور ہو کر ولایت سے آیا ہے، بہر حال کچھ بھی ہو، اب تمہارے پرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے۔ خدا کے لیے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو، یہ بڑے لوگ ہیں۔ مولوی نذیر احمد یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ اُنھوں نے ہندوستانی سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم نے ہنس کر ٹال دیا، لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سچ نہ بولو گے اور یہ تازہ مال استعمال نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کو محتاج ہو جاؤ گے، کیونکہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑ و اور تجارت یا صنعت وحرفت اختیار کرو، اسی سے تمہارے دلدّر دور ہوں گے۔''

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ لیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔ لاٹ صاحب اُردو بہت اچھی جانتے تھے، مولوی صاحب کی اس پر مذاق تقریر پر مسکراتے رہے مگر دل کا خدا ہی مالک تھا، کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، مگر یہاں ''تیراز کمان جستہ'' کی صورت تھی کیا کر سکتے تھے۔ البتہ دل میں انھوں نے ٹھان لی ہوگی کہ آئندہ مولوی صاحب کو شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدرآباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دہلی میں مولوی صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ ''امہات الامہ'' کی وجہ سے مولوی صاحب پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اس کا ذکر چھیڑا کہنے لگے ''بھئی مجھے تو اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہو جائیں، تم نے بھی یہ کتاب دیکھی ہوگی۔ آخر تم ہی بتاؤ اس میں مَیں نے ایسی کون سی نئی بات لکھی ہے'' میں نے خود ''امہات الامہ'' نہیں دیکھی تھی مگر میں مولوی صاحب کے طرز

تحریر سے واقف تھا اس لیے میں نے یہی کہا کہ ''مولوی صاحب آپ کا طرزِ تحریر مذاق کا پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے، وہ کچھ قصہ کہانیوں ہی میں مزا دیتا ہے، تاریخ کی کتابوں اور خاص کر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا اگر لوگوں کو اعتراض ہوگا تو آپ کی طرزِ تحریر ہی کے متعلق ہوگا۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''میرے کلام مجید کے ترجمہ کے متعلق تو یہ اودھم نہیں مچا۔'' میں نے کہا ''اس پر بھی لوگوں کے اعتراض ہیں مگر اس میں آپ کا معاملہ اللہ میاں سے ہے اور یہاں انسانوں سے، مشہور مقولہ ہے۔

با خدا دیوانہ باش

و با محمد ہوشیار

کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے ''ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو، اس قسم کی تالیفات میرے دائرۂ تحریر سے باہر ہیں، انشاء اللہ دوسرے اڈیشن میں اس نقص کو رفع کردوں گا'' جب میں چلنے لگا تو فرمایا ''کہو بیٹا پھر ملوگے، ابھی تو تمہارے جانے میں بہت دن ہیں۔'' میں نے کہا ''انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔'' ہنس کر کہنے لگے ''انشاء اللہ کہنے کے بعد تم ضرور آئے، مسلمانوں کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ انشاء اللہ ضرور کروں گا۔ ہم تو اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہے ہاں اگر خدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرا دیا تو مجبوراً کرلیں گے''۔ میں نے کہا ''مولوی صاحب آپ کو انشاء اللہ کے یہ معنی پہنانے مناسب نہیں ہیں آپ مذاقیہ پہلو مذہبی معاملات میں بھی نہیں چھوڑتے۔'' کہنے لگے ''پہلے انشاء اللہ کے معنی دوسرے تھے، آجکل کے مسلمان وہی معنی لیتے ہیں جو میں نے بیان کیے۔'' خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا اور صبح ہی کے میل سے میں ایسا دہلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آ کر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا اس میں آرہے تھے۔ رعشہ میں اضافہ ہوگیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا کہنے لگے ''ہیں! یہ کون صاجب ہیں''؟ میں نے کہا ''میں ہوں۔'' پھر ''آخر میں کون صاحب ہوئے، نام کیوں نہیں بتاتے، ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی دیتا ذرا قریب آؤ'' میں نے کہا ''واہ مولوی صاحب واہ، اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا دور سے پہچانیے تو بات ہے''۔ ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے ''اوہو مرزا

فرحت صاحب ہیں، بھلا اور کون یہ بے تکی باتیں کرے گا، آؤ بیٹا اب کے تو کئی برس کے بعد آئے۔" میں پاس گیا، گلے لگایا، حالات پوچھتے رہے، باتیں کرتے کرتے کہا "ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں کیا بجا ہے" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا "ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں" کہنے لگے "اوہو دیر ہوگئی۔ ذرا میرا جوتا اور جرابیں تو لے آؤ۔" میں نے لاکر جرابیں پہنائیں، جوتا سوکھ کر لکڑی ہوگیا تھا وہ زبردستی پاؤں میں ٹھونسا، جوتا پہن کر کھڑے ہوگئے، میں نے کھونٹی پر سے اتار کر شیروانی اور ٹوپی دی، وہ پہن کر کہنے لگے "چلو بھئی وقت تنگ ہوگیا ہے" میں نے کہا "مولوی صاحب آخر کہاں جانا ہے" کہنے لگے "بیٹا آج اک مقدمہ کی پیشی ہے وہاں جارہا ہوں، ذرا مجھ کو کشمیری دروازے تک تو لے چل" میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترے، باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں، میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا کیجیے، خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ آخر یہ کس دن کے لئے ہے، روپیہ اسی لیے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے، بال بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے پھر کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، ذرا اپنی حالت کو دیکھیے اور کشمیری دروازے کو دیکھیے، یہ دو میل جانا اور دو میل آنا آپ کو مضمحل کردے گا، ذرا ٹھہر جایئے میں گاڑی لے آتا ہوں" بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے، اب چلنا ہے تو چل، نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں، ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جاسکوں" میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب تو گاڑی رکھ لیجیے، اگر آپ خرچ نہیں اُٹھاتے تو میں اُٹھاؤں گا" ہنس کر کہنے لگے "کیوں نہ ہو روپیہ اُچھلنے لگا ہے، کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں، بیٹا بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لیے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا، ایک تو دانہ گھاس چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا، کل وہ توڑا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے، رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی، اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے، اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہوکر پھرتے ہیں، نا بھئی نا، اب گاڑی رکھنا وضعداری کے خلاف ہے" میں نے کہا "تو کمیشن ہی جاری کرالیا ہوتا" کہنے لگے "وہ بھی میری وضعداری کے خلاف ہے، ہمیشہ کچہری میں جاکر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضع داری کو کیوں توڑوں۔" بہر حال یہی حجت کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی، انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں

بٹھایا اور سب سے پہلے انھیں کا مقدمہ لے کر ان کی شہادت قلمبند کی۔ اور یہ جس طرح گئے تھے اسی طرح ہانپتے ہانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدرآباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا، جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی کے مکان پر ضرور جاتا ہوں، اندر قدم نہیں رکھتا، مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں، اور رہ رہ کر ذوقؔ کا یہ شعر زبان پر آتا ہے

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اللہ بس باقی ہوس

مولوی عبدالحق

نام دیو، مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہوگیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھتا۔ پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔ اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر

اُسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا، ان کو توانا اور ٹاٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اُسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچالیتا۔ اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لئے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اُسے علاج کے لئے بلالے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر جھاڑنا بہارنا صبح شام روز آنہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فنیسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسرے سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے۔ یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہوگئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے

دِق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا۔ اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگذاری پر اُسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی، اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اونچ تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا۔ اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔

آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اُسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھولا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اُسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا۔ لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے۔ اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے، حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

آصف علی

میرن صاحب

(۱)

یوں تو مرزا نوشہ کا زمانہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی شمعِ شبِ رفتہ کی طرح گل ہوگیا، مگر کل تک اُس اُجڑی ہوئی محفل کی دو چار صورتیں موجود تھیں۔ ان صحبتوں اور مجلسوں کو درہم برہم ہوئے زمانہ ہو چکا مگر میر مہدی مجروحؔ اور میرن صاحب کے دم سے اُس دور کی یاد پھر تازہ تھی۔ سو میر مہدی مجروحؔ کو رحلت کیے آج چھے یا سات برس ہو لیے اور ۲۹/ جنوری ۱۹۱۴ء جمعہ کی صبح کو میرن صاحب بھی راہیِ ملکِ بقا ہوئے اور اُن کے ساتھ ہی مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے زمانے کا دفتر بھی طے ہوگیا۔ مرزا کے ہم جلیسوں میں سے ممکن ہے ابھی اور لوگ زندہ ہوں اور یوں تو جناب مولانا الطاف حسین حالیؔ صاحب کی ذات مغتنمات میں سے ہے اور مرزا کی یاد اُن کے دم اور یادگارِ غالب سے قائم ہے۔ مگر میرن صاحب کہاں۔ جہاں اُردو کے چرچے ہیں وہاں غالبؔ بھی موجود ہیں اور جو غالبؔ کے کلام سے آشنا ہیں، وہ میرن صاحب کے نام سے لاعلم نہیں۔ جب تک اُردوے معلّی کے مکتوبات باقی ہیں، میرن صاحب کا نام بھی باقی رہے گا۔

میرن صاحب صرف مرزا کے ہم جلیس ہونے کے لحاظ سے ہی تبرّک نہ تھے بلکہ اس کے علاوہ غدر سے پہلے کے بزرگوں اور قلعے کے لوگوں کا بھی نمونہ تھے۔ وضع قطع، بات چیت، حسنِ اخلاق، آدابِ صحبت غرض کہ ہر لحاظ سے وہ اس گئے گزرے زمانے کی یاد تھے۔ بات بات میں وضع کی پابندی اور ہر کلمے

میں بات کا پاس۔ صورت شکل میں بھی کسی زمانے میں نہایت خوب رو و وجیہہ نوجوان ہوں گے، جس کے آثار آخر دم تک اُن کے چہرے سے عیاں تھے۔ نقشہ و نگار نہایت سلیس اور جبین کی فراخی، شرافت کی شاہد۔ آنکھ بڑی اور خوب صورت تھی۔ رنگ کبھی کھلا ہوا ہوگا مگر اب بہ وجہِ ضعیفی اور ہجومِ امراض سانولا ہوگیا تھا۔ پُرانی وضع کے مطابق ڈاڑھی چڑھی رکھتے تھے۔ قلعے کی قطع وبُرید کا انگرکھا زیبِ تن، سر پر گول سوزنی کی یا کڑھی ہوئی ٹوپی، اور پیر میں ہمیشہ حاشیے دار سلیم شاہی جوڑا۔ گاہے ماہے انگرکھے پر صدری، سیدھا تنگ پاجامہ اور یا تو کندھے پر ایک بڑا سا رومال یا بغل میں پُرانی وضع کے مطابق دوپٹا اور ایک ہاتھ میں چھڑی ہوا کرتی تھی۔ اس آخری زمانے میں ضعیفی سے کمر جھک گئی تھی مگر اللہ رے پابندیِ وضع، اگر لال دروازے سے تیسرے چوتھے کا چوڑی والوں کا پھیرا تھا تو وہ ناغہ نہ ہوتا تھا اور اگر دوسرے تیسرے روز کا نیا محل کا قاعدہ تھا تو اس میں فرق نہ آتا تھا۔ ایسا پاسِ وضع اس زمانے میں عنقا ہے۔ جو راہ و رسم دوستوں سے تھی، اس میں بل نہ آنے دیتے تھے اور جس محبت واُلفت کے عزیز مستحق تھے، اس میں کوتاہی نہ ہوتی تھی۔ جس قاعدے اور قرینے کے اول دن سے پابند تھے، اس میں سرمو فرق نہ ہونے پاتا تھا۔

اِس زمانے کی چھچھوری ترت پھرت اور شب و روز کی 'تو چل میں آیا' سے بے حد نالاں تھے اور شاکی تھے کہ اس زمانے کی تعلیم نہ بڑے کا ادب سکھائے نہ چھوٹے کا لحاظ۔ لوگوں کی کم بضاعتیِ اخلاق اور زمانے کے مصنوعی طمطراق سے قطعی ناخوش تھے اور اپنے زمانے کے خلوص، پابندیِ وضع اور صدق دلی کے نوحہ گر۔ کہا کرتے تھے: ''بھائی اب وہ زمانے کہاں اور اب وہ باتیں کہاں! نہ وہ دلی ہے اب اور نہ وہ لوگ ہیں۔ غدر سے پہلے یہ دہلی تھوڑی تھی جو آج ہے۔ اے لو وہ اب چاندنی چوک میں نہر کہاں ہے اور وہ حوض کہاں ہے جس کی جگہ اب وہ تمہارا گھنٹا گھر ہے۔ پھر وہ صحبتیں کہاں اور وہ پہلے لوگ اور اُن کے اخلاق کہاں۔''

حقیقت تو یہ ہے کہ میرن صاحب کی گفتگو سُن کر مرزا کے زمانے کی روح تازہ ہوجاتی تھی اور نہ صرف اُس زمانے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا بلکہ ان لوگوں کی بات چیت کا بھی مزہ آجاتا تھا۔ صد حیف آج میرن صاحب بھی فسانہ ہوگئے۔ مگر کون رہا ہے اور کون رہ جائے گا، مگر اُن کے ساتھ ہی اُس پرانے زمانے کی طرزِ تعلیم کی حلاوت اور چاشنی بھی اب ختم ہے۔ اس زمانے میں نہ وہ سادگی و خلوص ہے اور نہ وہ لب و لہجہ۔ اِدھر تو غیر زبانوں اور باہر کے لوگوں کا میل ہوا، اُدھر جدید تہذیب اور نئی روشنی کی عنایت سے جو رہی سہی باتیں تھیں وہ بھی عنقا ہوگئیں۔ جب کبھی جدید ترقی و تہذیب کا ذکر آتا تھا تو اِکراہ سے کہا کرتے تھے کہ ہاں ہوگی۔ باقی یوں اب ریل اور برقی روشنی اور برقی تار وغیرہ کے عادی ہوگئے

تھے۔ بالعموم میرن صاحب کی باتوں میں ایک بھولا پن ہوتا تھا جو بد قسمتی سے اس زمانے کے بچوں میں بھی مفقود ہے اور جو اُس دور کے لوگوں میں عام طور پر پایا جاتا تھا۔

جب کبھی غالبؔ کا ذکر آ جاتا تھا، نہایت ادب سے نام لیتے اور ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر سفلہ پسندیٔ زمانہ کے ہمیشہ شاکی تھے۔ ذاتی تعلقات کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے عزیز تو عزیز، وہ عزیزوں کے دوستوں اور دوستوں کے عزیزوں سے بھی وہی خلوص کا برتاؤ رکھتے تھے اور اگر کسی اس زمانے والے میں پرانے اخلاق یا حسنِ آداب کی چھینٹ بھی پاتے تھے تو خاص ملاطفت اور اُنسیت سے پیش آتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ مایہ فی زمانہ گراں ہے۔

مرزا کی دوستی پر بجا ناز تھا اور مرزا کے خطوط حرزِ جاں تھے۔ خود بھی شعروسخن سے خاص شوق تھا اور شعر کہتے بھی تھے، مگر بجز اُن کے احبابِ خاص کے اور کسی نے نہ آج تک اُن کا کلام دیکھا نہ سنا۔ مگر ان کے خطوط میں ضرور مرزا کا طرز نمایاں تھا اور روشِ تحریر میں اُردوئے معلّٰی کی چاشنی موجود تھی۔ اُن کے نبیرے سید محمد رؤف علی صاحب بیرسٹرایٹ لا دہلی پر علمی دنیا کا فرض ہے کہ وہ میرن صاحب کے خط اور اُن کے کلام کے ذخیرے سے دنیا کو محروم نہ رکھیں۔ نیز ان کے نانا صاحب مرحوم کے متعلق جو بھی قلم سے نکلے گا قابلِ قدر ہوگا۔

(۲)

گذشتہ سال جب میرن صاحب زندہ تھے، ایک دن حسنِ اتفاق سے وہ سید محمد رؤف علی صاحب کی علالت کے زمانے میں نواسے کی خیر صلاح کو چوڑی والوں آ نکلے اور میں بھی اس وقت وہاں معمول کے موافق موجود تھا۔ اُس دن کے بعد پھر مجھے قدم بوسی حاصل کرنی نصیب نہ ہوئی جس کا قلق مجھے تا زیست رہے گا اور وہ بالخصوص اس وجہ سے کہ اُس دن ارادۃً میں نے مرزا کا ذکر چھیڑ دیا اور ارادہ کرلیا کہ آج جو لفظ ان کی زبان سے نکلے گا قلم بند کرلوں گا، کیوں کہ ہر لفظ بیش بہا ہوگا اور یہ خود شمع شب رفتہ ہیں، قبر میں پانو لٹکائے بیٹھے ہیں، ان کی زندگی کا بھروسا نہیں، جو بھی حاصل ہو جائے غنیمت ہے۔ اور بلا کسی بات کے چھیڑے وہ خود کبھی ہرگز ایک لفظ مرزا کے متعلق یا نیرنگیِ زمانہ کے متعلق اپنی زبان سے کہنے والے نہ تھے۔ خیر جو کچھ انھوں نے اس دن اپنی زبان سے کہا، میں نے قلم بند کرلیا اور ذیل میں موجود ہے۔ مگر صد ہزار

افسوس کہ یہ معاملہ مکمل نہ ہوا اور آج ادھوراہی طبع ہوگا اُدھراُن کی علالت اور اِدھر میرے یہاں آ جانے نے اس مکالمے کو پورا نہ ہونے دیا۔ ورنہ ارادہ تھا کہ خود اُن کی زبان سے مرزا کے حالات اور اُس دور کی کیفیات سُن کر قلم بند کرتا۔ مگر اب وہ کملی ہی نہ رہی جس میں تل بندھتے تھے۔ اب کہاں میرن صاحب اور کہاں اس مکالمے کی تکمیل۔ مگر جو ہے، ہدیۂ ناظرین ہے:

میں: کیوں حضت! مرزا کا زمانہ تو خوب یاد ہوگا۔

میرن صاحب: اے لو یہ خوب کہی! ارے بھئی یاد کیسا، واہ واہ، یاد کسے کہتے ہیں میری مرزا کے ہاں رات دن کی نشست و برخاست تھی، ہر وقت کی صحبت تھی، ہر وقت کا ملنا جلنا تھا۔ جس دن سے مرزا نوشہ کا انتقال ہوا زندگی بدمزہ ہوگئی، زیست کا لطف جاتا رہا، اب کہاں وہ صحبتیں، ہم بھی اب چراغِ سحری ہیں، کوئی دن کی ہوا ہے۔ اب کون باقی ہے دلی میں، اُس زمانے کے لوگ اب کہاں پیدا ہیں اور مرزا نوشہ جیسے لوگ تو اب پیدا ہی کہاں ہوتے ہیں۔ اُن کے وہ اوصاف تھے کہ انتہا کا ہے کو ہے۔ (کہ انتہا کا ہے کو ہے، میرن صاحب کا خاص اپنا فقرہ تھا) کوئی بات لطیفے سے خالی نہ تھی۔ بات بات میں ظرافت نکلتی تھی۔ تمام محفل کو ہنساتے رہتے تھے۔ اور رنج سے تو واسطہ کیا۔ اور پھر متانت بھی ایسی کہ کچھ انتہا کا ہے کو ہے۔

میں: جی ہاں حضت بجا درست ارشاد ہوا۔ اب وہ زمانے کہاں رہے خواب و خیال ہو گئے۔

میرن صاحب: ہاں بھائی! ان صحبتوں کا لطف بس اُنہی تک تھا۔ اب نہ وہ لوگ ہیں، نہ وہ باتیں ہیں نہ وہ تہذیب ہے۔ اب تو وہ نئی روشنی ہے اور نئے لوگ ہیں۔ بھائی میر مہدی (میر مہدی مجروحؔ) کہا کرتے تھے کہ وہ جگنو بھی ہوتا ہے نا، پٹ بیجنا، بس اس کی مثال ہے۔

میں: میر مہدی مجروحؔ نے بھی اچھی طبیعت پائی تھی، بجا ارشاد ہوا، واقعی موجودہ روشنی کی وہی مثال ہے جو آپ نے فرمائی۔

میرن صاحب: میں قلعے میں رہا کرتا تھا اور بھائی میر مہدی اُردو بازار میں رہا کرتے تھے۔ اُردو بازار بلاقی بیگم کے کوچے کے سامنے ہی تھا، اب تو وہ کھنڈر ہے۔

میں اور بھائی میر مہدی دونوں روز مرزا نوشہ کے ہاں جایا کرتے تھے۔ یا تو میں بھائی میر مہدی کو لے لیا کرتا یا وہ مجھے لے لیا کرتے تھے۔ ہم نے مرزا صاحب کے ہاں قدم رکھا اور کہا: حضت آداب عرض ہے۔ اور اُدھر سے انھوں نے کہا: میں بھی آداب عرض کرتا ہوں۔ اِدھر سے ہم نے چھیڑنے کو کہا: حضت

یہ کیا! اور اُدھر سے انھوں نے کہا: بھئ تمہارے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ آیئے بیٹھیے! آج کئی دن کے بعد آئے، کہاں رہے؟ اور ہم نے کہا: اجی حضت ابھی تو ہو کے گئے ہیں۔ اور وہ بولے: کہیں اور گئے ہوگے، یہاں نہیں آئے۔ اور ہم اصرار کر رہے ہیں کہ ابھی تو ہو کے گئے تھے۔ پھر وہ مسکرا کے کہتے: بھئ میں ضعیف بھولا بھالا آدمی تم لڑکوں کے کہے میں آجاتا ہوں۔ آؤ بیٹھو۔

مزاج اس قدر نازک تھا کہ انتہا کا ہے کو ہے۔ کوٹھے پر نشست تھی اور دور دور کے لوگ آئے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ چار ملازم تھے اور کلّو ان کے داروغہ تھے۔ محفل میں ہر ایک کے سامنے علیٰحدہ علیٰحدہ کلیاں بھری رکھی رہا کرتی تھیں اور ان کا قاعدہ تھا کہ ذرا پکی چلم پیا کرتے تھے۔ اگر نیا آدمی ناواقف آتا اور کلی سامنے رکھی گئی اور اُس نے کہیں چینی شروع کر دی، بس اُسی وقت مرزا صاحب سمجھ گئے کہ باہر کا آدمی ہے، تہذیب سے ناواقف ہے، اور اُسی وقت اُن کا مزاج بگڑ گیا۔ کلّو کو آواز دی اور کہا: آپ کو سلفہ بھر کے لا دو۔ اور وہ بے چارہ باہر کا آدمی بولا: جی نہیں، تو اہی پیتا ہوں۔ اور وہ کہہ رہے ہیں: جی نہیں، خدا جانے آپ نے کس وقت پیا ہوگا، آپ کو طلب ہے۔ داروغہ! آپ کو سلفہ بھر کے لا دو۔ اور وہ آدمی ہے کہ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔

بہت سے صاحب غرض اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ کوئی صاحب غرض ہے تو اُس کی زیادہ تواضع کرتے تھے۔ اور چلنے سے پہلے بلا کے داروغہ کے کان میں کہہ دیتے کہ ان کی پانچ یا دس روپے سے تواضع کرنا۔ مگر وہاں روپیہ کہاں تھا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے کی پنشن تھی اور اِدھر اُدھر سے روپے تین سو ایک ہو جاتے تھے۔ مگر وہ دس پندرہ دن کا بھی خرچ نہیں تھا۔ حالت یہ تھی کہ اگر اس وقت ایک ہزار کی تھیلی ان کے ہاتھوں میں دے دیجیے تو صبح تک ایک پیسہ نہ رہے۔ اب کلّو نے کہا کہ پچاس روپے پرسوں لایا تھا سب ہو چکے۔ اچھا تو بنیے کے ہاں باسن گردیں رکھ دو اور آپ کی پانچ روپے سے تواضع کرو۔ یہ سنتے ہی وہ گئے اور کہیں سے روپیہ لے آئے اور جس وقت صاحب غرض نے زینے سے نیچے قدم دھرا، انھوں نے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے یوں نذر کے طور پر پانچ یا دس جیسا موقع ہو، اُسے دے دیے۔ یہ حالت اُن کی رحم دلی کی تھی۔ اب یہ طبیعتیں کہاں ہیں۔

بھائی میر مہدی اور میں دن میں کئی کئی دفعہ جایا کرتے تھے۔ دوپہر کو وہ آئی ہوئی غزلیں بنایا کرتے تھے۔ نواب کلب علی خاں کے باپ نواب یوسف علی خاں کی بھی غزلیں آیا کرتی تھیں۔ ایک دن جو ہم پہنچے تو بیٹھتے ہی مرزا نوشہ نے عادت کے موافق ایک شعر سنایا

کیسی شفا، کہاں کی شفا، یہ بھی چند روز
قسمت میں تھا کہ نازِ مسیحا اٹھایے

ہم نے سنتے ہی کہا: سبحان اللہ! کیوں نہ ہو آپ کی طبیعت۔ کہنے لگے: ''ہیں، یہ کیا کہا! منہ پر تمانچے مارو۔ میں کیا۔ یہ تو نواب یوسف علی خاں صاحب کا شعر ہے''۔ تکبر سے تو واسطہ کیا۔

میں: ہاں قبلہ! کیوں نہ ہو، بھلا ایسی طبیعتوں میں تکبر کہاں۔

اس کے بعد میں نے اور چند سوالات کیے مگر ہزار بدقسمتی کہ اسی وقت ان کے جواب قلم بند نہ کیے۔ اسی ارادہ کرنے میں رہا کہ آج اس معاملے کو مکمل کروں گا اور بالآخر وہ قبر میں جا سوئے۔

اس آخری عمر اور ضعف میں بھی میرن صاحب کی آواز ایسی تازہ اور بلند تھی کہ اچھے جوان شرما جائیں۔ مگر ہجومِ امراض سے اس قدر نحیف و زار ہو گئے تھے کہ ان کی زندگی کا ایک دن کا بھی بھرو سانہ تھا۔ وہ کیا اُٹھ گئے کہ زمانہ غالب کے کارواں کی آخری طناب قطع ہو گئی۔ اب سوائے علمی تذکروں اور داستانوں کے اُس زمانے کا اور کیا باقی ہے، شاید اِدھر اُدھر کوئی باقی بھی ہے تو کیا، بس شمعِ سحری ہے۔ اِدھر صبا کا جھونکا آیا اور قصہ تمام ہوا۔:

— جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

رشید احمد صدیقی

کندن

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے!

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا، معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۳۰۔۳۵ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آ جائے گا! طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا، اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی، یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا، گھنٹے کی آواز روز مرہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آ رہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا!

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا، ارے کندن مر گیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مر گیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں، نظام فطرت میں اس سے زیادہ ناقابل التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظام فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان

کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی ''تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سبی!''

کندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آ جاتیں۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف، امیر، غریب گھرانوں کے خوبرو خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بقول انشاء ''ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن'' ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی امیدوں اور امنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آ تا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا، پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقررہ وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آ جاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا کندن کون کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لئے نہیں جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لیے۔ ہمیشہ جواب دیتا۔ ہجور فلاں گھنٹہ۔ چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلم ہو یا کلرک۔ اس کے ہجور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنع کی گراوٹ نہیں!

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس ۳۰۔۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دو چار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ زن زندہ بچو توئی یا زفستق بچومنی! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی!

....

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد

امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹنٹ اور کواڈرنیگل (کچی پکی بارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈر مقرر کیا اور کھچیرا (ایک بڈھا مہتر) کو لانس کارپورل (Lance corporal) خواص میں یہ کمپنی (Mirza Akhter Husain's own Fussiliery (مرزا اختر حسین اون فوسیلری) کے لقب سے اور عوام میں کندن کی سفرمینا کے نام سے مشہور ہوئی، امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب کندن اور یہ سفرمینا پلٹن ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی!

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے۔ جن کے لیے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف اُمیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہو جانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرئے تو اس کے اونچے برآمدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے۔ کوٹ کی اوپر کی جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا رکھتے۔ ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے بغل میں طرح طرح کی فائلیں۔ اور کاغذ کے پلندے ڈسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دیے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیے۔ زینے پر کندن اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی سفرمینا'' جاروب بدست و کھریا در بغل'' اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لیے کوئی نیتا کھڑا ہو اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن، سفرمینا کے ایک حصے کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہو جاتا دوسرا ڈیچ منٹ (Detachment) اہم پوزیشنوں پر جھاڑ دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا!

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا، یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کے کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ

نگرانی کے کام پر مامور ہوں لمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔اس کا حساب کندن رکھتا تھا۔اور مرزا صاحب ان خراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے کرتے تھے۔ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں۔قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران میں ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی،اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا،مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی قدر شوخ تھا۔کہنے لگا،ہجور اطلاع کرتا تو پہلے۔۔۔صاحب کے گھر والوں کو کرتا آپ کو کرنے سے کیا پھائیدہ تھا!مرزا صاحب نے فوراً اس دو چرپر بھی سُرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لیے یہ رعایت ہمیشہ کے لیے اٹھالی!چواز قومے یکے بے دانشی کرد!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحوں کے لیے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کرنئی کاپیا بنائی جاتی تھیں۔ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے،ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا۔جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابان اودھ کے ہاں وثیقے دار ہوتے تھے۔اُسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے،یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیے جاتے تھے۔بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوس شاہی کا یوم تقریب دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی عظمت الٰہی زبیری کے عہد رجسٹراری تک برقرار رہی اس کے بعد یہ قصہ ختم ہوگیا۔کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہونچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا کیوں کندن مرزا صاحب کے حضوری ہماری کارگذاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔تول ٹھیک ہے؟ کہتا ہجور بالکل ٹھیک ہے کھاتر جمع رکھیں۔ایک دن کندن کی عملداری میں سے گذرا۔نئی کاپیوں کے لیے پرانی کاپیاں پھاڑی جارہی تھیں۔پوچھا،کندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا،بولا،ہجور اب نبابی (نوابی) نہیں رہی۔دوسری عملداری ہے!میں نے کہا کوئی بات نہیں تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لیے نوابی زمانے والوں کے پاس

آ ہی جایا کرو!

....

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہو کر پٹنے چلے گئے اور امتحانات کے لیے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصے میں آ گیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کیے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم مئے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہو جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک کندن تھا! تقریب کہیں کیسی ہو، وقت کم ہو مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گذشتہ ۳۰۔۴۰ سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے۔

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں ''صلائے عام'' کے اُصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور، اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کہ یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا بُرا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی کا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کر لیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی کلکتہ بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے! یونیورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کی ایک اہم صفت اور ان کی ثبات وصحت وحواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد و نوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو رہے!

کسی شعبے یا شعبے کے کسی کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں، کیسی حالت میں ہیں، کتنی نوٹ پھوٹ میں آ گئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں اس کی خبر جتنی کندن کو تھی، خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی کمی، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی ان سب

سے نپٹنے کے لیے کندن کی ''ایک شخصی وزارت'' کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہو سکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آ جاتا کہ امتحان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈسک مُہیا کیے جا سکیں، شکر گزاری کے موجب ہوں گے، یہ خط لے کر کندن جاتا۔ پوچھتا۔ کندن کیسے کدھر آ نکلے؟ ہجور امتحان ہے نہ کرسی ڈسک چاہئیں۔ بھئی یہ ہمیشہ کا دھندا ہے۔ اس میں ایسا پوچھنا کیا۔ میاں خان (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے، اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کندن کے پہچان اور اٹکل کو کیا کہیے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبے جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہو گیا یا کسی کو اغوا کر لیا گیا!

کنووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہو کر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لیے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسی گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے چائے کے لیے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے انتظام۔ تین گھنٹے کے اندر اندر اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صبح کی ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے، جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازی گر کھلا! رات گئے تک یہ ''ہنگامہ شعر وسخن'' برپا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز کرسیاں حسب معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے!

جلالتہ الملک شاہ سعود اور اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کے مختلف اوقات میں ورود کی تقریبیں لوگوں کو

یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا۔ جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالیشان عمارت کھڑی ہے، یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا، دونوں تقریبوں میں حسب معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کر کے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیاء کو حسب منشاء میزوں پر چن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسب معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے، اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے اُن کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہو۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ نہ تو تکار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا جتنا پکا تعاون کندن کو نصیب تھا کم دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبران اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا، اس کا کسی شعبہ میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں فلاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیے۔ اس کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی۔ لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا، اس کی کون نہ مانتا!

....

میرا خیال ہے کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہند

سے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی انکل اور قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ اس پر کامل بھروسا نہ ہو۔ کندن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کا نہیں دوسرے سرکاری نیم سرکاری اور پرائیوٹ کام بے تکلف سپرد کر دیے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار بالکل نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آ کر بتایا کہ سائیکل کوئی اٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہوگئی، اور بس۔

امتحان کے کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے کے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا، یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑ بڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر اُدھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ اُن کا کا قاعدہ ہے کبھی انکار کیا کبھی ٹالنا چاہا، بالآخر کندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجۂ مجبوری وہ یہاں اپنی سفر مینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا۔ اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کرلوں گا یہ آفر یا چیلنج اُن کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جا کر پارسلوں کے جنگل میں سے اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا، امتحان ہی کے طرح طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے تلے اوپر گند مدر کھے ہوں گے۔ انہیں سے کندن کا اپنے پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبھے کی بات ہے!

۱۹۴۷ء کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل غارت گری کی جیسی ہوش ربا خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوس اور درماندگی کا جو عالم طاری تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے

میں یہاں تھے۔ کندن کا مکان دودھ پور میں تھا۔ جو یونیورسٹی سے ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کندن سے دو چار ہونے کا اتفاق ہو جاتا۔ پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابا رہے گا، گاؤں میں کیا خبر ہے، کندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔۔ کہتا ہجور کالج پر سید صاحب کی دُعا ہے۔ سب کھیریت رہے گی۔ کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، پرمیسر لاج رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کندن سے زیادہ مضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا، جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو ''سید صاحب'' کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہو!

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے بچے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آ رہے تھے۔ نہ کوئی جا سکتا تھا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے، وہ بیان سے باہر ہے۔ اس واقعے کا علم کندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں۔ صورت حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دلی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقلمندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب کیا گزری!

کندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ تو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں۔ چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہیے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا!

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں یہ صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کندن کو دودھ پور کا راج پرکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کندن چپکے چپکے راج پرکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا ہجور، یہ لڑکے ہیں نا جب چاہیں خود راج پرکھ بن جائیں۔ جب چاہیں دوسرے کو بنا دے۔ ان کا کیا؟

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سید محمود اور سرسید کورٹ میں آمدرفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے میں تھی۔ معلوم نہیں کب سے، یونیورسٹی کھلی ہو۔ ادھر سے گزرے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو یا آفسوں کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا، مزاج پوچھتا، کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو وہ بجالانے پر تیار تھا۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری کے اس تقاضے کے بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں!

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی عمر ایک خاص حد پر آ کر ٹھہر سی گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قوی شکل و صورت اور رفتار و گفتار میں عرصے سے نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو!

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پاٹ دار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا۔ نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ گرمی، نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھا ہوا اتنی محنت نہ کیا کر تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی ہجور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے"

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں، وکٹوریا گیٹ سے لے کر باب اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا اُن لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے ۳۰۔۳۵ سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دن میں نے کہا کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونیفارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور سے جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کو جانتے ہو کون تھا۔ بولا میں

جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمہارے سائے میں بسا ہوا ہے کسی دن وہاں پوچھ آنا،
ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمہاری ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب
علموں کی طرح وہاں کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں الٹ پلٹ ہوتی رہتیں۔

....

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لئے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ ''کالج کا نمک کھانے کا'' ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے کرانے یا دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس ''حرکت'' سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا!

کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسید کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید بردار رہا، یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں، زندگی بھر وہ انہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا۔ ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ ''کالج کا نمک کھانے'' کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں! کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا!

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے دن بہ دن تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کندن ادھ موا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ناقابلِ تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کندن کو بچایا جا سکتا تھا!

....

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے ان کی قدر،

قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں ان کو روکا جا سکتا ہے یا اُن سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج بالکل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو، کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نو وارد جو اُس سے واقف نہ ہوں گے، وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا۔ یہ اِدارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج بالکل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورت حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم ''گذشتہ سے پیوستہ'' میں گذشتہ کا ذکر خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو نہ اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلے گی!

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پُرانی ہو جاتی ہے، یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پُرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پُرانی دنیا کی یہ بات قابل فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ، اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابل لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی!

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی

شاعر ہو یا ادیب۔ ریفارمر ہو یا فلسفی۔ کوئی بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا جس میں اس نے آنکھ کھولی ہو اور نشونما پائی ہو اور پھر وہی شخص اس ماحول کی اصلاح اور اس میں انقلاب برپا کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ چکبست جن کے انتقال کو تیرہ برس کچھ مہینے ہوئے ہیں۔ پیدا تو فیض آباد میں ہوئے تھے۔ مگر انہوں نے لکھنؤ میں ہوش سنبھالا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ مختصر یہ کہ بچپن سے آخر وقت تک وہ لکھنؤ ہی میں رہے۔ اس وقت ہر دوسرے پرانے شہروں کی طرح لکھنؤ کی اخلاقی اور سماجی حالت عموماً وہی تھی جو ایک پرانی تہذیب اور تمدن کے انتزاع اور زوال کے زمانہ میں ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی حالت کا خاکہ حالی مرحوم نے اپنے مسدس میں اور سرشار مبرور نے سیر کہسار وغیرہ میں اپنے اپنے طرز پر اُتارا ہے۔

غرض کہ جس وقت چکبست نے ہوش سنبھالا وہ پرانی تہذیب اور کلچر جس کی تعمیر اور آراستگی میں اہل وطن کی صدیاں صرف ہوئیں۔ چراغ سحری سے زیادہ نہ تھیں۔ سماج، زوال کے گہرے گڑھے میں گر کر جن عیبوں اور بُرے شغلوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہی حال یہاں اکثر اہل ملک کا تھا۔ جو شغل پہلے کام کے بعد تفریح اور ستانے کے طور پر ہوا کرتے تھے۔ اب انہوں نے ادائے فرض کی جگہ لے لی تھی اور رات دن کا مشغلہ بن گئے تھے۔ قوم کے یہ مشاغل اور وطیرے چکبست کو نہ آنے تھے نہ آئے۔

خوش قسمتی سے چکبست معزز اور علم دوست خاندان میں پیدا ہوئے تھے چناں چہ ان کے والد

پنڈت اوت نرائن اچھے شاعر تھے جن کا یہ شعر یاد ہے

اللہ اللہ رے اثر نالوں کا تیرے بلبل
پردۂ خاک سے گل چاک گریباں نکلا

اس سے بڑھ کر حسن اتفاق سے ان کا خاندان ایسے فرقہ کا رکن تھا جو مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ علم وفضل اور کلچر کے لیے مشہور ہے۔ مختصر یہ کہ چکبست نے پہلے آس پاس کی خدمت کی طرف توجہ کی۔ یعنی اپنے ہم کفو کشمیری پنڈت نوجوانوں کی اصلاح وترقی کی طرف متوجہ ہوئے۔ چوں کہ عمل کا جذبہ ابھی سے ان کے دل ودماغ میں جوش مار رہا تھا۔ انہوں نے ۱۹۰۴ء میں جب کہ ان کی عمر صرف بائیس ۲۲ برس کی تھی۔ ایک انجمن کشمیری ینگ مینز ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کی۔ یہ ایسوسی ایشن بارہ برس تک کام کرتی رہی۔ بے کار مشاغل، سخت کلامی، انقطاع تعلیم اور فضول منڑگشت سے کامل پرہیز اس انجمن کے ممبر ہونے کی پہلی شرط تھی۔ مخرب اخلاق باتوں اور بُرے اشغال کے عوض اس انجمن نے معصوم تفریح کے سامان، مطالعہ اور مباحثہ کے موقعے اور تبدیل خیال کے مستحسن ذریعے مہیا کیے تھے۔ اس انجمن کی نسبت چکبست نے کہا ہے۔

محبت کے چمن میں مجمع احباب رہتا ہے
یہی جنت اسی دنیا میں ہم آباد کرتے ہیں

اس نوجوان کے ایثار، جذبۂ شوق اور جانفشانی کا اندازہ کیجیے۔ جس نے لوگوں کی خدمت میں اپنی جان گھلا دی۔ اسی انجمن کے آٹھویں سالانہ جلسہ میں چکبست نے ایک نظم پڑھی جس کا یہ بند دل میں کھبا جاتا ہے۔

قوم میں آٹھ برس سے ہے یہ گلشن شاداب
چہرۂ گل پہ یہاں پاس ادب سے ہے نقاب
میرے آئینۂ دل میں ہے فقط اس کا جواب
اس کے کانٹوں پہ کیا میں نے نثار اپنا شباب
کام شبنم کا لیا دیدۂ تر سے اپنے
میں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے

چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے داخلی رنگ کے بادشاہ تھے۔ وجہ یہ کہ خیالات اور جذبات کا جوش وخروش ان کی فطرت میں بے حد تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خارجی منظر نگاری میں بھی وہ کسی سے ہٹے نہ

تھے۔ کہنا یہ ہے کہ چکبست کا شعور اتنا وسیع، تخیل اتنا بلند اور ذہن اس قدر ہمہ گیر تھا اور وہ اتنے زبردست صاحبِ طرز تھے کہ کوئی چیز کوئی منظر ان کی حاسہ طبع سے رنگ لیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سنیئے! بہتوں کو پہاڑی سفر کے موقعے پیش آئے ہوں گے۔ اور انہوں نے کوہستانوں میں جگہ جگہ چشمے اور آبشاریں دیکھی ہوں گی۔ یہ منظر ایک خارجی موضوع ہے۔ اسی کا نقشہ کشمیر سے متعلق یوں اُتارتے ہیں۔

چپہ چپہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں سوکھی چٹانوں نے دیا پانی مجھے

وہ تلک یا گوکھلے کی رحلت پر نوحہ ہو یا شاعر کی طرحی غزل، رامائن کا ایک سین ہو یا آصف الدولہ کا امام باڑہ۔ ہر نظم میں آپ جذباتِ عالیہ کا ایک ہی تلاطم اور احساسات ولطف کا وہی ہیجان پائیں گے۔ یہ ہے ایک شاعر اور مصنف کی اصلی انفرادیت۔ فارسی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ 'بزرگی بعقل است نہ بہ سال' یعنی بزرگ وہ شخص ہے جو عقلمند ہو، نہ کہ صرف بوڑھا ہو۔ چکبست جس عمر میں ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوئے اس عمر میں اس کا تو ذکر ہی کیا کہ کوئی ادب کے اتنے شاہکار نظم اور نثر میں چھوڑ جائے۔ عموماً ادبی مذاق کی پختگی بھی مشکل سے ہوا کرتی ہے۔ لیکن مرحوم سے قدرت کو تھوڑی مدت میں بہت سے اور بہت بڑے کام لینے تھے اور اس نے وہ کام لیے۔ ایک وقت چکبستؔ کی زندگی میں جلدی سے ایسا آ گیا جس نے انہیں اس وقت کے اعلیٰ ادیبوں اور نقادوں کی صفِ اول میں لا بٹھایا۔ یہاں گلزار نسیم کے چکبستی اڈیشن سے متعلق اس مناظرے کا تفصیلی ذکر نہیں کیا جائے گا جو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ یہ کتاب کی شکل میں ''معرکۂ چکبست وشررؔ'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اعتراضوں کے جو جواب چکبست نے دیے ان کا پایہ تحقیق واستدلال میں اتنا بلند تھا کہ ان کے مخالف بھی حیران رہ گئے۔ جب یہ ادبی معرکہ ختم ہوا تو چکبست کے تعلقات شررؔ مرحوم سے ویسے ہی ہو گئے جیسے پہلے تھے۔ وجہ یہ کہ چکبستؔ کے مزاج میں جہاں راستبازی کے ساتھ غیرت اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہاں صلح پسندی اور رواداری کی بھی کمی نہ تھی۔

چکبست نہ صرف طرز کلام واسلوب کے لحاظ سے آج کل کے اکثر شاعروں سے ممتاز ہیں بلکہ اخلاق اور طبیعت کے اعتبار سے بھی۔ یہاں باہر کی دو باتیں ضرور کہنی پڑتی ہیں۔ آج کل شاعر ایک تو تخلص کے ساتھ اپنے نام کے اظہار اور اعلان سے نہایت پرہیز بلکہ نفرت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات لڑ پڑتے ہیں۔ اگر ان کے نام کی اشاعت کی جائے۔ چکبست نے سرے سے تخلص رکھا ہی نہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اکثر شاعر اپنے اُستاد کا نام ظاہر کرنے سے سخت پرہیز کرتے ہیں اس بارے میں چکبست کا طرزِ عمل اپنے ہمعصروں سے الگ تھا۔ پنڈت بشن نرائن در تخلص ابر لکھنوی کے مشورے اور صحبت سے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ انہیں کی شان میں کہا ہے

کیا زمانے میں کھلے بے خبری کا میری راز
طائرِ فکر میں پیدا تو ہو اِتنی پرواز
کیوں طبیعت کو نہ ہوئے خودی شوق پہ ناز
حضرتِ ابر کے قدموں پہ ہے یہ فرق نیاز
فخر ہے مجھ کو اسی در سے شرف پانے کا
میں شرابی ہوں اسی رند کے میخانے کا

آج ایسا شاعر کون سا ہے جو اپنے استاد کی وفات پر یوں بین کرے۔
ہم کو معلوم ہوا آج یتیمی کیا ہے۔

جیسا کہ چکبست کے کلام میں لفظوں کا گورکھ دھندا۔ تشبیہ اور استعاروں کی بھرمار اور بلند آہنگی کا نام نہیں اسی طرح ان کی پبلک زندگی ہنگام پرستی اور ہیجانی بدعنوانیوں سے پاک تھی۔ ان کے زمانے میں وطن میں بیداری اور اہل وطن میں سیاسی گرمجوشی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن وہ اعتدال پسندوں ہی کے حلقے میں رہے۔ اگر چہ وطن کی محبت اور ابنائے وطن کی خدمت کا جوش ان کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ کہا ہے۔

ہم پوجتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو
روشن دلِ ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اُجڑے ہوئے گھر میں
وطن کے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق سے نیا آفتاب نکلا ہے

وہ انہیں خیالات کو جنھیں بڑے سیاس اور مدبر سروں میں لے کر وطن کی خدمت کے لیے کمر باندھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ شاعری کا جامہ پہنا کر ایسا مفید نمونہ کلام چھوڑ گئے جو مدتوں تک یادگار رہے گا۔ آگے کہا گیا ہے کہ وہ ماڈریٹ یعنی اعتدال پسند سیاسی طبقہ کے ہم خیال تھے اور انگلستان سے قطع تعلق کے

حامی نہ تھے۔ چناں چہ کہتے ہیں۔

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

چکبست کا مذہب اور برتاؤ شعر کہنے ہی میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی ملی اور مذہبی تعصب سے آزاد تھا۔ ان کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی پڑی تھی۔ ان کی شاعری کے ابتدائی زمانے کے یہ اشعار سُنیئے۔

ہر ذرۂ خاکی ہے مرا مونس و ہمدم
دنیا جسے کہتے ہیں وہ کاشانہ ہے میرا
جس جا ہو خوشی وہ ہے مجھے منزلِ راحت
جس گھر میں ہو ماتم وہ عزاخانہ ہے میرا
جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

اگر چہ چکبست کا کلام ادبی محاسن سے مالا مال ہے لیکن انہوں نے داد لینے یا شاعر کہلانے کے لیے کبھی شعر نہیں کہا۔ جس بات کی ملک کے لیے ضرورت سمجھی اس کو شعر کا موضوع بنایا۔ شاعر کی حیثیت سے اگر وہ ایک باوقعت انفرادیت کے مالک ہیں تو ایک مصلح کی حیثیت سے ان کے کلام کی افادیت عالم گیر ہے۔ لکھنؤ جو غزل کا فریفتہ تھا وہاں نئے طرز کی نظم اور نئے خیالات کو ہر دل عزیز بنانا انہیں کا کام تھا۔ چکبست کی شاعری صرف قافیہ پیائی نہ تھی۔ یہی نہیں کہ انہوں نے آتش اور انیس کے رنگ کو تازہ کیا اور دہلی کے اس خارجی داخلیت کے طرز کی جس کی بنیاد شیفتہ اور غالب نے ڈالی اور عزیز مرحوم نے اس سے لکھنؤ کو شناسا کیا تھا، بہت ترقی دی بلکہ حالی کی پیروی میں شعر سے کام لیا۔ چکبست کی شاعری ایک پیغام لے کر آئی تھی۔ اور وہ پیغام ہے حب وطن اور مخلصانہ رواداری۔

خلوص اور دوستداری چکبست کے خمیر میں تھی۔ ادبی مباحثہ میں وہ جتنے زیادہ سخت گیر تھے اتنے ہی ہمدردی میں نرم دل۔ یہاں ایک واقعہ ذکر کے قابل ہے۔ میرا لکھنو جانا ہوا۔ اودھ پنچ کے مشہور زمانہ ایڈیٹر منشی سجاد حسین آخری بیماری میں مبتلا تھے۔ فالج گر چکا تھا اور بات کرنے میں ان کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ میں منشی صاحب کی مزاج پرسی کو گیا۔ چکبست میرے ساتھ تھے۔ خیر منشی صاحب علاج اور معالج دونوں کی ناکامی اور دوا سے بیزاری اور صحت یابی سے مایوسی کا اظہار کر چکے تھے کہ ملازم دوا لایا۔ انہوں

نے پی لی۔ میں مسکرایا مرحوم غضب کے رمز شناس تھے۔ تاڑ گئے کہ میرے تبسم کے یہ معنی ہیں کہ جب کوئی علاج فائدہ نہیں کرتا اور دوا کے اثر سے قطعی مایوسی ہے تو پھر بدذائقہ دوائیں پی کر کیوں طبیعت بے مزا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میرے تبسم کے جواب میں انہوں نے کچھ کہا۔ جو میں سمجھا نہیں۔ چکبستؔ پہلے بھی ترجمانی کر چکے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ چکبستؔ کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور آواز بھرائی۔ جب یہ لفظ گویا دم توڑتے ہوئے ان کی زبان سے نکلے۔ ''بھائی میں دوا جو پی لیتا ہوں تو ان محبت کے بادلوں کی خاطر اور اس غرض سے بھی کہ باضابطہ مروں''۔ لہجہ اتنا بگڑ گیا تھا کہ روز کے پاس بیٹھنے والوں کے سوا ان کی بات سمجھنا مشکل تھا۔

چکبستؔ کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پھر دوستوں کی تکلیف پر ان کی ہمدردی اور رنج کا توذکر ہی کیا ہے۔

شاعر اور وہ لوگ جو ادب اور زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اپنے طرزِ عمل میں قومی اور مذہبی تعصب سے کتنے ہی دُور کیوں نہ ہوں مقامی تعصب یا عصبیت سے شاذ و نادر ہی آزاد ہوا کرتے ہیں۔ چکبست میں یہ وصف تھا۔ یہ کہنا سراسر صحیح ہے کہ ان کی ادبی تنقیدیں مقامی تعصب یا جانب داری سے مبرا ہیں۔ فصیح الملک داغؔ دہلوی کی شاعری پر ایک پر مغز تنقید لکھتے ہوئے کہا ہے ''داغ کے کلام کی تاثیر اس امر کی شاہد ہے کہ اس کے قدرتی شاعر ہونے میں کلام نہیں۔'' اسی تبصرے میں ہر پہلو سے بحث کرنے کے بعد حضرت امیرؔ مینائی اور حضرت داغؔ کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''داغؔ کے سینے میں شاعری کی آگ روشن ہے۔ لہٰذا اس کا کلام گرمیٔ تاثیر سے مالا مال ہے۔'' امیر کا کلام اس کیفیت سے خالی ہے۔ ان کی شاعری مصنوعی شاعری ہے۔ وہ اصل جوہر شاعری جو قدرتی شاعر اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ امیر کی طبیعت کا حصہ نہیں۔''

چکبستؔ کا تخیل جتنا بلند تھا اتنی ہی ان کی نظر وسیع تھی۔ سماج کی حالت اور اجتماعی اخلاق پر کیوں کر ان کی نگاہ نہ پڑتی۔ یہ نہیں کہ وہ مغرب کی تہذیب اور کلچر کے دشمن تھے بلکہ ان کا مسلک '' خذ ما صفا و داع ما کدر'' تھا۔ یعنی یورپ والوں کی ظاہری فضولیات کی نقل نہ کرنی چاہیے بلکہ ان کے اخلاق سے وہ خوبیاں سیکھنی چاہئیں جنھوں نے دُنیا میں کامیابی کی کنجی انہیں سونپی ہے۔ کہا ہے

ان کو تہذیب سے یورپ کی نہیں کچھ سروکار
ظاہری شان و نمائش پہ دل و جاں ہے نثار

ہیں وہ سینہ میں نہاں غیرت قومی کے شرار
جن سے مغرب میں ہوئے خاک کے پتلے بیدار
سیرِ یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہو و لعب سیکھا ہے

انسان کے ضمیر کی پوری کیفیت اور مزاج کا اصلی رجحان جیسا اس کی نج کی خط وکتابت سے ظاہر ہوتا ہے جو بے تکلف دوستوں کے ساتھ ہو ویسا اس کی تصنیف وتالیف سے نہیں۔ یہاں چکبستؔ کے ایک خط کا کچھ حصہ سنایا جاتا ہے جو ان کے کیرکٹر پر کیا ان کے کلام پر تیز روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ وہ بڑے زندہ دل تھے اور ان کا مزاج کتنا نازک اور نمکین تھا۔ یہ خط انہوں نے لکھنو سے گونڈہ کے راستے بہرائچ کے سفر اور وہاں کے قیام سے متعلق ایک دوست کو لکھا تھا۔ میزبان اور ہمراہی بھی بے تکلف دوست تھے۔ لکھتے ہیں۔ ''بہرائچ کا سفر بہت اچھا رہا۔ ٹوپا صاحب ہمراہ تھے۔ راستہ میں پرس جاتا رہا۔ دوآنے جیب میں رہ گئے گاڑی میں بیٹھے تو اس قدر کشاکش تھی کہ الامان۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر چڑی مار نخاس میں چڑیاں بیچنے جاتے ہیں تو ایک پنجرے میں تلے اوپر بیس پچیس جانور بھر لیتے ہیں۔ یہی کیفیت ہمارے درجے کی تھی۔ قلی دوآنے مانگتا ہے۔ ہم ایک آنہ دیتے ہیں اور اس سے وعدہ کرتے ہیں کہ جب لوٹ کر آئیں گے بقیہ ایک آنہ دے دیں گے۔ وہ ہماری پوشاک دیکھ کر ہماری مفلسی کا یقین نہیں کرتا۔ مسافر ہماری صورت دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ ایک آنہ اس لیے بچالیا کہ گونڈہ کے اسٹیشن پر خود اسباب نہ اُٹھانا پڑے۔ دقیانوسی خیال کے ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر دشاشول سامنے ہو تو سفر نہ کرنا چاہیے۔ میرے ساتھ تو ٹوپا صاحب کی صورت میں دشاشول ساتھ ہی تھا۔ بہرحال راستہ باتوں میں اور اونگھتے کٹ گیا۔ گاڑی کی چال ایسی کہ سبحان اللہ۔ بس آتش کا یہ شعر یاد آتا تھا

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

صبح تڑکے بہرائچ پہنچے۔ مکان کا دروازہ بند تھا۔ میں نے باہر سے آواز دی کہ تار آیا ہے۔ آدمی نے گھبرا کر دروازہ کھولا۔ اندر پہنچے تو دیکھا پنڈت صاحب اسٹیشن جانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے چوڑی دار پاجامہ سوکھی پنڈلیوں پر چڑھا رہے ہیں۔ اس امید پر کہ بہرائچ کی گاڑی ہمیشہ دیر سے آتی ہے، آپ دیر سے بستر سے اٹھے۔ مگر مکان دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ نیا بنا ہوا ہے اور بہت اچھا

ہے۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ اچھا مکان اچھی بیوی اور اچھا خدمتگار تقدیر سے ملتا ہے۔ ترلوکی ناتھ دو صورتوں میں ضرور خوش نصیب ہیں۔ مگر دیہاتی نوکر بالکل بیوقوف ہیں ترلوکی ناتھ کی بیوی بالکل تندرست نہ تھی۔ مگر جس سرگرمی اور اخلاق سے مہمان نوازی کا حق ادا کیا قابل تعریف ہے۔ کشمیری خاندانوں میں جو پُرانا طریقہ مہمان نوازی کا تھا اس کا نقشہ نظر آتا تھا۔ میں نے پرانا طریقہ اس لیے کہا کہ نئی تراش کی لڑکیاں اپنی نزاکت ہی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی ہیں۔ وہ دوسروں کی خاطر کیا کریں گی۔ ترلوکی ناتھ کا ذکر فضول ہے۔ ٹوپا کی سندھیا کے لیے پنجانہ کے مقابلے میں ایک کمرہ تجویز کر دیا گیا تھا، وہیں بیٹھ کر پوجا کرتے تھے۔ جوتے کی سیاہی کی ڈبیا میں رُدراج کے دانے سامنے رکھ کر بیٹھتے تھے۔ اور سندھیا کرنے کے بعد انڈے کا آچمن ہوتا تھا۔ میں تو ان کے تقدس کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید یہیں سے سیدھے بہشت کو نہ چلے جائیں۔ کھانا پرتکلف دونوں وقت تیار ہوتا اور یہ خوب ڈٹ کر کھالیا کرتے تھے، یہ سنا ہے کہ اگر کسی شخص کی کوئی جسمانی قوت کم ہو جاتی ہے تو اس کا نعم البدل مل جاتا ہے۔ مثلاً اندھوں کی آہٹ پانے کی حس معمول سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اسی اصول پر ٹوپا صاحب کے دل اور پھیپھڑے کی قوت معدہ میں منتقل ہو گئی ہے۔ بیحد کھاتے ہیں اور ہضم کرتے ہیں۔ اگر خون کے بدلے بلغم نہ بنے تو مجھ سے زیادہ تیار ہو جائیں۔''

اپنے سیاسی اصول اور ادبی مذاق کی اشاعت کی غرض سے ایک باوقعت رسالے میں چکبست کا بڑا حصہ تھا جو برسوں بہت آب وتاب سے نکلتا رہا اس کا نام ''صبح امید'' تھا۔ قصہ مختصر چکبست کا یہ شعر حقیقت میں ان کے حسب حال ہے۔

قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

ادبی دنیا کو ہمیشہ ماتم رہے گا کہ ادب اور شاعری کا یہ روشن ستارہ جس کی ضیاء سے کل ملک منور تھا وقت سے پہلے غروب ہو گیا۔ چکبست کی پیدائش ۱۸۸۲ء اور وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ کل تینتالیس برس کی عمر پائی۔ حضرت محشر لکھنوی نے مرحوم ہی کے مشہور شعر کے ایک مصرع سے تاریخ نکالی

ان کے ہی مصرعہ سے تاریخ ہے ہمراہِ عزا
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

جے نندر کمار

منشی پریم چند

پریم چند کی کچھ باتیں کرنے میں آج آپ کے سامنے ہوں۔ اس بات پر جی میں کچھ بے چینی ہوتی ہے۔ آج وہ ہمارے بیچ نہیں ہیں۔ اور کبھی وہ دن تھے کہ ہم لوگ پاس بیٹھ کر چرچا کیا کرتے تھے اور ان کی ہنسی کا قہقہہ کسی وقت بھی سُنا جا سکتا تھا۔ پر اس بات پر آج اٹک کر بھی تو نہیں رہا جا سکتا ہے۔ دنیا میں کون سدا بیٹھا رہتا ہے۔ اور کون بیٹھا رہے گا۔ آدمی آتے ہیں اور جوان کے ذمہ کام ہوتا ہے کرتے ہوئے پردے کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ پر پریم چند اس انجان پردے کے پیچھے ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ یاد سے دُور کر لینا انہیں ممکن نہیں ہے۔ زندگی ان کی اوسط سے زیادہ نہیں رہی۔ کل چھپن (۵۶) برس اس دنیا میں جیئے۔ کہیں یہ برس روشنی کے برس تھے۔ اور ان کی زندگی سچی محنت ایمانداری اور سادگی کی زندگی تھی۔

یہ تو آپ اور ہم جانتے ہی ہیں کہ ہندستان میں ہندی اور اردو بھاشائیں جب تک ہیں پریم چند کا نام مٹ نہیں سکتا۔ وہ دُھندلا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ دونوں زبانوں کو پاس لانے میں اور ان دونوں کو گھڑنے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔ ان کے خیالات ہندوستان کی زندگی میں گھل مل گئے ہیں۔ اور وہ ہماری تاریخ کا جزو بن گئے ہیں۔ اُن کی کہانیاں گھر گھر پھیلی ہیں ان کی کتابوں کے ورق لوگوں کے دلوں میں بس گئے ہیں۔

لیکن اس سچائی کا بانی کون تھا۔ یہ بہت لوگوں کو معلوم ہوگا۔ کیا چیز تھی جو پریم چند کی تحریروں کو اس

قدر عمدہ بنا دیتی تھی یہ جاننے کے لیے ذرا پیچھے جا کر دیکھنا چاہیئے۔ان کی ہنسی تو مشہور ہی ہے۔زندگی میں میں نے کھلے گلے کا ویسا قہقہہ اور کہیں نہیں سنا۔گویا جس من سے ہنسی کا وہ فوارہ نکلتا تھا اس میں کسی طرح کا کینہ اور میل تو رہ ہی نہیں سکتا۔

اُن پر چوٹیں بھی کم نہیں پڑیں۔سب ہی طرح کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔پھر بھی ان کی ہنسی دھیمی یا پھیکی نہیں ہوئی۔یا تو وہ سب باتوں میں ایک طرح کی علیحدگی کے بہاؤ سے الگ کر کے دیکھ سکتے تھے۔ اس خوبی کی قیمت سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے بچپن کے زمانہ کو بھی کچھ دیکھنا چاہیے۔

چھٹپن کی بات ہے کہ ماں گذر چکی تھی پتا کا بھی پندرھویں برس انتقال ہو گیا تھا۔گھر میں دوسری ماں تھی اور بھائی تھے اور بہن تھی۔گھر میں کئی تن پالنے کو تھے۔پر آمدنی پیسے کی نہ تھی۔ادھر بالک پریم چند کے من میں ایم۔اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔بیاہ بھی چھٹپن میں ہو گیا تھا۔وہی لکھتے ہیں پاؤں میں جوتے نہ تھے۔بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے۔اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔کوئنز کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔فیس معاف ہو گئی تھی۔امتحان سر پر اور میں بانس کے پھاٹک ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔جاڑے کا موسم تھا۔چار بجے شام کو پہنچ جاتا۔چھ بجے چھٹی پاتا۔وہاں سے میرا گھر پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہنچتا۔

اپنی آپ بیتی کہانی جو انہوں نے لکھی ہے اس سے ان کے شروع کے جیون کے دن آنکھوں کے آگے آ جاتے ہیں۔ماں کم عمری میں ہی انہیں چھوڑ کر چل بسیں۔پندرہ سال کی عمر میں پتا بھی چھوڑ گئے۔ شادی چھٹپن ہی میں ہو چکی تھی گھر میں کئی آدمی تھے۔پر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی۔ادھر بالک پریم چند کے من میں پڑھائی کی چڑھائی چڑھنے کے حوصلے تھے۔گاؤں سے روزانہ دس میل چل کر پڑھنے پہنچتے۔ گذارے کے لیے تین اور پانچ روپے کے ٹیوشن پائے۔میٹرک جوں توں پاس ہوا اب آگے کے لیے کوششیں کیں۔سفارش بھی پہنچائی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔داخلہ ہو گیا تو حساب انہیں لے ڈوبتا رہا۔ سالہا سال ریاضی کے مضمون کی وجہ سے وہ فیل ہوتے رہے۔آخر دس بارہ سال بعد جب ریاضی اختیاری مضمون ہوا تب بڑی آسانی سے انہوں نے وہ امتحان پاس کر لیا۔پڑھائی کے دنوں میں کتنے دن انہیں بھنے چنوں پر رہنا پڑا اور کتنے دن ایک دم بن کھائے گذرے اس کا شمار ہی نہیں۔آخر ایک دن پاس کھانے کو کوڑی نہ بچی تھی تب دو برس سے بڑے پیار کے ساتھ سنبھال کر رکھی ہوئی ایک کتاب دوکان پر بیچنے پہنچے۔دو روپے کی کتاب کا ایک میں سودا ہوا۔روپیہ لے کر دکان سے اُتر رہے تھے۔کہ ایک شخص نے

پوچھا ''کیا پڑھتے ہو؟'' ''نہیں مگر پڑھنے کو دل چاہتا ہے''۔''میٹرک پاس ہو؟'' ''جی ہاں'' ''نوکری تو نہیں چاہتے؟'' ''نوکری کہیں ملتی ہی نہیں''۔ انہی بھلی مانس نے انہیں ملازمت دی تو شروع میں اٹھارہ روپے تنخواہ ہوئی۔ یہیں سے ان کی زندگی کا شروع سمجھنا چاہیے۔

میری پہلی ملاقات ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ بنارس سے لوٹ رہا تھا۔ بنارس میں ان کا خط مل گیا تھا کہ ٹھیک کس جگہ ان کا مکان ہے آنے کی اطلاع نہ دے سکا تھا۔ سیدھا وہاں پہنچا۔ پہلے کبھی انہیں دیکھا نہ تھا۔ تھوڑی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ اسی بھروسہ میں لکھنؤ ان کے گھر جا دھمکا، میں انجان وہ مشہور مصنف۔ مجھے قلم پکڑنے کا شعور نہ سیکھنے کا تھا۔ ان کے قلم کی دھاک تھی۔ لیکن انہوں نے خط ایسا بھیجا تھا کہ گویا دونوں ہاتھ پھیلا کر وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ سورج ابھی نکلا بھی نہ تھا کہ میں نے زینہ پر پہنچ کر آوازیں دیں۔ زینہ کھلا۔ اور ایک شخص ایسے نظر آئے جیسے نیند سے ابھی اٹھے ہوں۔ خمار آنکھوں میں ابھی باقی تھا۔ موچھیں بڑی بڑی تھیں۔ قد کچھ پستہ۔ ماتھا اُٹھا ہوا تھا۔ پر اس وقت بالوں نے آ کر اسے ڈھک لیا تھا اور یہ سب ملا کر سر کچھ چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔ لال املی کی اُونی چادر ایک کندھے پر لیے تھے۔ جو یوں بھی بہت صاف نہ تھی۔ رانوں میں دھوتی کافی اونچی بندھی ہوئی تھی۔ خیال پڑتا ہے کہ بدن پر نیم آستین ایک مرزئی تھی سچ پوچھئے تو میں اس کے لیے تیار نہ تھا کہ یہ شخص پریم چند ہوں گے۔ یہ گمان نہ ہو سکتا تھا۔ پر وہی تھے پریم چند۔

بولے کون صاحب ہیں۔

میں نے کہا نندر

اتنا کہنے کے بعد تو جیسے میں خالی ہی نہ چھوڑا گیا۔ زینہ کے پاس دالان میں پانی پھیلا تھا۔ اور کمرے کے اندر ایک میلی کچیلی میز تھی۔ لیکن پریم چند مجھ کو لے کر ایسے بیٹھ گئے کہ میں کسی چیز کے لیے بول ہی نہ سکا۔ اسی طرح کوئی نو بج گئے۔ اتنے میں اندر سے کہلایا گیا کہ آج دوا آئے گی کہ نہیں۔ پریم چند سن کر چونکے۔ بولے۔ جے نندر۔ یہ لو ہمیں تو وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔ تم منہ ہاتھ دھوؤ۔ اتنے میں دوا لے آتا ہوں اور اتنے میں میں کیا دیکھتا ہوں کہ پریم چند طاق سے شیشی اُٹھا اُنہیں کپڑوں اور اسی سلیپر میں کھٹ کھٹ زینہ سے اتر کر دوا لینے چل دیے۔ آتے ہی جو ایک ڈیڑھ گھنٹے ان سے باتیں ہوئیں تب میں دیکھ سکا کہ پریم چند اپنے خیالات کی دنیا میں کتنے جگے ہوئے رہتے ہیں۔ پچھم میں کیا لکھا اور سوچا جا رہا ہے۔ اس کا انہیں پورا علم تھا۔ اور وہ علم صحیح تھا۔ ان سب باتوں کے بارے میں ان کی رائے اپنی ہی تھی۔

دوسروں کی نہیں۔ کھلی آنکھوں اور کھلی عقل سے چیزوں کو دیکھتے پرکھتے تھے لیکن آپس کے برتاؤ میں اتنے جاگے ہوئے تھے یہ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر اس کی انہیں پرواہ نہ تھی۔

خیر لوٹ کر آئے۔ ناشتہ کیا۔ گپ شپ کی۔ کھانا کھایا۔ اور بولے چلو دفتر چلیں۔ راہ میں جو پہلا یکہ ملا۔ اس سے پوچھا کیوں دوست چلتے ہو۔

یکے والے نے کیا جواب دیا مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ لیکن اس نے جتنے پیسے بتلائے اس میں کچھ کمی انہوں نے اپنی طرف سے نہیں کی۔ نہ یہ دیکھا کہ وہ بڑھیا چمکیلا ہے کہ نہیں۔ یکے میں بیٹھے بیٹھے یکے والے بوڑھے مسلمان سے دو ایک ہی باتوں میں انہوں نے ایک طرح کی برابری پیدا کر لی اور اسے اپنا بنالیا۔

دفتر پہنچ کر بولے۔ چلو جے نندر ایک دوست ہے۔ انہیں تمہارا ہاتھ دکھائیں۔ میں نے کہا۔ ہاتھ کیوں۔ بولے بھائی وہ اس ہنر کے استاد ہیں۔ دیکھو تو جانو گے آخر ہاتھ دکھایا گیا۔ اور لوٹتے وقت پوچھنے لگے کہو جے نندر کیا رائے ہے۔

میں نے کہا۔ مجھے اس علم پر یقین نہیں ہے۔ اور نہ مستقبل میں اپنے سے کچھ امید ہے۔ یہ جواب پریم چند کو پسند نہ آیا وہ دوسرے کی شخصیت کو کم کر کے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں نا اُمید ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

سویرے کا آیا ہوا جب میں اسی شام پریم چند کے گھر سے لوٹ کر چلنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ نہ جانے کب سے کسی بھائی سے بچھڑ رہا ہوں۔ انہوں نے اپنے میرے درمیان کوئی فرق مجھے محسوس نہیں ہونے دیا۔ بولے جے نندر جا رہے ہو۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ کہنے لگے میں یہ نہ جانتا تھا ایسا تھا تو آئے ہی کیوں۔ میں نے پھر کبھی جلدی آنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہوگیا۔ اس طرح پہلی ہی دفعہ مجھے پریم چند سے محبت ہوگئی۔ کہ وہ کچھ بھی اور ہوں چاہے نہ ہوں لیکن اندر تک کھرے آدمی ہیں اور دل ان کا صحیح ہے اور ثابت ہے۔

اس کے بعد تو خط و کتابت کافی ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ بڑے بننے کے پیچھے نہیں ہیں۔ سچا نیناان کا مقصد ہے۔ اپنے کو سدا معمولی ہی آدمی گنتے ہیں۔ میں نے کہا آپ کو کیوں یہ معلوم نہیں کہ باہر آپ کی کتنی شہرت ہے۔

بولے۔ اس شہرت کا مستحق کوئی اور ہی ہوگا۔ سچ جانو میں تو مزدور ہوں لکھتے وقت مجھے ہر گھڑی یہ

محسوس ہوتا ہے۔ پہلی بار دہلی آئے اس کی کہانی دلچسپ ہے۔ میں نے ناگہانی ایک کارڈ میں انہیں لکھا کہ یہ یہ لوگ گھر آئے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ بھی یہاں ہوتے تو بڑی رونق رہتی۔ اس اپنے خط کا انتظار مجھے اس اپنے خط کے انتظار میں تھا، دیکھا کہ تیسرے روز سویرے ہی سویرے پریم چند کندھے پر کمبل لٹکائے گلی میں سے چلے آرہے ہیں میں اچنبھے میں رہ گیا۔ بولا یہ کیا۔ تار نہ خط ایسے کہاں سے چلے آرہے ہیں۔ بولے کل دوپہر بعد تمہارا خط ملا۔ وقت تھا ہی۔ گاڑی مل سکتی تھی اسی لیے چلا آرہا ہوں۔ میں نے کہا تار تو دے دیا ہوتا۔ بولے دیکھا، تمہارا گھر مل گیا کہ نہیں۔ تار میں ناحق پیسے کیوں خراب کرتا۔

معلوم ہوا کہ دلّی آنے کا زندگی میں ان کے لیے یہ پہلا موقع ہے۔ اس ذہانت پر میں حیرت میں رہ گیا۔ پانچ چھ روز یہاں رہے۔ ان دنوں کافی دلچسپی رہی۔ کئی پارٹیاں دی گئیں اور برابر لوگ ان کو پوچھتے اور گھیرتے رہے۔ میں من میں سمجھا تھا کہ چلو اس سے ان کی طبیعت بہلی رہی ہوگی۔ لیکن بات الٹی تھی چلنے لگے تو بولے جےنندر یہ کیا تماشہ بناڈالا ہے۔

میں نے کہا کیوں لوگوں کا آپ پر حق نہیں ہے۔ بولے۔ میں یہاں عزت پاتا رہوں اور گھر والے؟ اسی سلسلہ میں معلوم ہوا کہ زندگی میں دلّی میں بیتنے والے یہ پہلے ہوش کے چار پانچ دن ہیں کہ جب انہوں نے سویرے کام نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد یہاں ایک لٹریری کانفرنس میں صدر بنا کر پریم چند کو ہم نے بُلایا۔ لیکن وہ آنے کو راضی ہی نہ ہوئے۔ خط لکھا۔ تار دیئے۔ لیکن انہوں نے لکھا تم بلاؤ تو آجاؤں۔ لیکن کانفرنس کی تہمت کیوں لیتے ہو۔ آخر رضامندی دی ہے تو تار میں لکھا۔ reaching with protest.

ان سب چیزوں سے میں نے دیکھا کہ انہیں دل کی تلاش ہے جہاں پریم ہو وہاں وہ بے دام حاضر ہو سکتے ہیں۔ مگر ویسے نہیں۔ دنیا کی شان وشوکت ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے۔ بڑے بڑے جلسوں اور مجمعوں میں بےلاگ اور بےلوث خیال سے میں نے انہیں گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ گویا وہ دھوم دھام کے نہیں ہیں۔ کسی اور ہی گہری سچائی کے خواہاں ہیں۔

ایک بات پر اکثر ان کے ساتھ بات چیت ہوگئی ہے اور وہ ہے ایشور اور دھرم۔ وہ ایشور کے وجود کے قائل نہیں ہوتے تھے۔ کیوں کہ دیکھتے تھے کہ ایشور اور دھرم اچھے سے زیادہ بُرے کام میں لائے جاتے تھے۔

پوچھتے دنیا میں زور ہے، ظلم ہے۔ لوگ ستائے جاتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں، چاروں طرف تو

دُکھ کی چیخ پکار ہے۔ تم اس ایشور کو مانو گے جو اس سب کی اجازت دیتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایسے وقت ان کی قوت گویائی کم ہوگئی ہے اور آنکھوں میں چمک آ گئی ہے یا تو دنیا کی دکھ کی چیخ اس وقت بھی ان کے کانوں کے اندر پڑ رہی ہے اور وہ انہیں چین نہ لینے دینا چاہتی ہے۔ میں کہتا کہ مجھے ایشور کے وشواس سے بچنے کی راہ مل جائے تو میں خود بچ نکلنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے کہ دکھیوں کے دکھ کی طرف سے دل کو کڑا کر کے تم ایشور میں بند ہونا چاہتے ہو یہی تو؟ میں کہتا ہوں، ہاں یہی۔ دل کو اور دوسرا کون سا سہارا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس بیان سے ان میں گرمی آ گئی اور اپنے کو بہت زیادہ کوسنے کو تیار ہو گئے ہیں کہ کیوں دُکھیوں کے دُکھ درد میں وہ پوری طرح گھل مل نہیں سکتے۔ وہ مصیبت زدوں کی حالت دیکھ کر خدا کے منکر ہو جاتے تھے۔ لیکن میں سدا یہ مانتا آیا ہوں کہ دین اور دکھی لوگوں کی حمایت کرنا اور ان کے درد کو اپنا بنا لینے سے ان کو دلی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اور اس لحاظ سے پریم چند سچے معنی میں رحم دل اور مذہبی آدمی تھے۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ کلکتہ سے لوٹا تھا پریم چند کھاٹ پر پڑے تھے۔ بیمار تھے اور وہ موت کی بیماری ثابت ہونے والی تھی۔ جسم زرد ہو گیا تھا ہڈیوں کے سوا اس تن میں کیا باقی رہ گیا تھا۔ اُسی دن کی تصویر ہے جو جہاں تہاں اخباروں میں چھپی ہے۔ پیٹ کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ کسی کروٹ چین نہ تھا۔

لیکن دیکھتا ہوں کہ آنکھوں میں ان کی اب بھی میٹھے سپنے بھرے ہیں اور چہرے پر بشاشت ہے۔ ان کے دل میں نہ کوئی شکایت ہے اور نہ کوئی میل ہے۔

بیماری کے وقت شدت مرض میں تقدیر سے ہر کوئی ناراض ہو جاتا ہے اور طبیعت چڑ چڑی ہو جاتی ہے۔ لیکن کھاٹ پر پڑے پڑے پریم چند کو اس دن بھی اپنی حالت کی فکر نہیں تھی۔ انہیں یہ فکر تھی کہ ہم کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہے۔

بولے جے نندر دُکھ میں ایشور ملا کرتے ہیں لیکن مجھے اب بھی اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے آخر تک ایشور کو تکلیف نہیں دوں گا۔

آج بھی اس حالت کو یاد کر کے میں تعجب کرتا ہوں کہ وہ کیا طاقت تھی جو موت کے سر پر آ جھولنے پر بھی پریم چند کو پرسکون بنائے رکھتی تھی۔ ان کی ساری نگاہیں میری نگاہ کے پیچھے رہ جاتی ہیں اور بیمار پریم چند کی وہ مطمئن آنکھیں میری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ دو ایک بار موقع آیا ہے کہ میں نے ان کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے ہیں۔ ایک کتاب کا ذکر کرتے ہوئے وہ زار و قطار رو پڑے۔ وہ اپنے کو قابو میں نہیں رکھ سکے اور جس دُکھیا کے درد پر ان کا جی اس طرح مٹ کر رو دیا تھا وہ ایک معمولی بازاری

عورت تھی۔ ایک رُوسی ناول کا وہ ایک کیرکٹر تھی۔ پریم چند کا دل اس کی تکلیف پر بے بس طور پر اس طرح بھر آیا تھا کہ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن وہی نرم دل اپنے دکھ درد پر تو بلتا بھی نہ تھا۔ زندگی میں مصیبت ان پر کم نہیں پڑی۔ کیا مصیبتیں انہوں نے نہیں جھیلیں لیکن ان کا دل مضبوط رہا۔ وہی دل دوسروں کی مصیبت دیکھ کر فوراً پگھل جاتا تھا۔

پھر تو آخری درشن ہی مجھے ملے۔ سویرے سات بجے کے قرب ان کو بے ہوشی آ جانے والی تھی اور اس کے پیچھے ہی پیچھے موت بھی۔ اسی رات دوڈھائی بجے تک میں ان کے پلنگ کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کر سکتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر انہیں سانس لینا ہوتا تھا۔ کایا ان کی سفید پڑ گئی تھی۔ ہاتھ اور پیروں میں سوجن تھی پھر بھی تھوڑی بہت من کی بات مجھ تک پہنچا ہی سکتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ اس وقت جو بات ان کے دل میں تھی وہ اپنی حالت کی نہیں تھی۔ جس کے لیے جئے اسی لٹریچر کی اونچائی اور بھلائی کی طرف تب بھی ان کی نگاہ تھی۔ وہی ایک ان کی لگن تھی۔

پریم چند کی شخصیت کے بارے میں میں کوئی اندازہ نہیں دینا چاہتا ہوں۔ وہ کام دوسروں کا ہے۔ ان کی زندگی کی بہت سی باتیں مجھے یاد آتی ہیں۔ ایک لمبا عرصہ ان کے ساتھ رہ سہہ کر میرا بیتا ہے۔ ان کی یاد پر کچھ جی بھر آتا ہے اور دل بھاری ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں ان سے بڑی بڑی ہستیاں ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے بیچ پریم چند کو کہاں رکھنا ہوگا۔ یہ مورخ جانے میرا اس سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ پریم چند کی زندگی بھی ایک لگن کا نمونہ تھی۔ اور وہ آدھی زندگی نہیں تھی اس میں ہم سب کے سیکھنے کے لیے بہت کچھ سبق مل سکتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

مولانا مُحمد علی

نومبر کا مہینہ اور شروع کی تاریخیں ۱۹۲۶ء۔ ایک خوشگوار شام کو لکھنؤ میل کانپور سے چھوٹنے کے قریب ہے کہ دو شخص ندوہ کے سالانہ اجلاس سے بھاگم بھاگ موٹر پر اسٹیشن پہنچتے ہیں۔ اور جھٹ ٹکٹ لے لوا اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیر وں کی مدد سے پھینک پھانک ایک درجہ میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی کے پہلے ہی سے بیٹھے چلے آتے ہیں۔ دونوں نو وارد کھدر پوش عبا پوش۔ ایک وجیہہ خوش قطع۔ دوسرا کریہ بدقوارہ۔ دونوں ڈاڑھی باز۔ ان نو واردوں کو انگریز دیکھ کر کچھ ہنسے کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں کہ یہ سمجھے ہوں کہ بلاٹکٹ گھس آئے ہیں۔ خوش قطع نو وارد اسی برتھ پر بیٹھ گیا جن پر صاحب بہادر جمے ہوئے تھے۔ دوسرے نے مقابل کی نشست اختیار کی۔ گاڑی چلی۔ گنگا کا پل بات کہتے آ گیا۔ صاحب بہادر دونوں کی طرف دیکھ چھیڑ کی مسکراہٹ سے ہنسے اور منہ بنا کر بولے "This is mother ganses." (یہی گنگا مائی ہے۔) طنز اور زور لفظ mother پر تھا۔ پاس کے کھدر پوش نے معاً چاء کی پیالی منہ سے ہٹا انگریزی زبان اور انگریز کے لہجہ میں جواب دیا۔ یہ مائی اور موسی اور خالہ کیا معنی! اچھا آپ یہ رشتہ لیتے ہیں۔ میں تو جانتا تھا کہ دریا بس دریا ہے۔ صاحب یہ تڑاق سے جواب پا سناٹے میں آ گئے۔ یہ برجستہ جواب دینے والا تھا محمد علی اور اس کا ساتھی یا ''تابع مہمل'' آپ کا یہ خادم۔ صاحب کو یہ گمان نہ تھا۔ یہ چہرہ پر ڈاڑھی اور سر پر پٹھے رکھا کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا۔ چہ جائے کہ انگریزی میں جواب دے سکے اور دیا بھی شستہ اور برجستہ! چپ سادھ کر رہ گئے۔ اس کے بعد

ادھر سے منہ پھیر گفتگو اپنے پرانے رفیق سفر سے شروع کی۔ ولایت سے کرکٹ کی مشہور ومعروف ٹیم ''ایم۔سی۔سی'' نئی نئی ہندوستان آئی ہی تھی۔ موضوع گفتگو میں ٹیم تھی۔ اوراس کے کھیل اور مختلف میچ، محمد علی تھوڑی دیر تو چپ ہنستے رہے اس کے بعد نہ رہا گیا۔ بولے دخل در معقولات معاف۔ کھلاڑیوں پر آپ جورائے زنی کررہے ہیں صحیح نہیں ہے۔ فلاں کھلاڑی میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی۔ اور لگے اس کی تفصیل بیان کرنے اور صاحب تھے کہ بھوچکے بنے ایک ملانما انسان کی زبان سے یہ ماہرانہ معلومات سُن رہے تھے۔ محمد علی اب نفس کرکٹ پر آ گئے اور لگے انگلستانی کرکٹ کی تاریخ بیان کرنے۔ لندن میں اور آکسفورڈ میں فلاں سنہ میں بولنگ کے یہ طریقے رائج تھے گیند کی پچ یوں پڑتی تھی، بیٹنگ یوں کی جاتی تھی، فلاں زمانہ میں یہ تبدیلیاں ہوئیں، ہندوستان اور انگلستان دونوں کی زمینوں میں یہ فرق ہے وغیرہ وغیرہ۔ بولنے والا اب گفتگو نہیں کررہا تھا گویا کرکٹ پر انسائیکلو پیڈیا کا آرٹیکل سنا رہا تھا۔ آخر میں صاحب بولے۔ آپ کو کرکٹ کے متعلق بڑی معلومات ہیں۔ محمد علی نے کہا مجھی کو نہیں بلکہ ہر علی گڈھی کو ایسی ہی معلومات ہوتی ہیں۔ وہ بولا کیا آپ علی گڈھ میں کپتان رہ چکے ہیں۔ یہ بولے میں نہیں تھا۔ بڑے بھائی big brother تھے شوکت صاحب کے لیے یہ big brother کی تلمیح محمد علی ہی نے اپنے کانگرس کے خطبۂ صدارت کے وقت سے چلا دی تھی۔ وہ انگریز اس پر بے ساختہ بولا you talk like Mohd Ali. یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں۔ یہ بولے I am Ali زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں۔'' صاحب بہادر کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی آنکھیں پھاڑ کر بولے Really one of the two Ali Brother یعنی وہی محمد علی جو علی برادران ہیں۔ انہوں نے جھک کر جواب دیا Yes the younger and the more sharp-tongued of the two. جی ہاں انہیں میں سے چھوٹا اور زیادہ تیز زبان بھائی۔ صاحب کو اپنی حیرت کے رفع کرنے میں اب کی دیر سیکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی۔ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ اور نظر محمد علی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھی۔ محمد علی نے اب ہنسنا اور لطف لینا شروع کیا۔ بولے اِتنا گھبرایئے نہیں کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ علی برادران جس انگریز کو دیکھ پاتے ہیں اس پر جست کر بیٹھتے ہیں۔ دیکھ لیجیے نا میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔ حملہ کا خیال ہی دل میں نہ لایئے۔ ایک مشہور انگریزی روزنامہ اس وقت علی برادران کا شدید مخالف تھا۔ صاحب نے اس کا تازہ پرچہ آگے بڑھایا محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں، البتہ اس کے ایڈیٹر پر خوب خوب فقرے کسے۔ داستان خاصی طویل ہوگئی۔ اور ایک ہی قصہ کو۔۔۔ کہاں تک سنے جایئے گا۔

ایک بار محمد علی انگلستان میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ وقت کل پانچ منٹ کا ملا۔ انہوں نے تمہید یوں اٹھائی، کہ میں چھ ہزار میل کے فاصلہ سے تیس کروڑ آبادی کی نمائندگی کرنے آیا ہوں۔ اب آپ خود حساب لگایئے کہ ایک ایک منٹ نہیں ایک ایک سیکنڈ بلکہ ہر سیکنڈ کی کسر میں مجھے کتنی ترجمانی کا وقت ملتا ہے۔ حاضرین لوٹ گئے اور آوازیں آنے لگیں کہ آپ کہے جایئے نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا پانچ منٹ کی جگہ پورے بیس منٹ تک بولے۔

ایک اور منظر اسی سفر میں لندن میں کسی جگہ مولانا تقریر میں بیان یہ کر رہے تھے کہ برلن اور سمرنا تو چاہے حضور چھوڑ ہی دیں۔ قسطنطنیہ کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جس سے ہماری تمام قدیم ملی روایات وابستہ ہیں۔ جلسہ مخالفین سے بھرا ہوا تھا۔ انہیں میں سے ایک تاریخ کے فاضل نے کھٹ سے سوال کر دیا کہ یہ تو بتایئے کہ قسطنطنیہ کب سے آپ کے قبضے میں ہے۔ کوئی معمولی مقرر ہوتا تو گھبرا جاتا۔ مولانا نے اپنے سلسلۂ کلام میں ذرا فرق آنے دیئے بغیر جواب دیا۔ سنہ تو یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے قبضہ میں ہندوستان ہے اس سے تگنی مدت سے ہمارے قبضہ میں قسطنطنیہ ہے۔ جلسہ میں قہقہہ پڑا اور فاضل تاریخ مدہم پڑ گئے۔ محمد علی کی قوتِ حافظہ بلا کی تھی اور ذہانت اور برجستگی تو کہنا چاہیے ان پر ختم تھی۔ سارے لطائف وظرائف کوئی لکھنے پر آئے تو کتاب کیا معنی دفتر کا دفتر تیار ہو جائے اور سب لکھ بھی کون سکتا ہے۔ کس کو سب یاد رہ سکتے تھے اور یاد کا سوال تو مجھ کو ہے۔ سال کے ہر دن اور ہر دن کے چوبیسوں گھنٹے ہمزاد بنا ساتھ۔ ایسا کون رہ سکتا تھا۔

مناسبت لفظی کے بادشاہ تھے۔ بات میں بات پیدا کر دینا انہی کا حصہ تھا۔ ذیابیطس میں مبتلا مدت سے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں یہ حال سُن سُنا مہاراجہ الور کو کچھ رحم سا آ گیا، ہزار ہا روپے دیئے۔ علاج کے لیے یورپ بھجوایا۔ اس سے قبل الور مدعو کیے گئے۔ مہاراجہ انگریزی کے تو ادیب تھے ہی فارسی کے بھی شاعر تھے اور وحشی تخلص کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت اپنا دیوان پیش کیا اور اس پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی "To my Moulana from his Wehishi" اپنے مولانا کی خدمت میں ان کے وحشی کا ہدیہ'' مولانا نے جب جامعہ کا نصاب تعلیم نکالا۔ اپنا تصنیف کیا اور اس پر یہ عبارت لکھ کر پیش کر دیا:۔ "From a bogus moulana to a real maharaja" یعنی ''ایک نام کے مولانا کی طرف سے کام کے مہاراجہ کی خدمت میں ہدیہ'' حد ذہانت یہ تھی کہ غصہ کی حالت میں بھی فقرہ چست کرنے سے نہ چوکتے۔

خلافت کمیٹی کے جلسوں میں گرما گرم نوک جھونک کے وقت بارہا یہ منظر دیکھنے میں آتا۔ ایک بار کیا

ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہو رہا تھا۔ محمد علی بیمار و معذور لیٹے ہوئے تھے مخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر ایک روز نامہ کے مالک، مع اپنے صاحبزادے کے۔ اور اسی روز نامہ کے ایڈیٹر بھی تشریف فرما تھے۔ بحث نے طول کھینچا اور یہ تینوں صاحب ناخوش ہو جلسہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد علی برجستہ پکار اٹھے۔ غضب ہو گیا۔ باپ بیٹے روح القدس تینوں خفا ہو گئے۔ ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا۔ محمد علی خود بھی شاعر تھے اور شاعری کی دنیا میں نام تھا جوہر۔ سب سے بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہر۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص رہے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تخلص تجویز کرتا ہوں اسی وزن اور قافیہ میں شوہر۔ شیفتہ کی مشہور غزل پر غزل۔ نادانیوں میں ہم پشیمانیوں میں ہم۔ پر غزل کہنے بیٹھے۔ تو مطلع فرماتے ہیں۔

کیوں شہر چھوڑ جائیں دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیانیوں میں ہم

علی گڈھ کے ایک مشہور خاندان شروانی سے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے۔ اس کے ایک معزز فرد کی زبان سے کہتے ہیں۔

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

خود بیجاپور جیل میں قید تھے۔ لحیم شحیم بڑے بھائی راج کوٹ جیل میں پڑے پڑے دُبلے ہو گئے تھے۔ ان کی زبان سے ادا کیا ہے۔

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی نوجوان ہی تھے کہ علی گڈھ کالج میں طالب علموں نے زبردست اسٹرائک strike کی۔ عین اسی زمانہ میں سر سیّد کی برسی کا دن آیا۔ اور اسی دن اولڈ بوائز old boys نے بھی اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں اور ایک منظوم عریضہ سر سیّد کی روح کی خدمت میں اپنے ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا کر پیش کرتے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
پڑے ساحل پہ ہیں تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

سرسید کے عقائد ملحوظ خاطر رہیں۔

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول وفا تم ہو
تمھیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں اب آنکھیں علی گڈھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جابجا تم ہو
سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا۔

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ سب جیل کے باہر تھا۔ جیل کے اندر خود محمد علی کیا رہے تھے۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے
میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے
امید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ شاعری نہ تھی آپ بیتی کا ایک ٹکڑا تھا۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر چہیتی اور لاڈلی۔ ۱۹۲۳ء میں ابھی جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی آمنہ بی۔ پالی پوسی، جوان شادی شدہ دق میں مبتلا ہوئیں اور مرض روز بروز بڑھتا

گیا۔ بجبور ومقید چاہنے والے باپ پر کیا گزری ہوگی جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی نور نظر کے لیے کیسا کیسا بلبلایا ہوگا، تلملایا ہوگا، پھڑ پھڑایا ہوگا۔ کچھ زور نہ چلا تو عالمِ خیال ہی میں بٹی سے کہنے لگے

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے ہی کو یوں وہ تسکین دینے لگے۔

امتحاں سخت سہی پر دِل مومن ہے وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں۔

تُو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے۔ قرآن میں کیا
تخرج الحی من المیت مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پالے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے کہ سرنوشت کا نوشتہ ٹلتا نہیں، سمجھتے تھے کہ تقدیر الٰہی کیا فیصلہ کر چکی ہے۔ کہتے ہیں اور کلیجہ تھام کر کہتے ہیں۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

ایک نہیں دو جوان پہاڑ سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اُٹھایا، قبر میں سُلایا۔ دل اِن ذاتی صدموں کی تاب کہاں لاتا۔ قومی صدمے ان سے بڑھ چڑھ کر۔ جئے اس کے بعد چھ سات سال، محمد علی کو قوم و ملّت کے پیشوا، ملک کے سردار کی حیثیت سے لاکھوں نے جانا، کروڑوں نے پہچانا۔ ان سب سے زیادہ خوش نصیب وہ تھے جنھوں نے محمد علی کو قریب سے بحیثیت دوست کے، عزیز کے، انسان کے دیکھا۔ کیا

بیان کیا جائے کیسی نعمت انہیں ہاتھ آ گئی تھی۔ ایک صداقت مجسم، ایک پیکر اخلاص، جرأت، دیانت، ہمت، بے خوفی کا مجسمہ۔ پاس والے جتنے قریب سے دیکھتے گئے، حضرت جوہر کے جواہر اور زیادہ کھلتے گئے، نکھرتے گئے۔ مشہور تمام تر ایک بے باک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تھے۔ لیکن ان کے لغت میں ڈپلومیسی کا لفظ ہی نہ تھا۔ ظاہر باطن یکساں۔ جو خیال جس کے متعلق دماغ میں آ گیا۔ زبان سے ادا ہو کر رہا۔ جو بات دل میں آئی منہ پر آئے بغیر نہ رہی۔ کہتے ہیں کہ اہلِ سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ محمد علی اس معنی میں اہل سیاست قطعاً نہ تھے ایک بار نہ تھے، ہزار بار نہ تھے۔ محبت کے پتلے تھے، مہر و الفت کے بندے تھے بیوی بچوں کے عاشق زار، دوستوں، رفیقوں، ساتھیوں پر سو جان سے نثار اور دُور کا واسطہ رکھنے والوں کے مونس و غمگسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ مسلمانوں کے اور عالمِ اسلامی کے ساتھ شیفتگی کی یہ کیفیت کہ افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اس کی چبھن یہاں ہندوستان میں بیٹھے محمد علی محسوس کریں۔ ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' یہ مصرع بار ہا سننے میں آیا تھا اور دل ہمیشہ اسے نری شاعری سمجھا۔ محمد علی کی زندگی نے سمجھا دیا کہ شاعری کبھی حقیقت مجسم بن جاتی ہے۔ لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے، خاطریں کرنے کے حریص تھے۔

اور زندگی کا ثبوت بہت سے زندوں سے بڑھ کر دیتے رہے لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ نہ پنپنا تھا نہ پنپے۔ ہنستے ہیں، بولتے ہیں، گرجتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر جلتے گئے، پھُکتے گئے، پھکتے گئے۔ مذہب کے دیوانے تھے۔ پروردگار سے عشق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جب اس مضمون آیتیں آتیں کہ منافقوں کو دیکھو کہ بجائے اللہ کے یہ اللہ کے بندوں سے ڈرتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور بار باران آیتوں کی تکرار کرتے۔ ان الحکم الاّ لِلّٰہ تو گویا تکیہ کلام تھا۔

۴۔ اور ۵۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو درمیانی شب میں جو مسلمانوں کے یہاں پندرہویں شعبان کی متبرک رات تھی۔ جب روئے زمین کے مسلمان بڑے ذوق وشوق سے جان کی اور ایمان کی، دنیا کی اور عقبیٰ کی دونوں کی سلامتی کی دُعائیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے ان سے یہ نعمت واپس طلب کر لی۔ شاید اس لیے کہ محمد علی کے اہل وطن، اہل ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ جان لندن میں جان آفریں کے سپرد کی۔ آخری آرامگاہ کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین مقدس میں، قبلۂ اول کے قریب۔ جامع عمر سے

متصل۔اقبال کوالہام ہوا

''سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت''

ماتم وشیون کی صدائیں ہندوستان بھر میں اور سارے عالم اسلامی میں اس زور شور سے اٹھیں اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

''ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے''۔انہیں کا مصرع ہے اور یہ بھی تو خود ہی فرما گئے تھے۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

جوش ملیح آبادی

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

حضرت عزیز لکھنوی کے قابلِ ناز شاگرد، مجھ، ہیچ مداں کے اُستاد بھائی، علم عروض وفنِ شاعری کے مرکزی استاد، فارسی وانگریزی ادب کے زبردست نبّاض، قلزمِ انسانیت کے منارۂ ضوبار، ممبرِ انتقاد کے خطیبِ اعظم، مسندِ زبان کے قاضی القضات اور مدینۂ تہذیبِ لکھنؤ کے طاقِ زریں کے، ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں، ایک ایسے آخری اور تنہا چراغ تھے، جن کے گُل ہو جانے سے، تمام شہر پر، مُہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ہر ذرّہ، کراہ کراہ کر، فریاد کر رہا ہے کہ:۔

اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے!

اُن کی موت، ایک فرد کی موت نہیں، ایک پوری صدی، ایک پورے طرزِ معاشرت کی موت ہے، اور نصیر الدین حیدر سے لے کر حضرت جان عالم کے زریں دور تک، لکھنؤ کے اولیائے علم وآئمۂ ادب نے، شائستگی، تہذیب، نفاست، لطافت، اور آداب کی نجابت کا جو دستور قائم کیا تھا، اور اس کے دوش بدوش اُنھوں نے، جس وضع داری، ایثار پسندی، تواضع شعاری، نرم گفتاری، شیریں لہجگی اور بلور مزاجی کو فروغ بخشا تھا، اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔

سُنسان مثلِ وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ آتش آج وطن سے نکل گیا

میں نے جب حضرتِ عزیز کے مکان پر، سب سے پہلے، اُنھیں دیکھا تھا، اُس وقت میری جوانی

کی پہلی کرن پھوٹی تھی، اور وہ جوانی کی دوپہر سے گزر رہے تھے۔ میرے اُن کے مابین چھوٹے اور بڑے بھائی کا سا برتاؤ تھا۔ اور چوں کہ وہ، بشدت ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اس لیے میری آزاد خیالی پر وہ ناک بھوں چڑھاتے اور اکثر مجھ کو ٹوکا کرتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ جب میرے اور ان کے درمیان خاصی بے تکلفی پیدا ہوگئی تو ایک روز میں نے کہا۔ اثر صاحب، اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں، انہوں نے کہا بڑے شوق سے کہیے۔

میں نے کہا تمام ہندوستان، آزادی حاصل کرنے کے لیے، فرنگی کے روبرو خم ٹھونک کر میدان میں آچکا ہے، مُحبانِ وطن دھڑا دھڑ نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں، اور آپ، حسینؑ کے پرستار ہونے کے باوجود، ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بیٹھے، عصرِ حاضر کے یزید فرنگی کا ساتھ دے رہے ہیں، کیا جواب ہے اس کا آپ کے پاس؟ میری یہ بات سُن کر اُن کے چہرے کا رنگ ملگجا سا ہو گیا، کوئی چیز اُن کی پتلیوں میں چبھنے سی لگی اور اُنھوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور میں نے اُن کے چہرے پر اس قدر کرب آمیز شرمندگی دیکھی کہ پھر تمام عمر اُن سے اس موضوع پر بات کی ہی نہیں۔ اُن کی شاعری کا میں کبھی قائل نہیں رہا۔ لیکن اُن کی بے پایاں شرافت، اور بے کراں زبان دانی کا ہمیشہ لوہا مانتا رہا۔ ان کی تمام بے شمار خوبیاں سر آنکھوں پر، لیکن، اُن کو اپنا کلام سُنانے کا اس قدر ہوکا تھا کہ سامعین کی قوتِ برداشت کی ہڈیاں بولنے لگتی تھیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ معرضِ تحریر میں لا رہا ہوں، جس کو پڑھ کر، مجھے یقین ہے کہ آپ بھی، اوبھی اوبھی سانسیں لینے لگیں گے۔

ایک بار مجازؔ کو ساتھ لے کر، میں کشمیر گیا۔ اس دور میں مہاراجہ کشمیر حکمراں اور اثرؔ صاحب، کسی شعبے کے وزیر تھے۔ میں وہاں گیا تو تھا یہ نعرہ لگاتا ہوا کہ:۔

عصیاں کی گھٹا کی چھاؤں میں دم لینے
"ممنوع شجر" سے لطفِ پیہم لینے
آواز دو کاشمیر آپہنچا جوشؔ
اللہ سے، انتقامِ آدم لینے

لیکن وہاں پہنچا تو نواب جعفر علی خاں اثرؔ کے ذوقِ غزل سرائی کی آہنی پنجے میں بند ہوگیا۔

ہاں تو سُنیے کہ ہم کشمیر پہنچے تو دن ڈوب رہا تھا۔ میں نے کہا مجازؔ اس وقت تو یہ مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ ہم شیخ عبداللہ اور اثر صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دیں، اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ ہوٹل

میں ہم نے اپنا شغل شروع کر دیا۔ اور جب مجاز نے، برآمدے میں کھڑے ہوکر، سری نگر پر نگاہ ڈالی تو کہا جوش صاحب یہ شہر تو ایسا ہے گویا ہم مار ہرے آ گئے ہیں۔ اس لطیفے پر ہنس ہنسا کر، ہم سو گئے۔

بہت تڑکے میں نے مجاز کو جگایا، انہوں نے لیٹے لیٹے آنکھ کھول کر کہا، معاف کیجیے یہ وقت کوؤں کے جاگنے کا ہے، میں بستر نہیں چھوڑوں گا، میں نے انھیں جھنجھوڑ کر کہا ارے کم بخت، دَم بھر میں صبح کا گنگا جمنی جلوس گزرے گا، اور تو اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں پر سے اُس جلوس کو گزار دے گا، یہ کیسی غیر شاعرانہ حرکت ہے، ارے کشمیر میں صبح کیوں کر ہوتی ہے، یہ تو دیکھ لے۔ الغرض، مجاز کو زبردستی ساتھ لے کر، ٹہلنے چلا گیا۔ ابھی مشکل سے دو میل ٹہلا ہوں گا کہ دیکھا ایک کوٹھی کے پھاٹک کے ستون پر "نواب جعفر علی خاں" کا بورڈ لٹکا ہوا ہے۔ ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ کوٹھی کے بالائی برآمدے میں، پھاٹک کی طرف منہ کیے کھڑے ہیں اُنھوں نے ہم کو دور سے دیکھ لیا۔ وہ لکڑی کے زینے سے کھٹ کھٹ کرتے نیچے آئے، ہم سے بغل گیر ہوئے، پوچھا یہاں کب آئے۔ میں نے کہا شام کو، انہوں نے کہا۔ ٹھہرے کہاں ہیں، میں نے کہا ہوٹل میں، اُنھوں نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا، میرے وہاں سید ھے کیوں نہیں چلے آئے، کیا مجھ کو مردہ سمجھ لیا تھا، اُس کے بعد اُنھوں نے آواز دی، کوئی ہے، اَردلی دوڑا آیا، انہوں نے اس کو حکم دیا کہ وہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے، اور بل ادا کر دے۔ میں نے کہا بل میں ادا کروں گا۔ اُنھوں نے کہا ہرگز نہیں۔ اس مرحلے کے بعد وہ ہمیں اوپر لے گئے اور ہم کو برآمدے میں بٹھا کر، فوراً کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے اندر، ایک موٹی سی بیاض لیے باہر آ گئے، اور ایک دم سے غزلوں کی گولیاں، دنادن، دنادن، دنادن چلانے لگے۔

جب اس طرح ڈیڑھ، دو گھنٹے گزر گئے تو میں بوکھلا گیا کہ ابھی تک نہ میں نے خط بنایا ہے نہ حمام و ناشتہ ہی کیا ہے۔ میں نے مجاز کو، اور مجاز نے مجھے، بے کسی کے ساتھ دیکھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ کلام کی داد بھی دیتے رہے۔ کہ اتنے میں سکریٹری نے آ کر کہا کہ سرکار، ساڑھے نو بج چکے ہیں، دس بجے مہاراجہ کی ڈیوڑھی پر آپ کو تشریف لے جانا ہے۔ اُنھوں نے، بڑی بے لطفی کے ساتھ، بیاض بند کر دی۔ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ کا سامان یہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ مہاراجہ کے پیلس چلے گئے۔ اُس، غزلوں کے دو نگڑے کے بعد، ہم نے خط بنایا، اور حمام و ناشتہ کر کے لیٹ گئے۔ اور مسلسل غزلیں سننے اور، پیاپے داد دینے کے تکان کی بناء پر ہم کو نیند آ گئی۔ تین گھنٹے تک برابر ہم سوتے رہے، اور

جب آنکھ کھلی تو دیکھا گھڑی ایک بجا رہی ہے۔ اور حضرتِ اثر ایک لمبوترا سا رجسٹر بغل میں دبائے، کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے کہا، آپ کو کشمیر کی سیر کرانے آیا ہوں، میں نے کہا تو اتنا وقت دیجئے کہ دوبارہ نہا دھو کر، کپڑے پہن لوں، اُنھوں نے کہا میں آپ کو، اسی طرح کمرے میں بیٹھے بیٹھے کشمیر کی سیر کراؤں گا۔ اور یہ کہتے ہی اُنھوں نے وہ لمبوترا سا رجسٹر کھول لیا۔ اُنھوں نے ابھی رجسٹر کھولا ہی تھا کہ اردلی نے آ کر کہا۔ سرکار لنچ تیار ہے۔ انہوں نے کہا آیئے لنچ کر لیں، لنچ کی میز پر بیٹھتے ہی طعام و کلام کے دُہرے مشاغل، بیک وقت جاری ہو گئے۔ اور ہمارا عجیب عالم ہو گیا، کانوں میں (مناظرِ کشمیر پر) نظمیں منہ میں نوالے، اور ہونٹوں پر، سُبحان اللہ کے جھوٹے نعرے۔ اور اس طرح وہ لنچ، ہم دونوں کو تناول فرمانے لگا۔

اور خُدا خُدا کر کے، جب وہ کلام و طعام کا مرکب لنچ، ہم کو کھا کر ختم ہوا تو، ہاتھ دھو کر، ہم اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے، اور شاید ابھی مشکل سے دو تین ہی کروٹیں لی ہوں گی کہ وہ ایک چوکور بیاض لیے آ گئے۔ اور یہ کہہ کر نظمیں سُنانے لگے کہ دیکھیے بدنصیب شاعرہ ''سیفو'' کی ناتمام نظموں کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر، یہ نظمیں کہی ہیں۔

اور جب، نظمیں سنتے سنتے، پانچ بج گئے تو میرا دماغ سنسنانے لگا، میں نے کہا۔ میں دونوں وقت حمام کرتا ہوں، آپ اجازت دیں کہ حمام کر کے چائے پی لوں، تا کہ، تازہ دم ہو کر آپ کا کلام سنوں، میں غسل خانے چلا گیا، وہ مجازؔ کو کلام سُناتے رہے، اور مجازؔ کی داد کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی چلی گئی اور تھکی ہوئی آواز کی مری ہوئی ''واہ واہ'' ہوا میں تیرنے لگی۔ وآ ے۔ اے، اے، وآ ہے۔ اے، اے، اے۔''
میں حمام کر کے نکلا تو اُنھوں نے کہا میاں مجازؔ تم بھی حمام کر آؤ، انہوں نے کہا میں تو صبح کو بھی نہیں نہاتا۔ یہ دو فیرا غُسل جوشؔ صاحب ہی کو مبارک ہو۔ اتنے میں چائے آ گئی، اور، چائے کا آدھا آدھا گھونٹ پی پی کر، وہ ''سیفو'' کی نظموں کے آخری ٹکڑے سنانے اور ہم دونوں داد دینے لگے۔

اتنے میں، بڑی کراہ کے ساتھ، آفتاب ڈوب گیا، فضا ساؤنلی سَلونی ہو گئی۔ اثر صاحب نے ہم دونوں، قُربانی کے بکروں کو، بڑے شان دار ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا، بلب روشن کر دیے، ہیٹر جلا دیا، اعلیٰ درجے کی وسکی کی بوتل، نہایت خوب صورت گلاس اور تلے کا جو کی ڈشیں ہمارے سامنے رکھوا کر بہت

سی اگر بتیاں جلوا دیں۔

اب ہم دن بھر کے جھنجھوڑے، بھنبوڑے اور دوہے ہوئے، تھکے ماندے بندوں نے، اپنے اپنے پیمانے بھرے، "الحمد اللہ" کہہ کر، دو دو گھونٹ پئے، مجازؔ نے سگریٹ اور میں نے سگار جلالیا۔ اور وہ ایک بغلی کمرے سے نکل کر آئے، ہمارے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور میر تقی میرؔ کے رنگ کی غزلیں سنانے لگے۔ اور، میدانِ داد کے، ہم دونوں کرائے کے ٹٹو، پھرڈکی، پوئی، لنگوری، قدم اور سرپٹ کے جوہر دکھانے لگے۔

اور جب رات کے گیارہ بج گئے، تو مجاز کو، اَں اَلا کے، قے ہوگئی۔ دو اردلی ان کو پکڑ کر خواب گاہ لے گئے، دو فرش صاف کرنے لگے، اثر نے میری طرف نگاہیں اُٹھا کر، مجھے ٹٹولا کہ مجھ میں اگر دم باقی ہو تو وہ میر کے رنگ کی غزلیں پھر سُنانے لگیں، میں نے اُن کے ارادے کو بھانپ کر، گردن ڈال دی، اور محفل برخواست ہوگئی۔

اور صبح کے چار بجے میں نے جب مجازؔ کو جگایا، تو وہ یہ سمجھ کر کہ اثر صاحب آ گئے، اُس نے، آنکھیں کھولے بغیر، کہنا شروع کر دیا کہ "سبحان اللہ جواب نہیں ہے اس شعر کا۔" اس کی اس داد پر جب میں ہنسنے لگا تو اُس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا، اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ جعفر علی خاں نہیں، جوش صاحب آپ ہیں۔ اور ہم دونوں اس وقت زندہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب کیا میری ماں نے مجھ کو صرف اتنے کے لیے پیدا کیا تھا کہ جب میں جوان ہو جاؤں تو آپ کے ساتھ کشمیر جاؤں، اور کشمیر کی سیر کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ آپ میری بات مانیں، ابھی سویرا ہے، اس وقت یہاں سے، چپ چپاتے بھاگ کھڑے ہوں اور کسی دور کے ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو جائیں، میں نے کہا اور یہ تمام سامان کیا ہم اپنے سروں پر لاد کے لے جائیں گے، اُس نے کہا جس ہوٹل میں ہم نے کل کی رات بسر کی تھی، وہیں ٹیکسیوں کا اڈا ہے، میں ٹیکسی کے ساتھ مزدور بھی لاؤں گا، ٹیکسی کو پھاٹک کے باہر ٹھہرا دوں گا، اور مزدور یہاں سے سامان لے جا کر ٹیکسی میں رکھ دیں گے۔ میں نے کہا بڑی اچھی تدبیر ہے، دیر نہ کرو، ابھی جاؤ۔

جب ٹیکسی آ گئی اور سامان رکھ دیا گیا۔ میں نے کہا ڈرائیور صاحب ہم کو کسی ایسے ہاؤس بوٹ تک پہنچا دو، جو یہاں سے دور ہو، اور ڈھونڈنے والے کو آسانی سے نہ مل سکے۔

ٹیکسی والے نے ہم کو غالباً ہائی کورٹ کی پشت کے ایک ایسے ہاؤس بوٹ میں لے جا کر ٹھہرا دیا، جو گزرگاہِ عام سے دور تھا، وہاں پہنچ کر، ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے خط بنایا، حمام کیا،

اور غسل خانے سے نکل کر جب ناشتے کی میز پر بیٹھا تو دیکھا مجاز سو رہا ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اُس کو جگاؤں، تنہا ناشتہ کیا اور ٹہلنے نکل گیا۔ ٹہلنے میں زیادہ لطف نہیں آیا، اس لیے کہ حضرتِ آثر کے کلام کی لگاتار بارش سے، میرا سر کپوہ چکا تھا۔ ہاؤس بوٹ میں جا کر سو گیا۔ دن کے ایک بجے آنکھ کھلی، دیکھا مجاز سو رہا ہے، اُسے جگایا، دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا۔ مجاز سے کہا جلدی جلدی خط بنا کر نہا ڈالو، مجاز نے کہا کل خط بناؤں گا، میں نے کہا اچھا تو پھر حمام ہی کر آؤ، اُس نے مسکرا کر کہا جوش صاحب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم مُسلمان ہیں پنڈت دوارکا پرشاد نہیں کہ اشنان کریں۔ میں نے کہا، یوں کہو کہ ہم گندے مشلنے ہیں، ہم کو حمام سے کیا کام۔ اور مجاز نے، فقط دو چھوٹی کلیاں کر کے ناشتہ شروع کر دیا، اور مجھ کو گھن آنے لگی۔

کوئی چار بجے کے قریب جب میں نے دریا کا لُطف اٹھانے کے لیے "شکارا" بلایا، اور شکارے پر اپنا افطار کا سامان رکھوا دیا۔ تو مجاز نے بڑی بھیانک آواز سے کہا، جعفر علی خاں کی سی صورت کے کوئی صاحب، ہائی کورٹ کی سیڑھیوں سے نیچے اُترتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا ایسی بھکّیا نہ نکالو منہ سے، کوئی اور ہوگا۔ مجاز نے کہا۔ ارے جوش صاحب سچ مچ جعفر علی خاں چلے آ رہے ہیں، آیئے، صوفوں کے نیچے لیٹ جائیں، میں نے کہا یہ تو شُتر مرغ کی سی حرکت ہوگی، جو طوفان کے وقت ریگ میں اپنا منہ چھپا کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ طوفان گزر گیا۔ اتنے میں، دو تین وردی پوش آدمیوں کے ساتھ، جعفر علی خاں ساحل پر آ گئے، اور اُن کے آدمی، کشتی بانوں سے ہمارے قیافے بتا کر پوچھنے لگے کہ وہ دونوں کس ہاؤس بوٹ میں ہیں۔

ہماری بد قسمتی دیکھیے کہ ہمارے ہاؤس بوٹ کا ملاح، جو سامان لینے باہر گیا ہوا تھا، وہ کم بخت اُدھر سے گزرا، اور جب ہمارے قیافے بتا کر، ہمارا پتا پوچھا گیا، تو اُس نے کہا آیئے میرے ساتھ، وہ ہمارے ہی ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں نے اُن کو اپنی کشتی کی طرف آتے دیکھا تو ہم اس طرح سراسیمہ ہو گئے، جس طرح جیل سے بھاگے ہوئے چور، پولیس کو تعاقب میں آتا دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں۔

اتنے میں وہ آ گئے، اور، چھوٹتے ہی اُنھوں نے کہا۔ کیوں جوش صاحب، دوستوں کے گھر سے کوئی یوں بھی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر میرے یہاں کوئی تکلیف تھی، مجھ سے کہہ دیتے، میں اُسے رفع کر دیتا، آپ کو معلوم نہیں، صبح جب میں آپ کے کمرے میں گیا اور کمرے کو خالی پایا تو میرے پاؤں کے نیچے

سے زمین نکل گئی۔ میں نے اپنے آدمی، آپ کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیے، اور جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، وہاں کے ایک ٹیکسی والے سے جب یہ پتا چلا کہ آپ ہائی کورٹ کی پشت کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو میں خود آیا اور آپ کو گرفتار کر لیا۔

ان کی شکایت سے میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ اور کہا اثر صاحب یہ مجز وا (مجاز) ہے جو مجھے آپ کے دولت کدے سے بھگا کر یہاں لے آیا، اس نے مجھ سے کہا، کشمیر آنا اور ہاؤس بوٹ میں نہ ٹھہرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ اُنھوں نے کہا مجھ سے کہتے میں سرکاری ہاؤس بوٹ کا بندوبست کر دیتا۔ میں نے آنکھیں جُھکا کر کہا، بڑی غلطی ہوئی مجھ سے، میرا مزاج تو ''دیوانہ را، ہوئے بس است'' کا سا ہے، مجاز نے ''ہو'' کہا، اور میں دیوانہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں دست بستہ آپ سے معافی کا طالب ہوں، آپ کریم ہیں، معاف فرما دیں۔

اثر صاحب نے مسکرا کر، مجھے گلے لیا۔ مجاز سے کہا تم بڑی وِس کی گانٹھ نکلے۔ اُس کی آنکھیں ریہر پانے لگیں۔ اثر صاحب نے، ایک وردی پوش کو آواز دی، وہ آیا، اُنھوں نے کہا بوتل لاؤ، اُس نے بوتل سامنے رکھ دی۔ مجاز بوتل کی طرف، ہڑ بڑا کر جھکے، میں نے کہا، آفتاب ڈوبنے میں ابھی دس گیارہ منٹ باقی ہیں، ٹھہر جاؤ، مجاز منہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور اثر صاحب نے اپنا کلام سُنانا شروع کر دیا۔ اور ہماری سیرِ دریا کی تمنا پر پانی پھر گیا۔

دوسرے دِن، صُبح کو ٹہل کر، جب میں ہاؤس بوٹ میں آیا تو مجاز نے کہا، اب کیا کریں اثر صاحب نے تو گھر دیکھ لیا ہے، کسی اور ہاؤس بوٹ میں چلے چلیں۔ میں نے کہا وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم اُن سے منہ چھپا رہے ہیں۔ اُس پر مجاز نے کہا تو پھر آج، ذرا جلدی کھانا کھا کر، دو بجے ہی شکارے پر بھاگ کھڑے ہوں اور گھوم گھام کر، ''تھری اوک'' والے جزیرے جائیں اور وہیں بیٹھ کر شغل کریں۔

اس تجویز پر عمل کر کے، ہم لوگ دو بجے ہی شکارا منگا کر، نکل گئے اور بہت سے مقامات کی سیر کر کے، ''تھری اوک'' کے جزیرے میں، شام ہوتے ہی پہنچ گئے، بساطِ بادہ خواری بچھا دی گئی، اور ماہِ یک ہفتہ کو سلام کر کے، پیانے بھر لیے۔ اور آہستہ آہستہ پینے لگے۔ اور مجاز نے، بڑے ولولے کے ساتھ کہا، اب پکڑ لیں ہم کو نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ اُن کی یہ آواز ابھی گونج ہی رہی تھی کہ دیکھا ایک شکارا، دور سے، ہماری طرف چلا آ رہا ہے۔ اتنے میں چاند کی روشنی تیز ہو گئی۔ دریا کا پانی جھلکنے اور کڑم

کزم کرنے لگا اور شیشوں کی آگ ہمارے جسم میں دوڑنے لگی۔ کہ اتنے میں وہ دور کا شکارہ قریب آ گیا۔ مجاز نے شکارے کو غور سے دیکھا، اُن کے کان کھڑے ہوگئے۔ مجھ سے کہا۔ ارے جعفر علی خاں چلے آ رہے ہیں، میں نے کہا "دیوانے ہوگئے ہو" اُنھوں نے کہا۔ ارے وہی عینک، ارے وہی پرشین کیپ۔ ارے وہی شیروانی، ہائے رام، ہائے رام!

اتنے میں شکارا ہمارے جزیرے سے آ کر لگ گیا۔ اور اثر صاحب اُتر کر، ہماری طرف آنے لگے۔ ہم کھڑے ہوگئے، اُنھوں نے کہا:۔ تو جہاں جا کے چھپا، ہم نے وہیں دیکھ لیا۔ اور یہ مصرع سُنا کر اُنھوں نے اپنا کلام سُنانا شروع کر دیا۔

خواجہ غلام السیدین

شمعِ محفل

(سید راس مسعود)

مجھے اپنی زندگی میں جن مشاہیر سے ملنے کا اتفاق ہوا ان میں سے دو نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ ایک ڈاکٹر اقبال اور دوسرے سید راس مسعود۔ ڈاکٹر اقبال سے مل کر انسان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کا دماغ حکمت و فراست کا ایک گہرا خزانہ ہے جس کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں یا روشنی کا ایک مینار ہے جو انسانی تقدیر اور امکانات کے چھپے ہوئے گوشوں کو منور کر دیتا ہے۔ سید راس مسعود سے مل کر انسان نہ صرف ان کی دماغی قابلیت سے متاثر ہوتا بلکہ ان کی سراپا دلکش شخصیت سے مسحور ہو جاتا تھا۔ ان کی ایک ہی ملاقات کا نقش اس قدر گہرا ہوتا تھا کہ اس کو بھلانا ممکن نہ تھا۔ اس سراپا باغ و بہار شخصیت کی تصویر کشی کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ جن لوگوں کو ان کی ملاقات اور دوستی کی نعمت میسر نہیں ہوئی انہیں شاید میرے الفاظ میں مبالغہ کی جھلک نظر آئے۔ لیکن ان کے ہزاروں دوستوں اور عقیدت مندوں کو خیال ہوگا کہ یہ تصویر بے کیف و بے رنگ ہے۔ اس جیتی جاگتی دل فریب شخصیت کے مقابلے میں جو ان کے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے۔ خود مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ میری نگاہ تخیل کے سامنے تو مصور فطرت کا ایک رنگین شاہکار ہے اور میں گویا قلم سرمہ کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کر رہا ہوں! چاہتا ہوں کہ پہلے میں مختصر طور پر ان کی زندگی کے چند واقعات بیان کروں اور پھر اپنے ذاتی تاثرات جن میں شاید ان کی شخصیت کی ہلکی سی جھلک نظر آ جائے۔

راس مسعود سرسید اعظم کے پوتے اور جسٹس محمود کے بیٹے تھے۔ بچپن ہی سے انہیں ایک ایسا ماحول ملا جوان کی خداداد قابلیتوں اور صلاحیتوں کے لیے خاص طور پر سازگار تھا۔ انہوں نے وجاہتِ ظاہری اور دماغ اور سیرت کی بہت سی خوبیاں اپنے باپ دادا سے وراثت میں پائی تھیں۔ ماحول کے اثر اور جوہر ذات نے ان خوبیوں کو چار چاند لگا دیئے۔ اسکول کی تعلیم علی گڑھ میں ختم کرنے کے بعد راس مسعود انگلستان چلے گئے اور نیو کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے۔ سننے میں آیا ہے کہ ان کے استاد اور دوست اور ملاقاتی ہی نہیں بلکہ ملازم تک ان کی شخصیت سے اس درجہ متاثر تھے کہ عمر بھر ان کی یاد نہ بھلا سکے۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور ان کے سب استاد ان کی جدت طبع اور وسعت تخیل کے قائل تھے۔ کھیلوں میں انہوں نے کمال بہم پہنچایا تھا۔ وہ اپنے کالج میں ٹینس اور باکسنگ کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور کپتان رہے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ مقبولیت تھی جو انہیں انگلستان کی اونچی سوسائٹی میں حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں ایسی مثالیں کم ملیں گی کہ کوئی شخص راس مسعود کی طرح انگلستان کے اونچے اور شریف خاندانوں میں اس طرح گھل مل کر رہا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات انہیں اپنے باپ اور سرتھیوڈور ماریسن کے معزز انگریز دوستوں کی سفارش سے نصیب ہوئی۔ لیکن اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے علم مجلسی میں یہ غیر معمولی قابلیت نہ ہوتی تو تعارف اور سفارش کے باوجود آگے نہ بڑھ سکتا۔ راس مسعود کی شخصیت میں کوئی ایسی دلکشی تھی کہ وہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ غیر معمولی ہردلعزیزی انہوں نے اپنی انفرادی خصوصیات کھو کر حاصل نہیں کی تھی۔ ان کی تہذیبی قدریں بالکل ہندوستانی تھیں مگر اس کے ساتھ وہ حقیقی معنوں میں ایک عالمگیر تہذیب کے حامل تھے۔ بعض لوگ غیر ملکی سوسائٹی میں مقبول ہونے کے لیے بدیشیوں کے طور طریق کی نقالی کرنے لگتے ہیں مگر راس مسعود نے کبھی اپنے اصلی رنگ کو نہیں چھوڑا۔ ان کی دلکشی اور اثر آفرینی کا راز ہی یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی وضع پر قائم رہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے قدر شناس انگریز احباب ان کی سچی قدر کرتے تھے، محض مربیانہ شفقت نہ فرماتے تھے!

انگلستان سے واپس آنے کے بعد راس مسعود نے اپنے لیے تعلیم کا میدان منتخب کیا اور اس میں بڑی اہم اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔ وہ انڈین ایجوکیشن سروس کے ممبر تھے۔ سب سے پہلے گورنمنٹ ہائی اسکول پٹنہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اور پھر چند ہی سال میں ترقی کر کے اریونشا کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ میرے خیال میں تعلیم کے کام سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت نہ

تھی۔ مگر دو صفات ان میں ایسی تھیں جن کی بدولت انہوں نے معلم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایک طرف وسعت مطالعہ اور سلامت ذوق نے ان کے ذہن کو پاکیزہ خیالات، برجستہ اشارات، برمحل حکایات اور تلمیحات کا مخزن بنا دیا تھا۔ اسی لیے ان کی گفتگو حلقۂ درس ہو یا صحبت احباب، سننے والوں کے لیے ایک روحانی نعمت تھی۔ دوسرے ان کی شخصیت کا خلوص اور دل کشی، ان کی بے مثل ظرافت اور سچا جوش، جس میں آخر عمر تک شباب کی تازگی قائم رہی، نوجوانوں کو مقناطیس کی طرح کھینچتا تھا۔ ڈسپلن قائم کرنے میں انہیں کبھی دقت نہیں ہوئی۔ طالب علموں سے وہ انتہائی شفقت اور محبت سے پیش آتے اور وہ بھی ان سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ بھلا کس طالب علم کا سر پھرا تھا کہ ایسے شفیق اور ہمدرد استاد سے، جو نوجوانوں کی نفسیات کا ماہر تھا اور ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں دل و جان سے شریک رہتا تھا، سرکشی اختیار کرتا؟ مگر یہ وہ اوچھی ہر دلعزیزی نہ تھی جو بعض استادوں کو اس وجہ سے حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا کوئی خاص ذہنی رنگ نہیں رکھتے بلکہ شاگردوں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ راس مسعود ادب، آرٹ، شاعری، تاریخ، نفسیات غرض ہر قسم کے تہذیبی اور تمدنی مسائل سے ذوق رکھتے تھے۔ ان کی نظر مدرسہ کی چار دیواری میں مقید نہ تھی۔ کتابوں کے مطالعے، انسانوں کے ساتھ عملی لین دین اور معاملات کے تجربے نے انہیں زندگی کے وسیع تر دائرے سے آشنا اور ان کی منفرد شخصیت کو گونا گوں صفات سے مالا مال کر دیا تھا۔ قدرتاً ایسی شخصیت کا فیض نسیم بہار کی طرح ان کے طلبا کے تھکے ہوئے دل و دماغ کو فرحت اور تازگی بخشتا تھا۔

صرف چند سال انڈین ایجوکیشن سروس میں رہنے کے بعد شاید تیس برس کی عمر میں راس مسعود حیدر آباد کے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم مقرر ہو گئے۔ حیدر آباد کی تعلیمی تاریخ میں ان کی وہ خدمات جو انہوں نے محکمہ کی تنظیم جدید کے سلسلے میں انجام دیں آبِ زر سے لکھی جائیں گی۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ البتہ شخصی اعتبار سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ حیدر آباد جیسے مقام پر جہاں ناظم تعلیم کا عہدہ مقابلتاً زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور جہاں وزراء اور معتمدین کے درباروں کی شان دوسرے عہدیداروں کو مرعوب کر دیتی تھی۔ اس تیس برس کے نوجوان ڈائرکٹر نے پوری ریاست میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ چند ہی سال کے عرصہ میں راس مسعود نے وہ اثر واقتدار حاصل کر لیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اکثر اراکینِ حکومت سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے اور ان کی ذات مجلسوں کی رونق، علمی اور ذہنی زندگی کا اور خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ان کی غیر معمولی ذہنی قابلیت، ان کی شخصیت، ان کی معاملہ فہمی اور ذاتی اثر

آفرینی کا کرشمہ تھا کہ حکمت عملی کی بساط پر انہوں نے بڑے بڑے شاطروں کو مات کیا اور ان کے حریفوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ایسے دبنگ آدمی کا مقابلہ کرنا کھیل نہیں ہے۔ وہ دوستوں کے کھلے دوست اور دشمنوں کے کھلے دشمن تھے۔ مگر دنائت اور خباثت سے ان کا دامن پاک تھا۔ ڈپٹ کر وار کرتے تھے اور سنبھل کر روکتے تھے لیکن ان کے مخالفوں کو بھی ان کی اعلیٰ ظرفی کا اعتراف کرنا پڑتا تھا اور وقت پڑنے پر وہ ان کی مدد کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

حیدرآباد میں ان کی سب سے بڑی تعلیمی خدمت عثمانیہ یونیورسٹی کی تاسیس ہے۔ یہ تجویز ان کے عزیز دوست مولوی عبدالحق کی ان تھک کوشش، سر اکبر حیدری کے تدبر اور اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد کی توجہ سے مرتب ہوئی تھی لیکن اسے عملی جامہ پہنا کر ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا بڑی حد تک راس مسعود کا کارنامہ ہے۔ ان کا دلی عقیدہ تھا کہ موثر اور سچی تعلیم وہی ہوسکتی ہے جو طلباء کی مادری زبان میں دی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے ہر حصے میں الگ الگ یونیورسٹیاں ہوں جو مختلف دیسی زبانوں میں تعلیم دیں۔ یہ خیال مرحوم نے مختلف موقعوں پر شدومد سے ظاہر کیا ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس بنارس، اریونشا کالج کٹک، اور کلکتے کے تعلیمی ہفتے میں جو خطبے انہوں نے دیئے ہیں ان میں اس مسئلہ پر مدلل بحث موجود ہے۔ انہوں نے اس تحریک کی تائید اس وقت کی جب ہندوستان کا بیشتر تعلیم یافتہ طبقہ اس بات کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ انگریزی کو بحیثیت ذریعۂ تعلیم کے ترک کرے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام میں مدد دینے کے علاوہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی میں، جہاں تک ان سے ہوسکا۔ شعبۂ اردو کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ اندور میں ہندی یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے جو کمیٹی مقرر ہوئی وہ اس کے بھی ایک مستند ممبر تھے اور اس میں انہوں نے کافی دلچسپی لی۔

ماہر تعلیم اور مدبر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کا ذکر کرنے کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ مالی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ان کی کوششوں سے یونیورسٹی کو پانچ برس میں اتنے عطیات مل گئے جتنے شاید اس سے پہلے پچاس برس میں حاصل نہ ہوئے تھے۔ انتظامی حیثیت سے انہوں نے تنظیم جدید کی مہم کو، جس میں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا تھا، نہایت کامیابی سے سر کیا۔ بہت سی انتظامی کمزوریاں جو سابق دور میں پیدا ہوگئی تھیں ان کو رفتہ رفتہ دور کیا۔ علمی اور تعلیمی اعتبار سے یونیورسٹی نے کافی ترقی کی۔ مختلف شعبوں کی اصلاح اور توسیع ہوئی۔ سائنس کا شاندار کالج قائم ہوا اور فزکس اور بیالوجی میں ریسرچ کی بنیاد پڑی۔ اس طرح

یونیورسٹی کی ساکھ پبلک اور حکومت کے دلوں میں پھر سے قائم ہوگئی اور علی گڑھ کے طلبا پھر علی گڑھ پر فخر کرنے لگے۔

مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ یونیورسٹی کی باگ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو تہذیب نفس، وسعت نظر اور رفعت خیال رکھتا ہے۔ تعلیمی معاملات کو تعلیمی نظر سے دیکھتا ہے اور اہل علم کے ساتھ اہل علم کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی بلکہ اپنے امکان بھر یونیورسٹی کو ایک علمی ادارے کی شان کے ساتھ اور انصاف سے چلانے کی کوشش کی اور اپنے دشوار فرائض کو انجام دینے میں اپنی راحت اور آرام بلکہ اپنی صحت تک قربان کردی۔

لیکن وہ علی گڑھ میں پانچ سال سے زیادہ نہیں رہ سکے۔ ایسا وائس چانسلر جو اپنے خیال اور عمل میں آزاد ہو اور یونیورسٹی کے معاملات میں بیرونی اثرات کو قبول نہ کرے ارباب غرض کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایسی حالت میں وہ یونیورسٹی کی خاطر خواہ خدمت نہیں کرسکتے تو استعفادے کر الگ ہوگئے۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بہت حساس طبیعت رکھتے تھے اور پبلک کی نکتہ چینی کو آسانی سے برداشت نہ کرسکتے تھے جو جمہوری اداروں کو چلانے کے لیے ضروری ہے۔ مگر علی گڑھ سے انہیں جو دلی تعلق اور اس کی فلاح و بہبود سے جو شغف تھا وہ بدستور باقی رہا۔ جب یونیورسٹی کا مورخ ذاتی تعلقات اور انفرادی جذبات سے قطع نظر کرکے اس دور کے حالت پر تبصرہ کرے گا تو بڑے دلچسپ انکشافات ہوں گے، جن سے بعض لوگوں کی شہرت پر برا اثر پڑے گا! مگر مجھے یقین ہے کہ راس مسعود کی ذات تاریخ کی کسوٹی پر پوری اترے گی اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہ کرسکے گا کہ انہوں نے انتہائی جوش اور سرگرمی، خلوص اور بے نفسی سے اس درس گاہ کی خدمت کی اور چند ہی سال میں اس کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو گرداب سے نکال کر ساحل عافیت پر پہنچایا۔

(۲)

پہلی مرتبہ مجھے ۱۹۲۲ء میں ان کا نیاز حاصل ہوا۔ میں اس زمانے میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا اور وہاں سے طلبا کے ایک وفد میں شریک ہوکر حیدرآباد گیا تھا۔ میرے اور ان کے خاندان میں تین پشتوں سے (یعنی مولانا حالی اور سرسید کے زمانے سے) خلوص اور محبت کے مراسم چلے آتے تھے۔ اس لیے ان کی

خدمت میں حاضر ہونا میرا فرض تھا۔ چناں چہ میں اپنے ایک دوست خواجہ سرور حسن کے ساتھ جو اس زمانے میں حیدر آباد میں رہتے تھے ان کے ہاں پہنچا۔ ہم ان کے کتب خانے میں جا کر بیٹھے جہاں ہزاروں کتابیں نہایت سلیقے کے ساتھ الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے اکثر کی نہایت خوش نما اور دیدہ زیب جلدیں انہوں نے اپنے خاص اہتمام سے بندھوائی تھیں۔ ان کے حسن مذاق کی یہ پہلی جھلک تھی جو میں نے دیکھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب ان سے ملنے کے زیادہ مواقع ملے تو اندازہ ہوا کہ ان کی گونا گوں دل چسپیوں کے ہر شعبے میں، ادب میں، آرٹ میں، موسیقی میں، فن تعمیر اور مکان کی آرائش میں، باغ کی چمن بندی میں، غرض ہر جگہ یہی حسن مذاق کارفرما تھا۔۔۔ چند ہی منٹ بعد ایک وجیہہ اور شاندار شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اونچا قد، سڈول جسم، گورا رنگ، انگریزوں کی طرح سرخ وسفید نہیں بلکہ ہسپانیوں کی طرح ایک زیتونی جھلک لیے ہوئے، پیشانی کشادہ جس سے دماغ کی وسعت اور فراخی ظاہر ہوتی تھی، آنکھیں بڑی اور روشن جن سے بیک وقت سنجیدگی اور ظرافت ٹپکتی تھی۔ بشرے سے عزم اور استقلال آشکار، اور چہرہ ذہانت اور ذکاوت کا آئینہ دار۔۔۔ یہ تھے سید راس مسعود۔ میں ان سے ملنے تو آیا تھا مگر دل میں جھجک تھی۔ میں ایک گمنام طالب علم اور وہ ریاست حیدر آباد کے ناظم تعلیمات اور ایک مسلمہ شہرت کے مالک! شاید ملاقات بالکل رسمی ہو کر رہ جائے۔ شاید وہ بعض یورپ زدہ ہندوستانیوں کی طرح پوچھ بیٹھیں۔ ''میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' شاید وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی گفتگو یا دلچسپی کے افلاس کو چھپانے کی خاطر موسم کے بارے میں بات چیت کرنے لگتے ہیں یا بہت سے دوسرے ''بڑے'' آدمیوں کی طرح اپنی عظمت اور اہمیت کا سکہ مجھ پر بٹھانا چاہیں۔۔۔ شاید وہ۔۔۔ لیکن میں اس وقت تک اپنے راس مسعود سے واقف نہ تھا۔ جن کے ناوک اخلاق و گفتار نے کسی صید کی جاں بخشی نہ کی تھی۔ جیسے شاعر نے انہیں کے لیے کہا تھا

نہ ماند کس کہ بہ تیغ نگاہ نازکشی
مگر کہ زندہ کنی ہر یکے د باز کشی!

چند ہی منٹ میں ان کے خلوص اور محبت کے برتاؤ اور گفتگو کے انداز نے میری جھجک اور احساسِ کمتری کو دور کر دیا اور مجھے یہ معلوم ہونے لگا کہ ایک پرانے اور شفیق دوست سے بات کر رہا ہوں۔ نام سنتے ہی بولے۔ ''ارے میاں، مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ تمہارے والد اور تمہارے خاندان سے خوب واقف ہوں۔ جس شخص کی رگوں میں حالی کا خون ہو میں اسے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر سمجھتا

ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''اگر کسی انسان کی پرستش گناہ نہ ہوتی تو میں حالی کو پوجتا۔'' اور پھر مولانا حالی اور ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب اور میرے والد مرحوم کا ذکر اور ان کے قصے سنانے شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں حالی کی شاعری، اردو اور انگریزی ادب، علی گڑھ یونیورسٹی، قدیم مخطوطات، جدید مطبوعات اور نہ معلوم کن کن چیزوں کا ذکر آتا گیا۔ گفتگو کیا تھی ایک شفاف دریا موجیں مار رہا تھا یا ایک روشن شمع تھی کہ جس طرف مڑتی جاتی روشنی مسکرانے لگتی اور میری یہ کیفیت کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

واقعہ یہ ہے کہ ان کا سا خوش بیان آدمی میں نے ہندوستان میں کیا کسی ملک میں بھی نہیں دیکھا۔ چسٹرٹن کا قول ہے کہ آرٹ مبالغہ کا نام ہے۔ چھوٹی سی بات کو زیب داستان کے لیے بڑھا کر استعمال کرنا راس مسعود کا حصہ تھا۔ ان کی ذات ہر محفل میں رونق محفل ہوتی تھی۔ جس صحبت میں پہنچ جاتے نسیم بہار کی طرح دلوں کو شگفتہ کر دیتے۔ ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی ہوا نہ بندھتی تھی۔ ان کے پاس قصے، کہانیوں، حکایتوں اور لطیفوں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا جن کو وہ نہایت سلیقے کے ساتھ برمحل استعمال کرتے تھے۔ تقریر کی روانی کا یہ حال تھا کہ گویا ایک صاف شفاف دریا بہتا چلا جا رہا ہے۔ سننے والے مقطع بزرگ ہوں یا بدمغ حکام، یا سرپھرے نوجوان، ان کا جادو سبھی پر چل جاتا تھا۔ تخیل کی جولانی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص مبازانہ انداز میں کوئی عجیب و غریب قصہ سناتا یا شیخی بگھارتا تو وہ فوراً ہی ایک عجیب تر داستان تصنیف کر کے سنا دیتے۔ ان کی ظرافت بے امان تھی۔ لیکن اس میں دل آزاری یا تحقیر کا شائبہ نہ ہوتا تھا۔ خشک مزاج اور خرد ماغ لوگ خاص طور پر اس کا نشانہ بنتے تھے۔ یہ ظرافت بڑی دلچسپ صورتیں اختیار کرتی تھی۔ ایک دفعہ اہل ذوق کے ایک مختصر مجمع میں شعر خوانی کر رہے تھے کہ بدقسمتی سے ایک بزرگ وہاں وارد ہوئے جن کو شعر سے بالکل مس نہ تھا لیکن خود اس محرومی سے ناواقف تھے۔ چناں چہ انہوں نے سب سے زیادہ بلند آہنگی سے ہر شعر کی داد دینی شروع کی۔ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔۔۔'' خان صاحب آپ کو معلوم ہے کہ مجھے غالب کا کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے۔ سنیے:۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں میرے قبر کے اندر کفن میں پاؤں

اس غریب نے بے اختیار داد دینی شروع ہی کی تھی کہ انہوں نے آ لیا اور شعر کے مضحک پہلو کی اس،

خوبصورتی سے اداکاری کی کہ حاضرین ہنسی سے بے قرار اور وہ بے چارے حیران ہو کر رہ گئے! اسی طرح ایک دفعہ ایک شامت کا مارا امریکن مخصوص خود پسندی کے انداز میں اپنے ملک کی عظمت و شان کی داستانیں بگھار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ''دنیا بھر میں سب سے لمبی سرنگ امریکہ میں ہے جس کا طول بیس میل سے بھی زیادہ ہے۔'' مسعود صاحب کو شرارت سوجھی، کہنے لگے ''اس سے تو کہیں زیادہ لمبی سرنگ ہمارے ہندوستان میں ہے۔'' اس نے گھبرا کر پوچھا ''کہاں'' کہنے لگے وہی سرنگ جو مغل بادشاہوں نے دہلی اور آگرہ کے بیچ میں بنائی تھی تاکہ جنگ کے زمانے میں پوشیدہ طور پر سفر کر سکیں یہ سرنگ کوئی سوا سو میل لمبی ہے''۔ اس نے امریکہ کی قومی عزت اور برتری کو قائم رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔ ''ہمارے ہاں تو سرنگ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ آپ کے ان مغل بادشاہوں نے روشنی کا کیا انتظام کیا ہوگا۔'' راس مسعود کے دماغ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کا بنا بنایا برجستہ جواب کوند گیا بولے ''اسی میں تو انہوں نے اپنا کمال دکھایا تھا اس زمانے میں بجلی تو ہوتی ہی نہ تھی اس لیے جب سرنگ بن کر تیار ہوگئی تو بادشاہ نے حکم دے دیا کہ برسات کے موسم میں تمام فوج کو جنگلوں میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ وہاں سے کروڑوں جگنو پکڑ کر سرنگ میں چھوڑ دیں۔ چناں چہ ان جگنوؤں کی چمک نے سرنگ کو کو بقعہ نور بنا دیا۔ اور آج تک ان کی اولاد اس سرنگ میں بستی ہے اور اس کو روشن رکھتی ہے!'' بے چارہ سادہ لوح امریکن اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اور اس کو یہ شبہ نہیں گزرا کہ اس قدر سوکھا سنجیدہ منہ بنائے یہ اس پر اپنی بے اماں ظرافت آزما رہے ہیں۔ ان کے اکثر دوستوں نے ان کی عملی ستم ظریفی کی بہت سی دلچسپ مثالیں دیکھی ہیں جن کو سنانے کا موقع نہیں۔ صرف ایک قصہ سن لیجئے۔ ایک دفعہ ان کے مکان میں اردو کے ایک مشہور ادیب (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) ٹھیرے ہوئے تھے۔ ان کو نہ صرف بواسیر کی شکایت تھی بلکہ وہ ہر کس و ناکس سے موقع اور بے موقع اس موضوع پر اس قدر تفصیل سے گفتگو کرتے کہ لاچار ہو کر مخاطب کا ذہن یا قتل کی طرف مائل ہوتا یا خودکشی کی طرف! اس زمانے میں ان کے ہاں ایک بہت باتونی فرانسیسی پروفیسر بھی مقیم تھے جو نہ صرف ہر فن ماہر تھے بلکہ کسی کے سامنے چپ نہ ہوتے تھے۔ مسعود صاحب نے اپنے ادیب دوست سے علیحدگی میں یہ کہا کہ بے چارہ فرانسیسی مدت سے بواسیر میں مبتلا ہے اور اس بارے میں آپ کے تجربات اور مجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور پروفیسر سے کہا کہ میرے ان دوست کو آپ سے کچھ ضروری علمی اور ادبی مشورہ کرنا ہے آپ کل انہیں اپنے ساتھ ہوا خوری کو لے جایئے۔ چنانچہ اس نے خلوص نیت سے انہیں سیر کو چلنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد آئندہ دو

گھنٹے بچارے فرانسیسی پر (جس نے شاید کبھی پہلے بواسیر کا نام بھی نہ سنا تھا) جو گذری اس کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں لیکن اس کا اندازہ آپ خوب کر سکتے ہیں۔ البتہ دونوں کو دیکھنے والے یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ ادیب کی شکل دیکھ کر پروفیسر کو پسینہ آ جاتا تھا۔

ان سے میری دوسری ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے۔ استادوں اور طالب علموں کا ایک جم غفیر ان کے خیر مقدم کے لیے اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ لیکن اس وقت ان سے ملنے کا ارادہ نہ تھا۔ کیوں کہ سوچتا تھا کہ سات سال پہلے کی ایک ملاقات کے بعد وہ اس ہجوم میں کیا پہچانیں گے۔ لیکن انہوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور خود بڑھ کر بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا حافظہ بلا کا تھا جو چہرہ ایک دفعہ دیکھ لیتے، جو نام ایک دفعہ سن لیتے وہ ان کی یاد میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا۔ میں نے کئی مرتبہ اپنی آنکھ سے ان کے حافظہ کا کمال دیکھا کہ ایسے لوگوں کو جن سے وہ صرف ایک مرتبہ پچیس تیس سال پہلے ملے تھے ان کو نہ صرف پہچان لیتے تھے بلکہ بعض دفعہ اس ملاقات کا وقت اور موقع اور ان کے لباس کی تفصیل تک بیان کر دیتے تھے! اس غیر معمولی حافظہ کی بدولت انہیں بیشتر طلبا کے نام اور چہرے یاد رہتے تھے وہ ہر طالب علم سے خلوص اور خصوصیت کے ساتھ ملتے تھے اور طلبا بھی پروانوں کی طرح ان کے گرد رہتے، اور ہمارے محبوب وائس چانسلر، کے نام سے ان کا ذکر کرتے۔ علی گڑھ میں کوئی وائس چانسلر طلبا میں اتنا ہر دلعزیز نہیں ہوا۔ اس کی وجہ محض ان کی خوش کلامی نہ تھی بلکہ یہ ان کے خلوص اور محبت اور اخلاق کا کرشمہ تھا۔ وہ باوجود اعلیٰ مغربی تعلیم پانے کے اپنے میل جول میں قدیم شرافت اور وضعداری کے اصولوں کے قائل اور ان کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان کے دربار میں چھوٹے بڑے امیر غریب سب کے ساتھ ایک برتاؤ ہوتا۔ وہ اپنے پرانے نوکروں سے بھی اس خلوص اور بے تکلفی سے ملتے تھے جس طرح اپنے عزیز اور معزز دوستوں سے بلکہ ان کے ہاں بقول حالی کے:

خاکساروں سے خاکساری تھی

سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

ایک دفعہ حکومت ہند کے کمانڈر انچیف یونیورسٹی دیکھنے آئے۔ مسعود صاحب انہیں یونیورسٹی کے مختلف شعبے اور عمارتیں دکھا رہے تھے۔ جس وقت یونیورسٹی لائبریری سے باہر نکلے سامنے سے فارسی کے ایک معلم آ رہے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مع معزز مہمان اور دوسرے

عمائدین کے سامنے سے آ رہے ہیں تو وہ پلٹ کر جانے لگے۔ مسعود صاحب کی نظر اُن پر پڑی اور فوراً خیال ہوا کہ شاید مولوی صاحب اس وجہ سے لوٹ گئے ہیں کہ یونیورسٹی کا ایک معمولی، کم تنخواہ پانے والا معلم کمانڈر انچیف سے ملنے کے قابل نہیں! فوراً ان کو پکار کر واپس بلایا اور بہت اہتمام کے ساتھ مہمان سے ملایا کہ اردو فارسی کے بہت اچھے عالم ہیں اور یونیورسٹی کے لیے عزت کا باعث ہیں۔ بات بظاہر چھوٹی سی ہے لیکن اگر صحیح قدروں کی ترازو میں تولا جائے تو بہت بڑی ہے۔ کس قدر اہمیت ہے ایک علمی درسگاہ میں اس انداز نظر کی جو علم کو دولت اور منصب سے بلند سمجھے!

سر راس مسعود کو ہر قسم کی تنگ دلی، تعصب اور غرور سے نفرت تھی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، ہندوستانی، انگریز، فرانسیسی، جاپانی ہر نسل و مذہب اور حیثیت کے لوگ ان کے دوستوں میں شامل تھے اور ان کا دل اتنا بڑا تھا کہ اس میں دوستوں، عزیزوں، نوکروں، ملاقاتیوں بلکہ مخالفوں کے دکھ درد کے لیے بھی جگہ تھی۔ علی گڑھ میں کئی سال تک میرا ان کا ساتھ رہا اور میں نے انہیں جلوت اور خلوت دونوں میں دیکھا اور ہمیشہ یہ پایا کہ اس شریف اور دل والے انسان نے کبھی روپے، پیسے، وقت، سفارش، ہمدردی کے معاملے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا دل ضرورت سے زیادہ نازک اور حساس واقع ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مخالفوں کی مخالفت کا گھاؤ ان پر بہت گہرا لگتا تھا۔ اور ان کی طبیعت جمہوری اداروں میں جہاں ہر قسم کی مخالفت جھیلنی ہوتی ہے کام کرنے کے لیے زیادہ موزوں نہ تھی۔ جب انہوں نے بعض حالات سے مجبور ہو کر علی گڑھ چھوڑا تو ملک کے تقریباً سب ہی مشاہیر نے ان کو اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ راضی نہیں ہوئے۔ میں نے بھی ایک روز ہمت کر کے پوچھا کہ آخر آپ اپنی عادت کے خلاف اس معاملے میں اس قدر ضد اور اصرار کیوں کرتے ہیں تو انہوں نے حسرت کے لہجے میں جواب دیا۔ اور مجھے ان کا لہجہ اور الفاظ اب تک یاد ہیں۔ ''سیدین تم نہیں جانتے۔ میرا دل شیشے کی طرح ہے۔ جب ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا اب اس کو کاغذ اور گوند لگا کر نہیں چپکایا جا سکتا۔''

بھوپال جانے کے بعد وہ جب کبھی علی گڑھ آتے ان کی شگفتہ اور دلچسپ صحبت کی نعمت میسر ہوتی اور چند روز کے لیے ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک تھکا ہوا مسافر کچھ دن کے لیے نخلستان میں پہنچ گیا ہو۔ بھوپال میں بھی چند روز ان کے ساتھ ٹھہرنے کا شرف نصیب ہوا۔ میں عمر بھر اس میزبان عزیز کی مہمان نوازی کے لطف اور خلوص و محبت کے سلوک کو نہ بھولوں گا۔ اس زمانے میں ان کا اور لیڈی مسعود کا قیام ریاض منزل میں تھا۔ یہ وہ مکان ہے جس کے دل کش پُر فضا منظر اور ماحول نے اقبال کے تغزل کو باوجود ان کی علالت

کے از سر نو بیدار کر دیا تھا۔ جہاں انہوں نے یہ اشعار لکھے تھے۔

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر، یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماری شب میں
طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی!

راس مسعود اور لیڈی مسعود کی شفقت بھری میز بانی اب ایک حسین خواب معلوم ہوتی ہے۔ وہ مہمان کی پذیرائی میں حد درجہ اہتمام کرتے تھے۔ یہ زمانہ بعض لحاظ سے ان کی مجلسی اور خانگی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ ذاتی افکار سے بہت حد تک نجات پا کر ان کا دماغ بھوپال اور اہل بھوپال کی بہتری کی تدبیریں سوچنے میں مصروف رہتا تھا۔ اپنی علمی اور ادبی دل چسپیوں کی طرف بھی وہ زیادہ توجہ کر سکتے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت کوئی کتاب لینے کے لیے میں نے ان کے کتب خانے کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ آٹھ دس پنڈت بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ان کے گرد بیٹھے ہیں۔ میں نے دریافت کیا۔ سید صاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کی نگرانی میں سنسکرت کی بعض مستند کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا ہے۔ آٹھویں دن یہ سب وِدوان اپنے اپنے ترجمے کر کے لاتے ہیں اور مسعود صاحب ان سب کو پڑھوا کر سنتے اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی علمی اور ادبی دل چسپیاں غیر معمولی طور پر وسیع تھیں۔ حافظؔ، میرؔ، انیسؔ، حالیؔ، اقبالؔ کا بہت سا کلام انہیں حفظ تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی کے ہزاروں اچھے اچھے شعر ان کی زبان پر تھے۔ انیس کے بعض مرثیوں کا ترجمہ انہوں نے انگریزی نظم میں اس قابلیت سے کیا تھا کہ اہل زبان اس کی داد دیتے تھے، ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک خاص شگفتگی اور جدت تھی۔ موسیقی اور مصوری دونوں میں بہت عمدہ مذاق رکھتے تھے اور مشرق اور مغرب کی آرٹ کی تحریکوں سے باخبر تھے۔

ان آخری بے تکلفی کی ملاقاتوں میں ان سے گھنٹوں باتیں ہوئیں۔ ان کے دل میں کیا کیا منصوبے تھے۔ کتنے بڑے بڑے علمی اور ادبی کام کرنے کی امنگ تھی۔ خیالات میں کتنی بلندی اور وسعت تھی۔ دل میں ملک اور قوم کا کتنا درد تھا۔ لوگوں سے کام لینے کی کتنی اچھی صلاحیت تھی۔ ان سے گفتگو کر کے دل شیر ہو جاتا تھا۔ جس قوم میں ایسے انسان موجود ہیں اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ان پر کبھی کبھی اپنے ملک اور قوم کے حالات کو سوچ کر یاس کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ لیکن وہ ایک عارضی کیفیت تھی جو آرٹسٹ مزاج لوگوں پر گاہے گاہے ہوتی ہے۔ اسی موضوع پر گفتگو

کے دوران میں انہوں نے ایک دفعہ مجھے اپنی کتاب ''جاپان کا تعلیمی نظم ونسق'' میں سے مندرجہ ذیل عبارت سنائی تھی جس سے اس گہری محبت کا اندازہ ہوتا ہے جو انہیں اپنے وطن سے تھی۔

''ایک مرتبہ جاپان کے ایک جنگل میں کہ عہد گذشتہ کی یادگاروں سے بھرا ہوا تھا میرے کانوں میں بزرگان قدیم کی صدائیں سرسرانے لگیں۔ یہ صدائیں مجھ سے کہتی تھیں۔ اے وہ کہ ہماری سرزمین میں ایک نووارد ہے اپنے مضطرب دل کو صبر وسکون دے۔ وہ اذیتیں جو آج تیرے حق میں سوہان روح ہیں بہت دن ہمیں بھی تڑپا چکی ہیں فراموش نہ کر کہ صبر مشرق کا ایک بزرگ ورثہ ہے اور صبر اور پرخلوص عمل ہی میں وہ طاقت پنہاں ہے جس کے ذریعے تیرے ہم قوم وہ چیز پیدا کریں گے جس کے پیدا کرنے کے وہ متمنی ہیں۔ یہ نسخۂ اکسیر ہمیں تیرے ہم وطن بودھ نے سکھایا تھا۔ وہی ہم تجھے یاد دلاتے ہیں کیوں کہ تیری قوم نے بظاہر اسے بھلا دیا ہے۔'' صدائیں رک گئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں مغرب کی طرف تکنے لگا جہاں میرا وطن واقع تھا اور جدھر آفتاب کندنی غبار میں آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔''

لیکن ان کی مخصوص صفت جس میں ان کی ہر دل عزیزی کا راز پنہاں ہے ان کے دل اور نظر کی وسعت تھی۔ ذہنی حیثیت سے وہ تہذیب اور تمدن کے ہر شعبے اور مسئلے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کا حساس دل بحر زندگی کی ہر لہر سے متاثر ہوتا تھا۔ جذبات کے لحاظ سے ان کی کشادہ دلی کی کوئی حد نہ تھی۔ حیات انسانی کی مختلف کیفیتیں، رنج ونشاط، خوش دلی اور ظرافت، محبت اور دوستی ان کے لیے انتہائی کشش رکھتی تھیں۔ ان کی ذات شرافت کا سچا نمونہ تھی۔ ان کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے اور اس سے بڑھ کر انسان کی اور کوئی تعریف نہیں ہو سکتی کہ (جیسا میں کہہ چکا ہوں) ان کے دل میں دوسروں کے رنج وراحت کے لیے جگہ تھی۔ وہ ان کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے۔

راس مسعود کو مقابلتہً کم عمری میں کھو کر ہندوستان نے ایک بڑی دولت کھو دی۔ اس دل ودماغ کے لوگ کسی ملک میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی دل کش، شاندار اور شریف شخصیت کی یاد ان کے بے شمار دوستوں اور قدردانوں کے دلوں میں ایک عزیز ترین سرمائے کے طور پر محفوظ رہے گی۔

چراغ حسن حسرت

آغا حشر

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلی مرتبہ آغا حشر کا نام کب سنا؟ صرف اتنا یاد ہے کہ ''ڈراما'' کا نام سننے سے پہلے اس نام سے میری کان آشنا ہو چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میری معلومات میں اتنا اضافہ اور ہوا کہ آغا حشر جو کچھ کہتا ہے اس کا نام ڈراما ہے۔ ڈراما کی اصل کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ ڈراما اور ڈرانا کے معنی میں بہت تھوڑا فرق ہوگا۔

ہمارے پڑوس میں ایک افغان سردار رہتے تھے۔ ان کا ایک نوکر تھا۔ جسے سب ''آغا آغا'' کہہ کے پکارتے تھے۔ بڑے کلے ٹھلے کا دیدارو جوان تھا۔ سیاہ گنجان داڑھی، زلفیں چھٹی ہوئیں۔ وہ جدھر سے گزرتا تھا، لڑکے ''آغا آغا'' کہہ کے اس کے پیچھے دوڑ پڑتے تھے۔ وہ اکثر اوقات تو ہنستا ہوا گزر جاتا۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ چرس کے نشے میں ہوتا۔ لڑکوں کے نعرے سن کے چلتے چلتے رک جاتا۔ اپنی زبان میں چلا چلا کے کچھ کہتا اور سرخ سرخ آنکھیں نکال کے ہماری طرف اس طرح دیکھتا کہ سب سہم جاتے۔

انہیں دنوں ہمارے قصبہ میں ایک اور آغا وارد ہوئے۔ یہ ہینگ بیچنے آئے تھے۔ لمبی داڑھی، بال شانوں پر بکھرے ہوئے، صدری پر میل کی تہہ جمی ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ سے گٹھڑی سنبھالے سڑک پر کھڑے رہتے اور ''اینگ لے لو۔ اینگ لے لو۔'' پکارا کرتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی کسی شخص کو ان سے ہینگ خریدتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کے چلا چلا کر کچھ کہتے۔ غالباً بستی کے لوگوں کو جن میں کوئی ہینگ کا قدر شناس نہیں تھا، گالیاں دیتے ہوں گے۔ اس عالم میں کوئی شخص آنکلتا تو اسے پکار کے کہتے ''خو

اینگ لے لو" اگر وہ چپ چاپ گزر جاتا تو کچھ دیر تک جھک کر خاموش ہو رہتے۔ ورنہ اگر وہ جواب میں کہتا کہ مجھے ہینگ کی ضرورت نہیں۔ تو چلا کے فرماتے "خوام تمہارے باپ کا نوکر ہے۔ کہ تمہارا واسطے اتنی دور سے اینگ لایا۔ اینگ لو۔ ام سے مسخری مت کرو۔"

ہماری پڑوسن بی...... کا خیال تھا کہ یہ موا بردہ فروش ہے۔ ننھے ننھے بچوں کو چرا کے لے جاتا ہے۔ اور بابا خلیل بُو جو موچیوں کے پیر تھے، اس باب میں اُس کے ہم خیال تھے۔

غرض آغا، حشر (۷) اور ڈراما تینوں لفظ میرے نزدیک بہت ڈراؤنے اور بھیانک تھے۔ اور انہوں نے میرے ذہن پر کوئی خوش گوار اثر نہیں چھوڑا۔

پھر جب ہمارے ہاں ایک "ڈرامیٹک کلب" کی بنیاد پڑی۔ اور اسیر حرص، سفید خون، خواب ہستی، ہملٹ کے نام ہر شخص کی زبان سے سنائی دینے لگے، تو آغا حشر کا نام بھی بار بار زبانوں پر آنے لگا۔ اس دور افتادہ مقام میں لے دے کے یہی ایک تفریح تھی۔ اس لئے بوڑھے بچے، جوان سب تھیئٹر دیکھنے جاتے تھے۔ مستری خدا بخش سے جو تھیئٹر کے پردے بھی بناتے تھے۔ اور میلوں میں اپنا ہنڈولا لے کر بھی پہنچ جاتے تھے۔ سہیلیوں تک جن میں اکثر اسکول کے بھاگے ہوئے لڑکے تھے۔ میں سب کو جانتا تھا۔ لیکن ان میں آغا حشر کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آغا حشر پردوں کے پیچھے کھڑا ہے، اس کا سر چھت سے لگا ہوا ہے، لمبی داڑھی ہے، گیسو کمر تک پہنچتے ہیں، ایک ہاتھ میں ہینگ کی گٹھڑی ہے، دوسرے میں جادو کا ڈنڈا۔ اُسی کے حکم سے پردے اُٹھتے اور گرتے اور ایکٹر بھیس بدل بدل کر نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مرتبہ خیال آیا کہ کسی طرح پردے کے پیچھے جا کر اُس کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ لیکن پھر ہمت نہ پڑی۔

میں نے جس زمانے کا ذکر کیا ہے۔ ابھی ہندوستان میں فلموں کا رواج نہیں تھا۔ جو کچھ تھا تھیئٹر ہی تھیئٹر تھا۔ اور اس دنیا میں آغا حشر کا طوطی بول رہا تھا۔ یوں تو اور بھی اچھے اچھے ڈراماٹسٹ موجود تھے۔ احسن، بیتاب، طالب، مائل سب کے سب ناٹک کی لنکا کے باون گزے تھے۔ لیکن آغا کے سامنے بونے معلوم ہوتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آغا سے پہلے اس فن کی قدر بھی کیا تھی؟ بچارے ڈراماٹسٹ تھیئٹر کے "منشی" کہلاتے تھے۔ اور یہ لقب اتنا ذلیل ہو چکا تھا کہ تھانہ کے محرر، نہر کے پٹواری، ساہوکاروں اور تاجروں کے گماشتے بھی اسے اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہچکچاتے تھے۔

---

(۷) لفظ "حشر" سے جس قسم کے تصورات وابستہ ہیں ان کے متعلق میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ کشمیری زبان میں "حشر" گالی ہے۔

پنجاب میں اگرچہ تھیئٹر نے چنداں ترقی نہیں کی۔ اور یہاں منشی غلام علی دیوانہ اور ماسٹر رحمت کے کینڈے کے لوگ اس فن میں سندالوقت سمجھے جاتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں جب مجھے پہلی مرتبہ لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو یہاں آغا حشر کی شاعری کی دھوم تھی۔ جن لوگوں نے انہیں انجمن حمایت اسلام میں نظمیں پڑھتے دیکھا تھا۔ وہ ان کے انجمن کے جلسے میں آنے اور نظم سنانے کی کیفیت اس ذوق شوق سے بیان کرتے تھے گویا کربلائے معلی کے محرم کا حال بیان کر رہے ہیں۔ ''موجِ زمزم'' اور ''شکریہ یورپ'' کے اکثر اشعار لوگوں کو زبانی یاد تھے۔ اور انہیں آغا کی طرح مٹھیاں بھینچ کر گونجیلی آواز میں پڑھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔

اگرچہ آغا اپنے عروجِ شباب کے زمانے میں صرف ایک مرتبہ پنجاب آئے۔ لیکن اُن کا یہ آنا عوام وخواص دونوں کے حق میں قیامت تھا۔ یعنی جو ثقہ حضرات ڈراما کو بدوضع اور آوارہ لوگوں سے مخصوص سمجھتے تھے۔ اُن کی رائے اس فن کے متعلق بدل گئی۔ اور کیوں نہ بدلتی؟ اسی گروہ کے ایک شخص نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں جو اُن دنوں ایک قومی میلہ سمجھا جاتا تھا۔ ایسی نظم پڑھی کہ روپے پیسے کا مینہ برس گیا۔ اور جو کام بڑے بڑے عالموں سے نہ ہو سکا، اس نے کر دکھایا۔

یہ تو خواص کا حال تھا۔ آغا کے لاہور آنے نے عوام کے مذاق پر بھی اثر ڈالا۔ اور جو لوگ ماسٹر رحمت کی غزلوں پر سر دھنتے اور ان کے ڈراموں کو اس فن کی معراج سمجھتے تھے وہ بھی یک بیک چونک پڑے۔ اور انہوں نے جان لیا کہ اس فن میں اس سے اُونچا کوئی مقام بھی ہے۔ اور ماسٹر رحمت سے بہتر ڈراماٹسٹ بھی دنیا میں موجود ہیں۔

میں ۱۹۲۵ء میں کلکتہ گیا تو آغا صاحب کلکتہ چھوڑ مہاراجہ نکاری کے ہاں جا چکے تھے۔ لیکن اُن کے ہزاروں مداح، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کلکتہ میں موجود تھے۔ اُن کی زبانی آغا کی زندگی کے اکثر واقعات، ان کے لطیفے، اشعار، پھبتیاں سنیں۔ کوئی سال بھر کے بعد ایک دن کسی نے آ کر کہا، کہ آغا آئے ہیں۔ فائن آرٹ پریس والے لالہ برج لال اروڑہ آغا کے بڑے عقیدت مند تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، کہ ''آغا آگئے۔ اُن سے کب ملوائیے گا؟'' وہ کہنے لگے۔ ابھی چلو۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں نے رسالہ آفتاب کے کچھ پرچے بغل میں دبائے۔ لالہ برج لال نے ٹوپی ٹیڑھی کر کے سر پر رکھی اور بخط مستقیم آغا کے ہاں پہنچے۔ وہ ان دنوں سکی اسٹریٹ میں رہتے تھے۔ بڑا وسیع مکان تھا۔ ڈیوڑھی سے داخل ہوتے ہی صحن تھا۔ اُس کے دہنے بائیں کمرے۔ لالہ برج لال نے اُن کے نوکر سے پوچھا۔ ''آغا

صاحب کہاں ہیں؟'' اس نے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ صحن سے ملا ہوا ایک وسیع کمرہ تھا۔ اُس میں ایک چارپائی اور دو تین کرسیاں پڑی تھیں۔ چارپائی پر آغا صاحب صرف لنگی باندھے اور ایک کرتا پہنے لیٹے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ہینگ والے آغا اور اس آغا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سر پر انگریزی فیشن کے بال، داڑھی منڈی ہوئی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، دہرا جسم، سرخ و سپید رنگ، میانہ قد، ایک آنکھ میں نقص تھا۔ محفل میں بیٹھے ہوئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ پہلے لالہ برج لال سے خیر و عافیت پوچھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور ادبی ذکر و افکار چھڑ گئے۔

آغا صاحب نے اگرچہ ہزاروں کمائے اور لاکھوں اڑائے لیکن اُن کی معاشرت ہمیشہ سیدھی سادی رہی۔ مکان میں نہ نفیس قالین تھے، نہ صوفے، نہ کوچ، نہ ریشمی پردے، نہ غالیچے۔ نفیس کپڑے پہننے کا بھی شوق نہ تھا۔ گھر میں ہیں تو لنگی باندھے، ایک بنیان پہنے۔ کھری چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ باہر نکلے ہیں تو ریشمی لنگی اور لمبا کرتا پہن لیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُنہیں اسی وضع میں دیکھا۔ اور زندگی کے آخری ایام میں جب لاہور آئے۔ ان کی یہی وضع تھی۔ ہاں اکثر لوگوں سے اتنا سنا ہے کہ لاہور آنے سے پہلے وہ کلکتہ میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ لیکن اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس زمانے میں انہوں نے شراب چھوڑ دی تھی اور گھر کی آرائش اور ٹھاٹھ باٹھ میں طبیعت کے حوصلے نکال کے اس کمی کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔

آغا بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج شخص تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے۔ سب پر چھا جاتے تھے۔ اُن کے ملنے والوں میں اکثر لوگ ضلع جگت میں طاق اور پھبتی میں مشاق تھے۔ اور جب شام کو صحبت گرم ہوتی، تین تین چار چار آدمی مل کے آغا پر پھبتیوں کا جھاڑ باندھ دیا کرتے تھے۔ لیکن آغا چومکھی لڑنا جانتے تھے۔ حریف دم بھر میں ہتھیار ڈال دیتا لیکن آغا کی زبان نہ رکتی تھی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بانکا پھکیت سر دہی کے ہاتھ پھینکتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی کمر کو بتا کے سر پر وار کیا، کبھی پالٹ کا ہاتھ مارا، کبھی دہنے سے کبھی بائیں سے۔ اس فن میں اُن کا کوئی حریف نہیں تھا۔ البتہ حکیم (۸) صاحب سے آغا کی بھی کور دبتی تھی۔

جس شخص سے بے تکلفی بڑھانا منظور ہوتا۔ اسے اس بے ساختگی سے گالی دے بیٹھتے تھے کہ بچارا حیران رہ جاتا تھا۔ ''گالی'' کا نام سن کر کچھ لوگ کہیں گے کہ گالی دینا کہاں کا اخلاق؟ لیکن آغا کنجڑے

---

(۸) شفاءالملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی مرحوم جو آغا مرحوم کے جگری دوست تھے۔

قصابوں جیسی گالیاں تھوڑے ہی دیتے تھے۔ انہوں نے "گالی" کو ادب وشعر سے ترکیب دے کر ایسی خوش نما چیز بنا دیا تھا کہ مرحوم اگر کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو اس کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہونے لگتا۔ اصل میں آغا ایک تو یوں بھی بڑے ذہین اور طباع شخص تھے۔ پھر انہوں نے جوانی میں ہی تھیئٹر کی طرف توجہ کی جہاں دنیا بھر کے بگڑے دل جمع تھے۔ رات بھر نوک جھونک کا بازار گرم رہتا تھا۔ کچھ تو ان صحبتوں میں اُن کی طبیعت نے جلا پائی۔ اس پر مطالعہ کا شوق سونے پر سہاگہ ہو گیا۔

وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ادنیٰ قسم کے بازاری ناولوں، اخباروں، رسالوں سے لے کر فلسفہ اور مابعد الطبعیات کی اعلیٰ تصانیف تک سب پر ان کی نظر تھی۔ اور فضل بک ڈپو سے دار المصنفین تک وہ سارے اداروں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ کلکتہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ سہ پہر کو گھر سے نکلے اور بخط مستقیم اخبار عصر جدید کے دفتر میں پہنچے۔ پہلے سارے اخبار پڑھے، پھر رسالوں کی نوبت آئی۔ کبھی ریویو کے لئے کوئی کتاب آ گئی تو وہ بھی آغا صاحب کی نذر ہوئی۔ کچھ اخبار اور رسالے تو وہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لئے۔ جو بچ رہے انہیں گھر لے گئے۔ بازار میں چلتے چلتے کتابوں کی دکان نظر آ گئی، کھڑے ہو گئے۔ اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کے بغل میں دبائیں اور چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں کسی کتاب کا کوئی گرا پڑا ورق دکھائی دیا تو اسے اٹھا لیا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑھ ڈالا۔ نوکر بازار سے سودا سلف لے کر آیا ہے، بنئے نے اخباروں اور کتابوں کے اوراق میں پڑیاں باندھ کے دی ہیں۔ یکایک آغا صاحب کی نظر پڑ گئی۔ نوکر سے پوچھ رہے ہیں اس پڑیا میں کیا ہے؟ شکر! اچھا شکر ڈبے میں ڈالو۔ پڑیا خالی کر کے لاؤ۔ اسے کہیں پھینک نہ دیجیو، یہ بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ خدا جانے کسی اخبار کے ورق ہیں یا کتاب کے، بہر حال مجھے ان پر شبلی کا نام لکھا نظر آیا ہے۔

مطالعہ سے ان کے اس شغف کا حال سن کر شاید بعض لوگوں کا خیال ہو کہ آغا نے بہت بڑا کتب خانہ جمع کر لیا ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ چھوڑ ان کے ہاں دس پانچ کتابیں بھی نہیں تھیں۔ ایک تو ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھ لیتے تھے تو اسے دوسری مرتبہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ دوسرے ان کی طبیعت علائق سے گھبراتی تھی۔ کتابیں سینت سنبھال کے رکھنے کے جھنجھٹ میں کون پڑے۔ ان کا تو بس یہ حال تھا کہ کتاب آئی، پڑھ کے مکان کے کسی گوشے میں ڈال دی۔ کوئی ملنے والا آیا اور اٹھا کے لے گیا۔

یہ اسی مطالعہ کی برکت تھی کہ ان کی معلومات پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ طب ہو یا فلسفہ، شاعری

ہو یا ادب۔ کسی موضوع میں بند نہیں تھے۔ اور جہاں علم ساتھ نہیں دیتا تھا وہاں ان کی ذہانت آڑے آ جاتی تھی۔ بازار سے نئی جوتی منگوائی ہے۔ کسی نے پوچھا آغا صاحب کتنے کو مول لی ہے؟ بس آغا صاحب نے جوتی کے فضائل اور محاسن پر تقریر شروع کر دی۔ چمڑے کی مختلف قسموں، دباغت کے طریقوں، جوتی کی وضع قطع، ایک ایک چیز پر اس تفصیل سے بحث کر رہے ہیں گویا کسی نہایت اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو سننے والوں کو یہ احساس تھا کہ آغا صاحب کی جوتی کو سچ مچ تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

ایک دن آغا عصر جدید کے دفتر بیٹھے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ آغا باتیں کر رہے تھے۔ ہم سب بُت بنے بیٹھے سن رہے تھے۔ اتنے میں سید ذاکر علی جو ان دنوں کلکتہ خلافت کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ اور آج کل مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری ہیں، پھرتے پھراتے آ نکلے۔ تھوڑی دیر وہ چپکے بیٹھے آغا کی باتیں سنا کئے۔ لیکن پھر ان کے چہرے سے بے چینی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کچھ تو انہیں یہ بات ناگوار گزری کہ ایک شخص بیٹھا باتیں کئے جا رہا ہے اور کسی دوسرے کو بات نہیں کرنے دیتا۔ کیونکہ سید صاحب خود بھی بڑے بذلہ سنج اور لطیفہ گو بزرگوار ہیں اور انہوں نے اگلے پچھلے ہزاروں لطیفے یاد کر رکھے ہیں اور غالباً اس وقت انہیں کوئی نیا لطیفہ یاد آ گیا تھا جسے سنانے کے لئے وہ بے قرار تھے۔ دوسرے آغا کی گفتگو میں خودستائی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ اور وہ اپنی شاعری کا تذکرہ کر رہے تھے اور اپنے بعض ہمعصر شعراء پر چوٹیں بھی کرتے جاتے تھے۔ سید ذاکر علی کو ان کی باتوں پر غصہ بھی تھا اور حیرت بھی۔ جی ہی جی میں کہہ رہے تھے کہ خدا جانے یہ کون شخص ہے جو اقبال، ابوالکلام، ظفر علی خاں کا ذکر اس انداز میں کر رہا ہے گویا سب ساتھ کے کھیلے ہوئے دوست اور بچپن کے رفیق ہیں۔ آخر ان سے ضبط نہ ہو سکا اور کہنے لگے۔ ''یہ کون بزرگوار ہیں۔ ذرا ان سے میرا تعارف تو کرا دیجئے۔'' مولانا شائق بولے ''آپ انہیں نہیں جانتے۔ آغا حشر یہی ہیں۔ آغا صاحب یہ سید ذاکر علی ہیں۔ کلکتہ خلافت کمیٹی کے نئے سیکرٹری۔ مولانا شوکت علی نے انہیں بمبئی سے بھیجا ہے۔''

ہم سمجھتے تھے کہ اس معرفی کے بعد سید ذاکر علی کا استعجاب دور ہو جائے گا لیکن وہ بڑی سادگی سے کہنے لگے ''آغا حشر؟ کون آغا حشر؟'' بس ان کا یہ کہنا قیامت ہو گیا۔ آغا صاحب کڑک کر بولے۔ ''آپ نے آغا حشر کا نام نہیں سنا۔'' سید ذاکر علی نے جواب دیا۔ ''نہیں صاحب! میں نے آج پہلی مرتبہ جناب کا نام سنا ہے۔'' پھر پلٹ کے مولانا شائق سے پوچھنے لگے۔ ''آغا صاحب کا شغل کیا ہے؟'' مولانا

شائق نے فرمایا۔ ''ہائیں سید ذاکر علی صاحب! آپ نے واقعی آغا حشر کا نام نہیں سنا۔ آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟'' انہوں نے بڑی مسمسی صورت بنا کے کہا۔ ''مجھ سے قسم لے لیجئے۔ میں نے آج تک یہ نام نہیں سنا۔'' خدا جانے وہ بن رہے تھے یا واقعی انہوں نے آغا کا نام نہیں سنا تھا۔ ہم سب کو حیرت تھی کہ یہ شخص کلکتہ خلافت کمیٹی کا سیکرٹری مدتوں اہل ذوق کی صحبت میں رہ چکا ہے۔ شعر وشاعری کا بھی مذاق رکھتا ہے لیکن آغا حشر کو نہیں جانتا۔ خیر مولانا شائق احمد نے انہیں سمجھایا کہ دیکھئے یہ آغا حشر ہیں۔ بہت بڑے شاعر، بہت بڑے ڈراماٹسٹ۔ لوگ انہیں ہندوستان کا شیکسپیئر کہتے ہیں۔ تو ان کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اور کہنے لگے۔ ''اچھا تو آپ شاعر ہیں۔ میں اب سمجھا۔ خیر اب اس بحث کو جانے دیجئے اپنا کوئی شعر سنایئے۔'' آغا بھرے بیٹھے تھے۔ یہ سن کے آگ بگولا ہو گئے۔ اور کہنے لگے'' سنئے جناب! آپ کو شعر سننا ہے تو خلافت کمیٹی کے لونڈوں سے سنئے۔ میں ایسا ویسا شاعر نہیں کہ ہرایرے غیرے پچ کلیان کو شعر سنا تا پھروں۔'' پھر جو انہوں نے تقریر شروع کی تو اللہ دے اور بندہ لے۔ ہمارا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اور سید ذاکر علی پر تو سینکڑوں گھڑے پانی کے پڑ گئے۔

ایک سید ذاکر علی پر کیا موقوف ہے۔ آغا مناظرہ کے میدان کے شیر تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے، سب پر چھا جاتے تھے۔ با قاعدہ تعلیم تو واجبی تھی۔ لیکن مطالعہ نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ایک دن میں نے کہا۔ آغا صاحب جی چاہتا ہے آپ کے سوانح حیات لکھ ڈالوں۔ کہنے لگے۔ ''میرے سوانح حیات میں کیا پڑا ہے۔

حاصل عمرم سہ حرف است و بس
خام بدم پختہ شدم سوختم

بزرگوں کا وطن کشمیر ہے۔ وطن میں ان پر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ امرت سر اٹھ آئے۔ وہاں سے والد مرحوم شالوں کی تجارت کے سلسلہ میں بنارس پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ ہر چند انہوں نے میری تعلیم میں سعی کی لیکن جی نہ لگا۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر چھوڑ دیں۔ وہ پرانی وضع کے آدمی تھے اور مجھے ملائے مکتبی بنانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے ملائیت سے نفرت تھی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں کہ بنارس سے بھاگ کر بمبئی پہنچا۔ وہاں پارسیوں نے تھیئٹر کا ایسا طلسم باندھ رکھا تھا کہ ادنیٰ واعلیٰ سب اس پر غش تھے۔ میں نے بھی ڈرامہ لکھنے کو ذریعہ معاش بنایا اور ایک دو ڈرامے لکھ کر شیکسپیئر پر ہاتھ صاف کیا۔ اگر چہ ان دنوں بمبئی میں بڑے بڑے انشاء پرداز اور شاعر موجود تھے۔ لیکن خدا کی قدرت کہ تھوڑے دنوں میں سب

گردہو گئے۔لومیرے سوانح حیات کا بہت بڑا حصہ تو چند لفظوں میں ختم ہو گیا۔''

ایک دن کہنے لگے۔''تمہیں معلوم ہے۔ جوانی کے زمانے میں ہمارے دوست کون کون لوگ تھے؟''میں نے کہا۔''نہیں!'' کہنے لگے۔''بزرگوں میں مولانا شبلی مرحوم،نو جوانوں میں ابونصر غلام یٰسین آہ، یہ تمہارا ابوالکلام اور حکیم فقیر محمد چشتی۔لیکن بھائی میں نے ابونصر آہ جیسا ذہین آدمی نہیں دیکھا۔جانتے ہو آہ کون تھا؟ابوالکلام کا بڑا بھائی۔ بچارے نے جوانی میں انتقال کیا۔زندہ رہتا تو لوگ ابوالکلام کو بھول جاتے۔آہ نے وفات پائی۔ابوالکلام اور میں دونوں برسوں سے ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔لیکن سلام و کلام تک ترک ہے۔''

پھر کچھ دیر خاموش رہ کے بولے۔''وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔میں ڈرامے بھی لکھتا تھا،شراب میں پیتا تھا، نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔لیکن دینی حرارت سے دل گداز تھا۔آریہ اور عیسائی اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور میں اور ابوالکلام انہیں جواب دیتے تھے۔اسی شوق میں مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھیں۔ آریوں اور عیسائیوں کے رد میں رسالے لکھے،مناظرے کئے،اور جس دنگل میں اترا فتح پائی۔ان دنوں پادری احمد مسیح کا بڑا زور تھا۔ایک تو اندھا دوسرے حافظ قرآن۔کترنی کی طرح زبان چلتی تھی۔وہ دلی میں فوارہ پر اکثر تقریریں کیا کرتا تھا۔میرے اور اس کے کئی معرکے ہوئے اور ہمیشہ میدان میرے ہی ہاتھ رہا۔وہ کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا صرف مجھ سے اس کی کور دبتی تھی۔اکثر مناظروں میں تو تکار تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔میں اس پر پھبتیاں کہتا تھا وہ مجھ پر۔ایک دفعہ پادری احمد مسیح بمبئی آیا اور ایک دو معرکے کی تقریریں کیں۔ان دنوں میرے قیام کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔کبھی کلکتہ کبھی دلی۔لیکن اتفاق یہ ہوا کہ احمد مسیح کو بمبئی آئے صرف دو دن ہوئے تھے کہ میں بھی پہنچا۔لوگوں نے مجھے مناظرہ کے لئے کہا۔میں نے کہا۔میں چلنے کو تو تیار ہوں لیکن اسے میرا نام نہ بتانا۔غرض وہ مجھے لے گئے اور احمد مسیح سے صرف اتنا کہا کہ ایک مولوی صاحب مناظرہ کرنے آئے ہیں۔لیکن میں نے تقریر شروع کی تو وہ آواز پہچان کر بولا۔''آغا صاحب ہیں۔''میں نے کہا۔''جی ہاں!''وہ کہنے لگا۔''ارے کسی مولوی کو لائے ہوتے۔اس بھانڈ کو کیوں لے آئے؟''میں بولا۔''پادری صاحب کسی بھلے مانس کے ہاں کتا گھس آئے۔تو خود اٹھ کے اسے نہیں دھتکارتا۔بلکہ نوکر سے کہتا ہے۔کہ اسے نکال دو۔پھر تمہارے مقابلہ پر کوئی مولوی کیوں آئے؟''پادری چیخ کے بولا۔''یہ مجلس مناظرہ ہے یا بھانڈوں کی منڈلی؟''میں نے کہا۔''بھانڈوں کی منڈلی سہی۔لیکن ان میں چت خورے تم ہو۔''پادری نے کہا۔''ارے تو تو تھیٹر کا نچینا ہے۔تجھ سے کون

زبان لڑائے؟'' میں نے کہا۔''اب تمہیں تھیٹر میں نچاؤں گا۔'' غرض میں نے مارے پھبتیوں کے اُلو کر دیا۔ اور وہ صاف انکار کر گیا کہ میں آغا سے بحث نہیں کرتا۔

اکثر لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی کہ آغا خود اپنی تعریفیں کرتے ہیں اور اپنے سامنے سب کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ لیکن آغا صاحب کا خیال تھا کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی تعریف کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک مرتبہ کسی اخبار میں میری ایک نظم جو غالباً عید کے متعلق تھی، شائع ہوئی۔ آغا نے اخبار دیکھا تو نظم کی بڑی تعریف کی۔ خصوصاً آخری شعر کئی مرتبہ پڑھا اور پھر بولے ''اماں تم بہت خوب کہتے ہو۔ اس سے اچھا کوئی کیا کہے گا؟'' میں نے کہا۔''آغا صاحب آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ میں کیا اور میری نظم کیا؟'' کہنے لگے۔''کیا کہا؟ ہم تعریف کرتے ہیں اور تم اپنی مذمت سننا چاہتے ہو۔ اچھا صاحب یوں ہی سہی۔ نظم بہت بُری ہے۔ تم نے جھک ماری جو یہ نظم لکھی اور ہم نے جھک ماری جو تمہاری تعریف کی۔ کہو کہو۔ اس ہیچ مدان پنبہ دہان، کج مج زباں، حقیر فقیر سراپا تقصیر کو کیا شعور ہے کہ نظم لکھ سکے۔ حضور کی ذرہ نوازی ہے اور سیدھی سادی زبان میں یہ مضمون ادا کرنا چاہو تو کہو میں نے یہ نظم نہیں لکھی اور تم جھوٹے جو اس کی تعریف کر رہے ہو۔ ارے بھائی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تمہارے انکسار کا یہی حال رہا تو فاقے کرو گے۔ سینہ تان کے کیوں نہیں کہتے کہ جی ہاں میری نظم تعریف کے قابل ہے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ ترکی حور لکھ کے رستم جی کو سنایا۔ سب نے واہ واہ کی۔ لیکن سرگوشیاں بھی برابر ہو رہی تھیں۔ حریف اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو ایسی اکھیڑ ماریں کہ آغا چاروں شانے چت جا گرے۔ اتنے میں کڑک کے کہا۔ کون ہے جو آج ایسا ڈرامہ لکھ سکے؟ یہ سن کے سب کے سر جھک گئے۔ اور ہر طرف سے آوازیں آئیں۔ پیر و مرشد، بجا و درست۔''

آغا سے یہ بات سن کے مجھے ہمیشہ کے لئے کان ہو گئے۔ اگرچہ میں ان کی طرح اپنی تعریفیں آپ نہیں کرتا۔ لیکن کوئی تعریف کرے تو یہ بھی نہیں کہتا کہ حضرت میں تو بالکل جاہل ہوں۔

آغا جوانی سے شراب کے عادی اور روز کے پینے والے تھے۔ دن ڈھلتے ہی پینا شروع کر دیتے تھے اور بہت مدت گئے تک یہ محفل جمی رہتی تھی۔ ان محفلوں میں جب کہیں کوئی تھیٹر اور ڈرامے کا ذکر چھیڑ دیتا تھا تو بچارے شیکسپیئر کی شامت آ جاتی تھی۔ لیکن شیکسپیئر غریب کی گت صرف انہیں محفلوں میں بنتی تھی ورنہ عام طور پر آغا اس کا ذکر ہمیشہ عزت واحترام سے کرتے تھے۔

وہ چھپ کے پینے کے قائل نہیں تھے۔ سب کے سامنے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بیچ کھیت پیتے تھے

اور بوتلوں کی بوتلیں خالی کر دیتے تھے۔ لیکن موت سے کوئی تین سال پیشتر شراب ترک کر دی۔ یوں دفعتہ شراب چھوڑ دینے سے اُن کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ رنگت سنولا گئی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے، ہڈیاں نکل آئیں۔ اور ایسا روگ لگا جو آخر اُن کی جان لے کر ہی ٹلا۔ ڈاکٹروں نے ہر چند کہا۔ کہ اس حالت میں آپ کے لیے شراب کا استعمال مفید ہے۔ تھوڑی مقدار میں روز پی لیا کریں لیکن اُنہوں نے نہ مانا اور مرتے مر گئے۔ شراب نہ پی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس حالت میں بھی اُن کا کوئی پرانا دوست آ جاتا تھا تو اسے شراب منگوا کے اپنے سامنے پلواتے۔ اس کی باتیں سن سن کر ہنستے۔

آغا ہاتھ کے سخی تھے اور دل کے صاف۔ اُن کے ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ تھیئٹر کے ایکٹروں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے لے کر بڑے بڑے اہل علم تک سب سے ان کی بے تکلفی تھی۔ اور وہ ان سب سے بڑے خلق اور مروت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود کو یہ بات ناگوار تھی کہ آغا چھوٹی اُمت کے لوگوں سے کیوں بے تکلفی سے ملتے ہیں۔ لیکن اُن کے جن لوگوں سے جس قسم کے تعلقات تھے انہیں مرتے دم تک نبھائے چلے گئے اور وضع داری میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ ہر شخص سے اُس کی لیاقت اور مذاق کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ عالموں میں بیٹھے ہیں تو حدوث وقدم مادہ کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ یا احادیث کی حیثیت پر بحث کر رہے ہیں۔ اسلام، عیسائیت اور آریہ سماج کے اصولوں پر تقریریں کی جا رہی ہیں۔ ایکٹروں میں جا پہنچے تو ضلع جگت شروع ہو گئی۔ پھبتیاں کہی جا رہی ہیں، قہقہے اُڑ رہے ہیں۔

آغا نے اگرچہ لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی اڑائے لیکن وہ تنہا خوری کے عادی نہیں تھے۔ جب روپیہ آتا تھا اس میں سب عزیزوں کے حصے لگائے جاتے تھے۔ قریب کے رشتہ داروں کو تو انہوں نے ہزاروں لاکھوں دے ڈالے۔ والدہ کی ایسی خدمت کی کہ کوئی کیا کرے گا۔ لیکن دور کے رشتہ داروں کو بھی وہ کبھی نہ بھولے۔ اُن کے عزیزوں میں کئی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے تھے۔ ان سب کے درماہے مقرر تھے۔ روپیہ آتا تھا تو جس کا جو حصہ مقرر تھا اُسے گھر بیٹھے پہنچ جاتا تھا۔ غرض آغا کی ذات کئی بے کسوں کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ ان کے اُٹھتے ہی یہ سہارا مٹ گیا۔

آغا کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ وہ اکثر بیٹے کی بے قیدی اور آزادہ روی دیکھ دیکھ کے بہت کڑھتے تھے۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم فرماتے تھے کہ جب آغا لاہور آئے۔ مولانا ظفر علی خاں کے ہفتہ وار اخبار ستارۂ صبح میں ان کی ایک نظم چھپی۔ جس کا روئے سخن اگرچہ خواجہ حسن نظامی کی

طرف تھا لیکن جگہ جگہ تمام صوفیوں پر چوٹیں کی گئی تھیں۔ حکیم صاحب مرحوم تو ایک ہی زندہ دل بزرگ تھے۔ انہوں نے آغا کو دق کرنے کے لئے اُن کے والد کو یہ نظم پڑھ کر سنائی۔ اور کہا کہ دیکھئے آپ کا صاحبزادہ اب صوفیوں پر طعن کرنے لگا۔ وہ یہ نظم سن کر بیٹے پر بہت بگڑے پھر کہنے لگے۔ دیکھ لینا بڑھاپے میں یہ اُن تمام حرکتوں سے توبہ کرلے گا۔ معلوم نہیں آخری عمر میں صوفیوں کے متعلق آغا صاحب کا کیا عقیدہ تھا۔ البتہ اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ موت سے پہلے انہوں نے شراب سے توبہ کرلی۔

آغا کے کلام اور اُن کے ڈراموں پر تبصرہ کرنا میرا فرض نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ شعر بہت جلد کہتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے بعد اگر میں نے کسی کو اس قدر جلد شعر کہتے دیکھا تو وہ آغا تھے۔ شعر خود نہیں لکھتے تھے بلکہ دوسروں کو لکھوا دیتے تھے۔ ڈراموں کا بھی یہی حال تھا۔ اصل میں انہیں لکھنے سے نفرت سی تھی۔ عمر بھر کبھی کسی کو خط کا جواب نہیں دیا اور جواب دیا بھی تو اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔

کئی موقعوں پر ایسا ہوا کہ میں نے ایک مصرع پڑھا۔ انہوں نے برجستہ دوسرا مصرع کہہ دیا۔ اور چند منٹوں میں غزل ہوگئی۔ اُن کی غزلوں میں ایک خاص سرمستی اور جوش ہے جو اردو میں اُن کے سوا کسی کے ہاں نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا اثر اُن کے ڈراموں پر بھی پڑا ہے۔ یعنی جس طرح غزل میں ہر شعر مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اُسی طرح اُن کے ڈراموں کے مختلف اجزاء تو اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آپس میں مل کر وہ اپنا حسن کسی حد تک کھو بیٹھے ہیں۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ آغا کے ڈراموں کا حسن اجزا میں ہے کل میں نہیں۔ اسی مفہوم کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ مکان کا گارا، چونا، اینٹیں اور لکڑی تو اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں۔ لیکن جب ان سے مل کر مکان بنتا ہے تو اس میں بہت سے نقص نظر آتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اردو ڈرامے کو بہت اونچے مرتبہ پر پہنچادیا اور اس معاملہ میں اُن کا کوئی حریف نہیں تھا۔

وہ خود بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ میں لوگوں سے مذاق کو ملحوظ رکھ کر ڈرامے لکھتا ہوں۔ ورنہ اگر میں عوام کے مذاق کی پروانہ کر کے اپنے اصلی رجحان طبیعت کے مطابق کچھ لکھوں تو اور ہی عالم نظر آئے۔ میں نے ایک مرتبہ کہا کہ آغا صاحب آپ اپنی طبیعت کے حقیقی جوش کو ظاہر کیوں نہیں ہونے دیتے اور عوام کے مذاق کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں؟ یہ سن کر آغا کے ابرو پر بل پڑ گئے اور کہنے لگے کہ اگر میں اپنی طبیعت کے صحیح رجحان کی پیروی کرتا تو جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ وہ تو بڑی خیر گزری کہ میں زمانے کی نبض کو پہچان لیا۔ لوگوں کے مذاق کے مطابق ڈرامے لکھتا ہوں اور موٹروں میں اُڑا پھرتا ہوں۔

۱۹۲۸ء کے اواخر میں آغا حشر نکاری سے کلکتہ آئے ہوئے تھے کہ ایک دن میں اُن سے ملنے گیا۔ پہلے تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر کہنے لگے "ارے میاں اس اخبار نویسی میں کیا پڑا ہے۔ اسے چھوڑو اور میرے ساتھ نکاری چلو۔ ڈرامہ لکھنے میں برق نہ کردوں تو میرا ذمہ۔" میں نے اس وقت تو کہہ دیا۔ کہ اچھا آغا صاحب یوں ہی سہی۔ مگر گھر آ کے سوچا تو خیال آیا کہ اب تو آغا صاحب سے نیاز مندانہ تعلق ہے۔ ملازمت کا قصہ ہوگا تو اور بات ہو جائے گی۔ کیا عجب کہ کسی بات پر ان سے بگڑ جائے اور جو صاحب سلامت آج ہے یہ بھی نہ رہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ آغا سے اقرار کر چکا تھا۔ اب انکار کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اتفاقاً اسی درمیان کچھ ایسے پیچ پڑے کہ میں نے کلکتہ چھوڑ لاہور آنے کا تہیہ کر لیا۔ چلنے سے پہلے ایک دن آغا سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے نکاری چلتے ہونا؟ میں نے کہا۔ میں تو لاہور جانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ وہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے۔ میرے ساتھ لاہور اور لاہور کے اخباروں اور اخبار نویسوں کو بھی لے ڈالا۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا اُن کی باتیں سنتا رہا پھر اٹھ کر چلا آیا۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ آغا نکاری چلے گئے۔

کوئی سات سال کے بعد پھر آغا سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ میں حکیم فقیر محمد مرحوم کے ہاں ملنے گیا تو وہ چھ سات آدمیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ لیکن میں نے بالکل انہیں نہیں پہچانا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے، گالوں میں گڑھے، ہڈیاں نکلی ہوئیں، گردن کا گوشت لٹکا ہوا۔ پہلے کچھ دن حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے پھر شہر کے باہر ایک کوٹھی کرایہ پر لی اور وہاں اٹھ گئے۔ میں کبھی کبھی وہاں جاتا تھا۔ اگرچہ اب بھی ان کی طبیعت اور وضعداری کا وہی عالم تھا لیکن یک لخت شراب چھوڑ دینے سے جہاں انہیں امراض نے آ گھیرا تھا وہاں طبیعت میں وہ اگلی سی جودت بھی نہیں رہی تھی۔ البتہ وہ کبھی نہیں مانتے تھے کہ شراب چھوڑ دینے سے اُن کے دماغ پر کوئی اثر پڑا ہے۔ میں نے اس بات کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ تم غلط کہتے ہو۔ میں نے جب سے شراب چھوڑی ہے میری طبیعت زیادہ رواں ہوگئی ہے۔

ایک دن میں میکلوڈ روڈ سے گزر رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔ مڑ کر کیا دیکھتا ہوں۔ کہ آغا صاحب ایک دکان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا "آپ یہاں کہاں؟" فرمانے لگے۔ "آج مجھے امرت سر جانا ہے اور موٹر خراب ہوگئی ہے اس کی مرمت کرانے یہاں بیٹھا ہوں۔" پھر بولے۔ "یہ کیا حرکت ہے۔ تم ہمارے ہاں آتے کیوں نہیں؟" میں نے کہا "آغا صاحب فرصت نہیں ملتی" بولے۔ "چل چلاؤ لگ رہا ہے ہم مر جائیں گے تو افسوس کرو گے۔ کہ آغا سے اس کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی نہ ملے"

میں نے کہا۔ ''آغا صاحب کل ضرور حاضر ہوں گا۔'' فرمانے لگے۔ ''آج تو میں امرت سر جا رہا ہوں۔ پرسوں واپس آؤں گا۔ مجھے فون کر لینا۔''

دوسرے دن فون کیا تو معلوم ہوا کہ آغا صاحب ابھی نہیں آئے۔ تیسرے دن رات کے وقت کسی نے کہا کہ آغا صاحب سخت بیمار ہیں۔ میں نے سوچا۔ کہ اس وقت تو ان سے ملنا مناسب نہیں صبح چلیں گے۔ صبح میں اٹھ کر کپڑے پہن رہا تھا۔ اتنے میں خبر ملی کہ آغا کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لوگوں کا خیال تھا کہ جنازہ شہر میں لایا جائے گا۔ اخباروں میں یہ خبر بھی چھپی کہ نیلے گنبد میں نماز جنازہ ہوگی لیکن پھر خدا جانے کیا ہوا کہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ جنازہ کے ساتھ صرف سو، سوا سو آدمی تھے۔ ان میں بھی یا تو ان کی فلم کمپنی کے لوگ تھے یا بعض بعض خاص خاص نیازمند۔ کوئی دس بجے جنازہ اٹھا۔ اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ افسوس کہ آج تک کسی کو اُن کی قبر پختہ بنوانے یا لوحِ مزار تک نصب کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔

رئیس احمد جعفری

مولانا حیدر حسن خاں

عالمِ باعمل، صوفی باصفا

مولانا حیدر حسن خاں صاحب سابق شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اس جہانِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف رحلت فرما گئے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

ان کی دل ربا شخصیت، ان کا یگانہ فضل و کمال، ان کا زہد و تقویٰ، ان کی سیرت سے اچھی صورت اور صورت سے بہتر سیرت، ان کی شفقت و محبت، اپنوں سے ان کی والہانہ فریفتگی، بیگانوں سے ان کا مخلصانہ برتاؤ، اس طرح کے واقعات ایک ایک کر کے دماغ کے پردہ پر یوں اجاگر ہوتے چلے گئے جیسے پردۂ سیمیں پر تصاویر متحرکہ۔

میں ۱۹۲۳ء میں ندوہ کے درجہ اول میں داخل ہوا، اس وقت میری عمر مشکل سے ۱۱۔۱۲ سال کی ہوگی۔

پہلی مرتبہ دارالاقامہ (بورڈنگ) کی زندگی سے آشنا ہوا، عصر کے بعد اکثر لڑکے فیلڈ چلے جاتے اور ہاکی کھیلتے، کچھ امین آباد کے اور قیصر باغ کے سبزہ زاروں کی سیر کو نکل جاتے بعض گومتی کے کنارے جاتے نہاتے سیر کرتے روانیٔ آب کا منظر دیکھتے۔ چند فیلڈ کے کنارے کھڑے ہوجاتے یا بیٹھ جاتے اور اپنے دوستوں یا ساتھیوں کے کھیل پر نقد و تبصرہ کرتے، جنہیں اخبارات سے دلچسپی ہوتی وہ ''الاصلاح''

چلے جاتے اور اخبارات و کتب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے لیکن میں اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر کے خوب روتا، جب تک مغرب کی اذان نہ ہو جاتی، میرا بہترین مشغلہ رونا اور گھر کو یاد کرنا تھا۔

ایک روز اتفاق سے میں باہر نکلا، دفتر کے سامنے کھڑا ہوا کوئی نوٹس پڑھ رہا تھا، اتنے میں ایک صاحب اوپر سے اُترے، میانہ قد، دبلا بدن، دودھ کی طرح سفید ڈاڑھی، سرخ و سفید چہرہ جیسے کشمیر کا سیب، سر پر ایک پگڑی، ہاتھ میں ایک چھڑی، آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک، لمبا کرتا، اونچا پائجامہ، میں نے بعض لڑکوں سے سُنا تھا اوپر جنات رہتے ہیں، یقین ہو گیا۔ یہ کوئی جن ہیں۔ جو نوٹس میں پڑھ رہا تھا دفعتاً اس کے حروف آنکھوں کے سامنے غائب ہونے لگے، پاؤں لڑکھڑانے لگے، اور میں بے ساختہ رونے لگا۔

کچھ عرصہ بعد کا واقعہ ہے مفتی محمد یوسف صاحب ظہر کا وضو کر رہے تھے دفعتاً ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ وہ نخاس میں رہتے تھے اور مولوی گنج میں یہ حادثہ پیش آیا، ندوہ میں اطلاع پہنچی سب کو افسوس ہوا، لیکن مولانا (جنہیں میں آئندہ مولوی صاحب لکھوں گا، میں انہیں اسی لفظ سے پکارا کرتا تھا) بے قرار ہو گئے۔ ندوہ میں اس دن تعطیل تھی، فوراً مولوی گنج گئے ایک پالکی میں انہیں لٹا کر ندوہ لائے، یہاں ان کے لیے ایک کمرے کا انتظام کیا، فوراً ڈاکٹر نعیم انصاری کو بلایا، کچھ دیر بعد میڈیکل کالج کے ایک ڈاکٹر کو بلوایا اُسے بتیس روپیہ فیس کے دیے۔ دو دو طالب علموں کی ایک ایک گھنٹے کے لیے ڈیوٹی لگائی، تاکہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں۔

ندوہ میں مفتی صاحب کے دوست، شاگرد و رفیق سب تھے مگر کسی میں وہ بیکلی، وہ اضطراب، وہ بے قراری میں نے نہیں دیکھی جو مولوی صاحب میں تھی، ان کی نورانی آنکھوں سے موتی کی طرح آنسو ٹپکتے تھے۔

کئی سال گذر گئے میں درجہ ششم میں پہنچ گیا، اب میں ندوہ کا ایک خاموش طالب علم نہیں تھا۔ اب میں ایسا طالب علم تھا جو باغی تھا، سرکش تھا، سٹرائیک ہو تو وہ پیش پیش، ہنگامہ ہو تو وہ اس کا قائد اعظم، ''الاصلاح'' میں جلسے ہوں تو وہ ''لیڈر آف دی ہاؤس''۔ رہنمایانِ قوم اور بزرگانِ ملت کی خدمت میں سپاس نامے پیش ہوں، ان کے اعزاز میں جلسے ہوں، انہیں پارٹیاں دی جائیں تو وہ رکن رکین۔ اساتذہ میں بعض مجھ سے خوش تھے، بعض نالاں۔ ''انھی ناخوش'' استادوں میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب بھی تھے، مولوی صاحب ان لوگوں میں تھے، جن کی رائے تھی کہ طالب علمی کے زمانے میں کوئی اور کام نہ کرنا

چاہیے۔ میں اور سب کام کرتا تھا، طلب علم ہی کا کام نہیں کرتا تھا لہٰذا ان کی خفگی بجا تھی۔

اس سال مولوی صاحب کا بھی ایک گھنٹہ ہمارے درجہ میں تھا، ترمذی کا درس وہی دیتے تھے، پہلے دن جب میں گیا تو وہ میری جانب مخاطب بھی نہیں ہوئے، ایک ہفتہ اسی بیگانگی کے عالم میں گذر گیا۔

مولوی صاحب کا طرز تعلیم اور اسلوب تحقیق اتنا دلکش اور نرالا تھا کہ چند ہی دنوں میں حدیث سے مجھے خاص رغبت ہوگئی، اب ان کے درس میں شریک ہوتا تو مطالعہ کر کے تیار ہو کے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ مجھ سے اتنے خوش ہو گئے کہ درجہ میں مجھ سے زیادہ کوئی طالب علم ان کی نظروں میں محبوب نہیں تھا، بعض طالب علموں نے صرف ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے داڑھی میں اضافہ کر لیا تھا، ہر مسئلہ میں مولوی صاحب کی ہر آواز کے ساتھ حبذا اور مرحبا کے نعرے بلند کرنا انہوں نے اپنا شیوہ بنالیا تھا۔ میں نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی، کبھی کبھی میں مولوی صاحب کے اخذ کردہ نتائج، استدلال اور استنباط سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا، مثلاً قرأت خلف الامام اور مسئلہ طلاق میں آخر تک مولوی صاحب کی دلیلوں سے مطمئن نہیں ہوا، لیکن ان کی شفقت و محبت کم ہونے کے بجائے بڑھتی رہی، انہوں نے تین طالب علموں کی ایک مجلس بنائی تھی، جو گویا ان کے ''ریسرچ اسسٹینٹ'' تھے، مصطفیٰ کریم ندوی ایم، ایس سی (علیگ) عبدالسلام قدوائی ندوی (ادارہ تعلیمات اسلام) اور راقم الحروف ہم تینوں کو اوقات درس کے علاوہ مولوی صاحب اپنے دارالحدیث میں یاد فرماتے تھے، اور روزانہ دو ڈیڑھ گھنٹہ تک کسی خاص موضوع پر کتب حوالہ سے مواد جمع کراتے، رواۃ کے بارے میں آراء جمع کراتے، صحاح ستہ سے اور دوسری کتب حدیث سے اس موضوع پر ہم معنی حدیثیں جمع کراتے، مسئلہ کی مخالفت اور موافقت میں حفاظ اصحاب اخبار اور ارباب رائے کے خیالات جمع کراتے اور پھر اپنی تحقیق انیق شروع کرتے تھے، اتنی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد وہ جو رائے قائم کرتے تھے بڑے بڑوں کے لیے اس سے اختلاف کرنا ناممکن ہو جاتا تھا، ان کا بالکل وہی طرز تھا جو ''بدیۃ المجتہد'' میں ابن رشد نے اختیار کیا ہے، حلقہ درس میں بھی ان کا یہی انداز تھا، ان کی ڈسک پر، شلف پر، مسند پر، میز پر، سامنے کی الماری میں درجنوں کتب حوالہ موجود رہتی تھیں، جہاں کوئی مختلف فیہ مسئلہ آیا اور انہوں نے زبانی لکچر دینے کے بجائے انھی کتابوں سے مخالف اور موافق مواد طلبہ کے سامنے پیش کیا، پھر اپنی رائے، دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ غیر حنفی طلباء بھی مولوی صاحب کے اخذ کردہ نتائج سے مطمئن ہو جاتے تھے سوائے ہمارے ایک کٹر ''اہلحدیث'' ساتھی عبدالجلیل صاحب فیصل کے، جب بہت زچ

ہوجاتے اور میں مولوی صاحب کے سامنے انہیں چھیڑتا تو برہم ہو کے فرماتے ''ہم کیا جواب دیں، ہمارے عالموں سے مناظرہ کرو تو معلوم ہو۔'' مولوی صاحب ان کے اس جواب سے بہت محظوظ ہوتے۔

مولوی صاحب کو بر بنائے دلائل حنفیت سے بڑی شیفتگی تھی۔ مذاہب اربعہ میں وہ حنفیت کو سب سے زیادہ کتاب وسنت سے قریب سمجھتے تھے۔ اپنی اس رائے کی تائید میں وہ بڑے ٹھوس اور وزنی دلائل بھی رکھتے تھے، امام ابوحنیفہؒ سے انہیں عقیدت نہیں عشق تھا، امام صاحب کا نام آیا اور ان کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہوئی، ان کا خیال تھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ان کے بعد کے مصنفین کرام نے بہت زیادہ ظلم کیا ہے، امام صاحب کی مظلومیت نے ان کے دل کو رقیق بنا دیا تھا۔ ان کی حالت،

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے!

کے مصداق ہوگئی تھی۔

امام بخاری کی تاریخ صغیر میں امام ابوحنیفہ کے لیے ''جعل الاسلام عروۃ'' آیا ہے، ان الفاظ کا جب حوالہ دیا، یا یہ الفاظ جب انہیں یاد آجاتے تو ان کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا۔

پھر مولوی صاحب سے ضبط نہ ہوتا تھا، امام بخاری کو تو حفظ مراتب کے خیال سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے البتہ روتے اور دوسروں کو رلانے کی کوشش کرتے۔ امام صاحب کی مظلومیت کا ایسا دردناک نقشہ کھینچتے کہ امام عالی مقام حسین علیہ السلام کے بعد انہیں کی مظلومیت مسلم ہو جاتی، یہ موضوع جب چھڑ جاتا تو اصل سبق رہ جاتا، دوسرا گھنٹہ شروع ہو جاتا لیکن مولوی صاحب کی تقریر اسی جوش سے جاری رہتی جس جوش سے شروع ہوئی تھی، ہم اٹھنا چاہتے، وہ پکڑ پکڑ کر بٹھاتے دوسرے گھنٹہ کا کافی حصہ ختم ہو جاتا، لیکن مولوی صاحب کی تقریر ختم نہ ہوتی، آخر ہم لوگ باچشم گریاں اور باسینۂ بریاں اٹھتے کم از کم مولوی صاحب ہم میں سے اکثر سعادت مندوں کے متعلق یہی سمجھتے کہ وہ ان سے زیادہ متاثر ہیں۔

اگر کسی دن ہمارا پڑھنے کو جی نہ چاہتا تو مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی اپنا ہاتھ آنکھوں تک لے جا کر میری طرف اشارہ کرتے، مطلب یہ آج محفل عزا برپا ہونی چاہیے، میں کسی نہ کسی طرح امام صاحب کا ذکر کرتا، پھر تاریخ صغیر کا پھر ''جعل الاسلام عروۃ'' کا۔ بس پھر کیا تھا اب کہاں کا سبق اور کہاں کا درس؟ کیسی تحقیق اور کدھر کی ریسرچ؟

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

مولوی صاحب کو اپنے علم و فضل کی بنا پر جن لوگوں نے انہیں دور سے اور دور رہ کر دیکھا ہے، وہ بھی مانتے ہیں۔۔۔ یگانہ تھے، لیکن جن لوگوں نے ان کے حلقۂ درس میں شرکت کی ہے، ان کا طرز تحقیق دیکھا ہے، ان کی حاضر دماغی کا مشاہدہ کیا ہے، ان کے حسن استدلال کو پرکھا ہے ان کی وسعت نظر کو جانچا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسری درسگاہوں کے حلقۂ درس میں بھی شرکت کی ہے، دوسرے شیوخ کا طرز تعلیم بھی دیکھا ہے ان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ مولوی صاحب اپنے علم و فضل کی بنا پر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بلاد اسلامیہ میں بھی یگانہ تھے فرد فرید تھے "لاشریک لہ" تھے، ان کے زمانہ میں بھی ہم نے بہت سے علماء اور شیوخ کو دیکھا، اب بھی دیکھتے ہیں، لیکن حیدر حسن خاں کی سی بات نہیں پاتے۔

وہ بات کوہ کن کی گئی کوہ کن کے ساتھ!

یوں تو مولوی صاحب بے انتہا خاکسار، سراپا عجز، ہمہ تن فروتنی تھے لیکن اپنی علمی منزلت سے واقف تھے۔ صرف واقف ہی نہیں بلکہ قدر شناس بھی، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کو خاطر میں کم لاتے تھے۔ طبیعت میں باایں‌ہمہ زہد و تقویٰ، شوخی، مزاج میں تازگی اور باتوں میں سنجیدہ ظرافت اور متین طنزیات کی وہ آمیزش ہوتی تھی۔ کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

۱۹۲۸ء میں مولوی صاحب بعض انتظامی تبدیلیوں کے ماتحت ہمارے بورڈنگ "شبلی ہوسٹل" کے اتالیق مقرر ہوئے، اب اور زیادہ قرب اور ہم نشینی کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولوی صاحب اگرچہ بڑے پکے حنفی تھے، لیکن نماز فجر غلس میں ادا کرتے تھے۔ بڑے سویرے وہ بہ نفس نفیس ہر کمرے میں تشریف لے جاتے؟ ہر طالب علم کو اٹھاتے۔

بورڈنگ کا ایک کمرہ نماز کے لیے وقف تھا، ابھی مسجد نہیں بنی تھی، گرمی کے موسم میں بہت تکلیف ہوتی، جگہ بھی کم تھی انہوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ باقاعدہ اجازت حاصل کی جائے، مزدور لگیں اور دفتری طور پر کام ہو، بہ نفس نفیس چبوترہ کی تعمیر اپنے دست مبارک سے شروع کر دی۔ ہم بھی پہنچ گئے دیکھا دیکھی اور بہت سے طالب علم بھی شامل ہو گئے، لیجئے دو ہی دن میں چبوترہ تیار ہو گیا۔ وہاں اذان کی آواز گونجنے لگی۔ تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے تہلیل اور تسبیح کا مشغلہ شروع ہو گیا!

جب مولوی صاحب دارالاقامہ کے اُتالیق بن گئے اور ہم لوگوں پر زیادہ محنت صرف کرنے لگے، اس قرب مکانی نے ان کے دل کو بھی ہم سے قریب کر دیا تھا، خارج اوقات میں وہ پہلے بھی ہمیں پڑھاتے

تھے اور اب زیادہ وقت دینے لگے اتنا زیادہ کہ بعض وقت طبیعت اکتا جاتی اور اب اپنی تہی بختی پر افسوس ہوتا ہے۔

مولوی صاحب کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ ''علم'' اس وقت تک نہیں حاصل ہوتا، جب تک منطق اور فلسفہ میں درک حاصل نہ ہوا۔

۱۹۳۰ء میں ایک معمولی بات پر دفعتاً ندوہ میں اسٹرائک ہوئی۔ عبدالسلام صاحب اس مجوزہ اسٹرائک کے سخت حامی تھے اور میں شدید مخالف۔ ''الاصلاح'' کا ناظم میں تھا، شروع کے دو دنوں میں اس ہنگامہ سے میں بالکل الگ رہا۔ ایک دفعہ عبدالسلام صاحب مجھ سے کنویسنگ فرمارہے تھے، چاہتے تھے میں بھی اسٹرائک میں شریک ہوجاؤں، میں نے پوچھا اس کا مقصد کیا ہے؟ فرمایا اسٹرائک۔ میں نے کہا ''اسٹرائک کا مقصد اسٹرائک'' ارشاد ہوا ''ہاں'' اس جواب پر کچھ غیر ذمہ دارانہ حرکتیں مجھ سے سرزد ہوتیں، شام کو طلبہ کا عام جلسہ ہونے والا تھا کہ اسٹرائک ہو یا نہ ہو جلسہ میں برہمی، جوش، غضب اور جنون کا طوفان اُمنڈ رہا تھا۔

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

نعرے لگ رہے ہیں۔ زندہ باد اور مردہ باد کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی الگ الگ ٹولیاں مشوروں میں مشغول ہیں۔ ہر ہر ''لیڈر'' محاذ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے، عوام کالانعام جان دے دینے تک پر تیار ہیں، جوش ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ ہر ہر لمحہ ایک نئے طوفان کا آئینہ دار، ہر نظام برہم، ہر اصول شکستہ، ہر ضابطہ ناقابلِ احترام۔

دوسری طرف اساتذہ کے جلسے ہورہے ہیں، ارکان مشورے کر رہے ہیں۔ ارباب اقتدار نظم و امن کی بحالی کے انتظامات میں مصروف ہیں، آج کی رات فیصلہ کن رات ہے، یا اِدھر یا اُدھر، یا سر پر کامیابی یا تختہ نامرادی، یہ جوش یہ ولولہ یہ ہنگامہ ہاوہو، یہ شور دارو گیر الامان والحفیظ۔

عشاء کے بعد جلسہ ہوا، جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، چھوٹے اور بڑے سمجھ دار اور ناسمجھ، سنجیدہ اور پُر جوش، گوشۂ اعتکاف میں بیٹھنے والے اور بزم یاراں میں چھچھانے والے، اساتذہ کے نیازمند اور باغی سب ہی جمع تھے، مجمع کے ایک سرے پر تماشائی کی حیثیت سے، ایسے تماشائی کی حیثیت سے جو عنقریب خود تماشہ بننے والا تھا، میں بھی کھڑا تھا۔

عبدالسلام صاحب نے صدارت کے لیے میرا نام پیش کردیا، یہ ''رشوت'' تھی، میں نے انکار کیا،

لیکن آیئے آیئے کے شور میں میری آواز دب گئی، میں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ارباب اقتدار کو اپنی اسٹرائک سے دبالیں گے تو یہ غلط ہے، اور اگر یہ سمجھتے ہیں کہ کامیابی ہو یا ناکامی ہم اپنے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہوں گے، تو بسم اللہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، سب نے کہا ہم اپنے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہوں گے، میں نے کہا، تو کل صبح سے اسٹرائک کیجیے اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑیئے۔

صبح ہوتے ہی اسٹرائک شروع ہوگئی، ہر ہر دروازہ پر پروکٹرس موجود تھے۔ بڑے دروازہ پر چند دوستوں کے ساتھ میں کھڑا تھا، پکٹنگ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ڈے اسکالرس بھی اندر جانے نہ پائیں، بورڈنگ کے تو سب لوگ ہمنوا تھے ہی پکٹنگ کامیاب ہوئی، اور ایک طالب علم کی بھی حاضری نہ لکھی جاسکی، سب غیر حاضر تھے، سب باغی تھے، سب نامرمان تھے ان میں بعض ''کل نافرمان'' بھی تھے۔
ندوہ کی تاریخ میں اتنی مکمل، ہمہ گیر اور مؤثر اسٹرائک کبھی نہیں ہوئی تھی، دو روز بعد جب اسٹرائک کرنے والے طلبہ کے نام خارج ہوئے تو حد ہوگئی، ان میں ابواللیث (مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم کے پوتے) اور صلاح الدین (مولانا عبدالودود صاحب معلم منطق وفلسفہ کے فرزند ارجمند) بھی تھے۔

جوش برابر بڑھتا جارہا تھا، نئی نئی افواہیں مشہور ہورہی تھیں، کبھی سننے میں آتا کہ پولیس بلائی گئی ہے، کبھی مشہور ہوتا کچھ طلبہ گرفتار کرلیے جائیں گے۔ یہ افواہیں آگ پر تیل کا کام کرتی تھیں۔
دوسرے روز صبح سے مطبخ بند کردیا گیا، اس سے بھی طلبہ کے عزم وولولہ میں کوئی فرق نہیں آیا، آپس میں چندہ ہوا، اور بڑی پتیلیاں، مٹی کے نئے بنے ہوئے چولہوں پر چڑھ گئیں، اور کھچڑی پکنے لگی، پتیلیوں میں بھی اور دماغوں میں بھی۔

تیسرے یا چوتھے روز شام کو میں مجیب (عبدالمجیب ندوی بی اے، ایل ایل بی) کے ساتھ ڈالی گنج سیر کو گیا، ہم دونوں اکثر اسٹیشن کی طرف یا کسی اور طرف نکل جاتے تھے، مغرب کے بعد ہم واپس آئے تو دیکھا کہ صحن میں ایک جم غفیر جمع ہے اور بہت پُر جوش (لیکن بے آہنگ) آوازیں آرہی ہیں، آگے بڑھے تو معلوم ہوا مولانا سید سلیمان ندوی ''گھیرے میں'' لے لیے گئے ہیں، بیچ میں وہ کھڑے ہیں،

ہر کجا بود چشمہ شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

کا سماں آنکھوں کے سامنے "مردم و مرغ و مور" پرا باندھے کھڑے ہیں، عمامہ کی سفیدی دیکھتے ہی سمجھ گیا، سید صاحب ہیں، آگے بڑھا، عرفان خاں (حافظ محمد عرفان خاں ندوی بی اے جامعہ تحصیلدار بھوپال) اپنے چھوٹے سے لیکن (دیدہ زیب) قد کے ساتھ ایک ایک بالشت اچھل کر بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہے ہیں، میں نے انہیں خاموش کیا اور سید صاحب سے گفتگو شروع کر دی، معلوم ہوا مرادآباد میں جمیعۃ العلماء ہند کا جلسہ ہے اور وہ وہیں تشریف لے جا رہے ہیں، میں نے زیر لب عرض کیا

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا ے روی

انہیں جلدی تھی اور وہ چاہتے تھے اپنے سامنے ابھی معاملہ طے کر کے جائیں۔ وہ جس شفقت، ملاطفت، مرحمت اور عطوفت کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ مجمع اس سنس sense میں اس کا خیر مقدم نہیں کر رہا تھا، سامنے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی میں اس پر کھڑا ہوا، اور تقریر شروع کر دی اور سید صاحب کی مداخلت کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی، اصل میں سید صاحب جس طرح اس گتھی کو سلجھا رہے تھے وہ بہترین چارہ کار تھا، لیکن مشتعل مجمع صلح سے ہمیشہ بیزار رہتا ہے، میری تقریر کے بعد بھی بہت سے لوگ مطمئن نہیں ہوئے، البتہ عام طور پر ایک پُر امید فضا پیدا ہو گئی افسوس ہے کہ بعد میں سید صاحب کی مداخلت کارگر نہیں ہوئی اور معاملہ پھر وہیں کا وہیں رہ گیا، اس مشتعل مجمع کے فرد ہمارے عمران خاں (حافظ محمد عمران خاں ندوی) فاضل از ہر مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تھے، یہ حضرت زبان سے تو کچھ نہ گویا ہوئے البتہ پورے عزم و ثبات کے ساتھ اپنے لیڈروں کی کمزوری پر پہلے تو خوب آنسو بہائے اور پھر بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ساری رات فاقہ سے گزر گئی۔ دوسرے روز کا بڑا حصہ اسی طرح گزر گیا، مگر اس شیر مرد نے ایک دانہ جو بھی نہ استعمال کیا۔ حالاں کہ اقبال کا قول ہے کہ۔

ہمیشہ نانِ شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

عرفان پہلے خوشامد کر کے اور بعد میں پٹ کے اور سگ باش برادر خورد مباش کا عملی تجربہ کر کے خاموش ہو گئے، دوستوں نے سمجھایا ناکام رہے ساتھیوں نے التجائیں کیں، لیکن وہ نگاہ غضب سے (ٹھوکر سے نہیں) ٹھکرا دی گئیں، اب میں پہنچا میں نے منا لیا۔

لائے اس بُت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

یہ اتنی لمبی داستان بیان ہوگئی، مگر اس میں مولوی صاحب کا ذکرِ جمیل نہ آیا؟ وہ بھی سُن لیجئے، مولوی صاحب توقع کے مطابق اسٹرائک کرنے والوں کے سخت مخالف تھے، بے حد نالاں اور برہم تھے، پٹھان تھے اور غصہ ور بھی، ہر وقت اپنی جیب میں ایک بالشت کا چاقو رکھتے تھے کہ کسی نے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا، اور اس کا دیدۂ گستاخ باہر نکالا۔

اس سارے عرصہ میں مولوی صاحب سے نہیں ملا، عمداً نہیں ملا، کس آنکھ سے ملتا؟ کس دل سے ملتا؟ کس زبان سے ملتا؟

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائیں کیوں؟

وہ ہوسٹل کے نگراں اور اتالیق تھے، لیکن میرا کمال دیکھئے میں نے ان کا آمنا سامنا ہونے ہی نہیں دیا۔

اسٹرائک کے ختم کرنے کے ایک ہی صورت رہ گئی تھی، تعطیل کردی جائے چناں چہ دو مہینے کی تعطیل کردی گئی، سب لوگ منتشر ہوگئے، میں مجیب اور عبدالسلام تین آدمی رہ گئے کہ لکھنؤ میں رہ کر کام کو جاری رکھیں گے۔

طلبہ کے رخصت ہونے کا منظر بھی دل ہلا دینے والا منظر تھا، کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوں۔ نجم الدین کی وداعی نظم نے تو سماں باندھ دیا تھا۔

اب تک میں مولوی صاحب کی عزت ایک شفیق اُستاد، ایک وسیع النظر عالم، ایک علامہ دوراں، ایک شیخ الحدیث، ایک متقی اور پرہیزگار صوفی کی حیثیت سے کرتا تھا، لیکن اب وہ وقت آرہا ہے کہ مولوی صاحب ایک انسان، ایک کامل العیار انسان کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، ان کی ساری حیثیتیں مدہم پڑ جاتی ہیں، یہ حیثیت سب پر بالا ہوتی ہے۔ وہ مافوق الانسان نہیں تھے صرف انسان ہی کے متعلق غالب نے کہا ہے:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انسان کامل وہی ہے جس میں کوئی خلا نہ ہو، اگر ہو بھی تو وہ خود بخود پُر ہو جاتا ہے، ہمارے مولوی صاحب ایسے ہی انسان تھے۔ خدا ان کی تربت عنبریں کرے!

تعطیل کلاں ختم ہوئی، دارالعلوم کے نئے میقات کا آغاز ہوا، ایسا معلوم ہوا۔ کہ گویا اسٹرائک ہوئی ہی نہیں تھی۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

لوگ آتے تھے، معافی نامہ پر دستخط کرتے تھے اور داخل ہو جاتے تھے، ان میں بعض مجبور تھے، بعض بدنفس، پانچ آدمی ممنوع الادخال تھے، عبدالسلام، مصطفیٰ کریم، نجم الدین، عبدالحیٔ اور میں۔

چیست یاران طریقت بعد ازاں تدبیر ما؟

نجم الدین اور عبدالحیٔ اپنے اپنے گھر پر تھے، میں اور عبدالسلام لکھنؤ میں تھے، ہم نے ارادہ کیا کہ جامعہ جائیں، اتفاق سے مولانا عبدالودود صاحب سے ملاقات ہوئی، مولانا بڑے لطف وعنایت سے پیش آئے، انہوں نے اصرار کیا ''تم بھی داخلہ کرالو'' میں نے کہا ''معافی جو مانگنی پڑے گی'' فرمایا تم مجھ سے ہاں کہہ دو، باقی سب کچھ میں کرلوں گا، تم نہ معافی مانگنا نہ معذرت نامہ لکھنا، میں خاموش ہو گیا، انہوں نے کوشش شروع کردی، لیکن ناکام رہے، اور خاموش ہو گئے۔

عبدالسلام صاحب کی مولوی صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی، میں اب تک ان سے نہیں ملا تھا۔ عبدالسلام صاحب کا بیان تھا مولوی صاحب اس طرح ملے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، میری اور ان کی قسمت پر افسوس کرتے رہے، اب انہوں نے کمر ہمت باندھی، سید صاحب لکھنؤ ہی میں تھے ان سے ملے، وہ بیچارے تو راضی تھے لیکن اساتذہ ارکان اور ناظم صاحب کا عندیہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ناظم صاحب خلاف تھے اساتذہ حامی تھے، متعدد ارکان کے پاس مولوی صاحب بہ نفس نفیس کنوینسنگ کی غرض سے تشریف لے گئے مولوی عبدالباری صاحب ندوی (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) کے ''غریب خانہ'' واقع ڈالی گنج بھی اس حالت میں پاپیادہ تشریف لے گئے کہ بخار چڑھا ہوا تھا، گرمی کا موسم تھا، اور سورج پوری حدّت کے ساتھ چمک رہا تھا، مولوی صاحب کی یہ کوشش جاری تھی کہ میں خیرآباد چلا آیا، عبدالسلام صاحب لکھنؤ ہی میں رہے، پھر وہ بھی وطن چلے گئے، چندروز بعد مولوی صاحب کا خط پہنچا، سب کچھ طے ہو گیا، رئیس کو بھی اطلاع کردو، اور تم دونوں فوراً ندوہ پہنچ جاؤ، عبدالسلام صاحب نے خود مجھے خط لکھا، میں حالات ایسے دیکھ آیا تھا کہ مجھے یقین نہیں تھا مولوی صاحب کو کامیابی ہوگی، میں نے جواب دیا جب تک دفتر سے باقاعدہ اطلاع نہ آجائے، جانے میں جلدی نہ کرو، لیکن انہوں نے مولوی صاحب کا خط پاتے ہی بوریہ بستر باندھا اور لکھنؤ پہنچ گئے، مولوی صاحب فوراً مہتمم صاحب کے پاس گئے اطلاع دی عبدالسلام آگئے ہیں، رئیس آنے والے ہیں، مگر مہتمم صاحب کے پاس نظامت سے نیا حکم آگیا تھا کہ ان مجرموں کو داخل نہ کیا جائے۔ مہتمم صاحب نے یہ خبر مولوی صاحب کو سنائی وہ سناٹے میں آگئے، کتنے خوش

ہو کر گئے تھے اور کتنے ملول و غمگین واپس آئے۔

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، عبدالسلام سے کیا کہیں؟ اسی روز شام کو عبدالسلام صاحب خیرآباد پہنچے اور تمام واقعات کی اطلاع دی، اب جامعہ جانے کی رائے اور زیادہ پختہ ہوگئی جو کچھ ہوا تکلیف دہ ضرور تھا، لیکن خلاف توقع ہرگز نہ تھا۔

چند روز بعد میں لکھنؤ پہنچا، ندوہ ہی میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا، اب اتنے عرصہ کے بعد۔۔۔مولوی صاحب سے ملا۔

ہمیں ندوہ چھوڑنے کا کافی غم تھا، یہ وہ سرزمین تھی جہاں ہم نے عقل کی آنکھیں کھولیں۔ بصارت اور بصیرت حاصل کی، پڑھا اور بہت کچھ سیکھا، یہاں کا چپہ چپہ کونہ کونہ گوشہ گوشہ ہمارے لیے مرکز جذب و کشش تھا، ہماری انجمن آرائیوں کا رازداں تھا، ہماری محفل طرازیوں کا غماز تھا، جب ہم ندوہ سے جامعہ روانہ ہو رہے تھے تو بے ساختہ یہ شعر میری زبان پر آ گیا۔

جاتے ہیں تیرے کوچہ سے قاتل خفا نہ ہو
ٹکڑے تو ڈھونڈھ لیں دل صد پاش پاش کے

اب وہ احباب کہاں؟ وہ بے تکلفی کی مجلس کہاں؟ وہ قہقہے اور چہچہے کہاں؟ وہ بے فکری اور نشاط خاطر کہاں؟ اب ایک نئی دنیا میں جا رہے تھے، نئے ماحول سے سابقہ پڑ رہا تھا، نئے لوگوں سے دوچار ہو رہے تھے وہاں ہر چیز نئی بنانا ہوگی، دوستی بھی نئے سرے سے کرنا پڑے گی تعلقات بھی از سرنو قائم ہونگے، رسم و راہ کا سلسلہ بھی نیا ہوگا، یہاں ہر چیز پہلے سے کئی سال کے رہن سہن سے بنی ہوئی چلی آ رہی تھی۔۔۔ بہر حال انغم آگین خیالات سے ہم کافی متاثر تھے، لیکن مولوی صاحب کی حالت ہی کچھ اور تھی، وہ رو رہے تھے سچ مچ رو رہے تھے۔ ان کی حورِ جنت کی طرح پاک آنکھ آنسو بہا رہی تھی انہیں عبدالسلام اور رئیس کی جدائی شاق تھی حالانکہ یہ دونوں ان کی خاک پا بھی نہ تھے، گر دِراہ تو بڑی چیز ہے۔ وہ تو کچھ دور تک شرف ہمرکابی حاصل کرتی ہے۔

عبدالسلام مجھ سے دو روز پہلے دہلی چلے گئے تھے۔ تیسرے روز جب میں روانہ ہوا تو اسٹیشن پر بہت سے دوست الوداع کہنے آئے تھے ان میں ایک بزرگ دوست بھی تھے، یہ ہمارے مولوی صاحب تھے۔ وہ اپنے عقیدت کیشوں اور نیاز مندوں سے، محبت کرنے والوں اور تعلق رکھنے والوں سے یہی برتاؤ

کرتے تھے۔

ہم لوگ جامعہ میں داخل ہو گئے۔۔۔جامعہ کا عہد بہار بھی ایک مفصل داستان کا طالب ہے۔۔۔
گرمیوں کی تعطیل قریب آئی دفعتاً دل میں خیال پیدا ہوا، ندوہ میں بھی تعطیل ہونے والی ہے، کیوں نہ اس مشترک تعطیل سے فائدہ اٹھایا جائے، فوراً مولوی صاحب کو خط لکھا، توقع سے پیشتر جواب آیا وہ تیار تھے اس پر تیار تھے کہ اپنی دو مہینے کی تعطیل غارت کر دیں گے۔ اس پیرانہ سالی میں وطن نہیں جائیں گے، اس جھلسا دینے والی لو اور تڑپا دینے والی گرمی میں لکھنؤ میں رہیں گے تکلیفیں برداشت کریں گے، مصیبتیں سہیں گے، بے آرامی اٹھائیں گے لیکن اپنے دو محبوب شاگردوں کا دل میلا نہیں کریں گے۔ ان کا دامن آرزو گوہر مراد سے بھر دینگے انہیں اپنے در سے خالی نہیں پھیریں گے۔

لکھنؤ پہنچے، ندوہ گئے، بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرہ میں ڈیرہ ڈالا، سارا بورڈنگ خالی تھا، طلبہ جا چکے تھے، اساتذہ رخصت ہو چکے تھے، شاگرد پیشہ بھی چھٹی منا رہے تھے صرف چند دور دراز کے طالب علم تھے اور ایک چپراسی، سب سے بڑی دقت کھانے کی تھی، مطبخ بند تھا، ہمیں اپنی فکر نہیں مولوی صاحب کی تھی، ہم تو ہر طرح گزر کر سکتے تھے لیکن مولوی صاحب، بس سوال یہ تھا، عبدالسلام صاحب کو غرہ تھا کہ وہ ''دال روٹی'' پکا لیتے ہیں، اسی بھروسہ پر دال اور آٹا لایا گیا، مولوی صاحب کو بھی ہم نے اپنے ساتھ شریک کر لیا، ارہر کی دال پکی، ویسی ہی جیسی اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی ایک ''بچگانہ'' نظم میں تصویر کھینچی ہے۔

دال ارہر کی بے مزہ پھیکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

اب روٹی کی باری آئی، کوئی مثلث نما، کوئی مربع (لیکن مدور کوئی نہیں) یہاں تک بھی غنیمت تھا، سخت اتنی جیسے چمڑا، ایک کونہ میرے ہاتھ میں تھا دوسرا مولوی صاحب کے ہاتھ میں۔ ہم دونوں زور لگا رہے ہیں لیکن وہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی، عبدالسلام صاحب کی اس ''مہارت'' پر مجھے غصہ آ رہا تھا، مولوی صاحب ہنس رہے تھے۔ اور یہ حضرت خود مسکرا رہے تھے۔

دوسرے دن باقاعدہ بخاری کا درس شروع ہو گیا، اوقاتِ درس ملاحظہ ہوں:۔
نماز فجر کے بعد سے ۱۲ بجے دوپہر تک یعنی جب تک کھانا نہ آ جائے، پھر نماز ظہر کے بعد سے عصر کے وقت تک، پھر مغرب کے بعد سے عشا تک۔ چھٹی جمعہ کو بھی نہیں، بغیر اس پروگرام کے اتنے مختصر عرصہ میں ہم بخاری کیونکر ختم کر سکتے تھے؟

مولوی صاحب کے سامنے عبارت پڑھنا یعنی قرأت کرنا آسان نہ تھا وہ آخری حرف کے اعراب پر خاص زور دیتے تھے کہ صاف پڑھا جائے، خواہ وہ اسم ہو، علم ہو، فعل ہو، کچھ ہو، مثلاً ان کے سامنے ''عن عکرمہ'' یا عن ابی ہریرۃ'' ہرگز نہیں پڑھ سکتے، ضروری تھا کہ آخری حرف کا اعراب نمایاں کیا جائے یعنی ''عن عکرمۃً'' یا ''عن ابی ہریرۃَ'' پڑھا جائے، پہلے روز عبدالسلام صاحب نے قرأت کی، دوایک جگہ اسماو اعلام کے آخری حرف کو ساکن پڑھا، مولوی صاحب نے ٹوکا تو گڑبڑا گئے اور گھبرا کر کچھ غلطیاں کر بیٹھے مولوی صاحب برابر ٹوکتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ درس کی رفتار ست رہی، دوسرے دن بھی یہی ہوا، تیسرے دن بھی عبدالسلام صاحب کچھ سوچتے جاتے تھے (یہ پرانی عادت ہے) اور پڑھتے جاتے تھے اور کچھوے کی طرح خراماں چل رہے تھے، مولوی صاحب نے مجھ سے کہا ''میاں تم پڑھو'' میں نے ٹالنا چاہا معذرت کی جس میں انکسار سے زیادہ خود شناسی کو دخل تھا، لیکن انہوں نے پھر اصرار فرمایا ''میاں تم ہی پڑھو'' میں نے

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

کہہ کے قرأت شروع کر دی، آدھا صفحہ پڑھ گیا، مولوی صاحب نے کہیں نہیں ٹوکا، اب میری ہمت بڑھ گئی اور میں نے فراٹے بھرنا شروع کیے کہ عبدالسلام صاحب منہ دیکھتے رہ گئے، اب تو مولوی صاحب پر میرا سکہ جم گیا، حاضر وغائب ستائش ہورہی ہے، میاں! (میاں تکیہ کلام تھا) رئیس تو ایسی عبارت پڑھتا ہے، اتنا شوقین ہے کہ کیا کہوں؟ اب مستقل طور پر قرأت میرے ذمہ ہوگئی، جب تک درس کا سلسلہ جاری رہا قرأت میں ہی کرتا رہا، درس اتنی تیز رفتاری کے ساتھ جاری تھا کہ بعض دفعہ ایک ایک دن میں ایک ایک پارہ بخاری کا ہم نے ختم کرلیا، یوں ہی رواروی میں نہیں اسی شانِ تحقیق وتدقیق سے، اُسی غور وفکر سے، اسی ہر ہر حوالے اور ہر ہر بحث پر سیر حاصل مذاکرہ کے ساتھ جو مولوی صاحب کے حلقۂ درس کی ممتاز، نمایاں اور شاید واحد خصوصیت تھی ایک دن جمعہ کے بعد پڑھنے کو جی نہ چاہا، مولوی صاحب کو اطلاع دیے بغیر ہم دونوں ڈالی گنج چلے گئے، وہاں سے مرمرے، شکر اور برف لیتے آئے کہ ستو بنائیں گے۔ ہم اپنے کام میں مشغول تھے کہ مولوی صاحب اپنا سُرخ رومال لپیٹے ہوئے اس چلچلاتی دھوپ میں آتے دکھائی دیے، وہ ہماری ''خیریت'' معلوم کرنے تشریف لارہے تھے، ان سے ہم نے کہہ دیا ''آج جمعہ ہے، امین آباد بھی جانا ہے اب کل پڑھیں گے، مولوی صاحب!'' ''اچھا میاں'' کہہ کر واپس چلے گئے۔

مولوی صاحب ایک عزیز شاگرد کے ایک ضروری کام سے چند روز کے لیے دارالمصنفین گئے، اب ہم بیکار تھے، ندوہ کا کتب خانہ کھلا ہوا تھا، اپنے استاد مولوی کلیم احمد صاحب ندوی سے میں ''فسانہ آزاد'' کی چار جلدیں لایا اور ختم کر دیں۔ ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد مولوی صاحب واپس آ گئے، نہ آرام لیا نہ ستائے آتے ہی انہماک اور شغف کے ساتھ تدریس میں مشغول ہو گئے، ایک روز حلقہ درس پورے زور کے ساتھ جاری تھا، قدم قدم پر مولوی صاحب داد تحقیق دے رہے تھے کہ انہوں نے اپنے سامنے کی کتاب کا صفحہ الٹا ایک پرزہ کاغذ نظر آیا، جس پر مولوی صاحب کے ''نومرحوم'' بھتیجے یا بھانجے کے ہاتھ کی یادداشت لکھی ہوئی تھی، مولوی صاحب ان مرحوم کو بہت چاہتے تھے، ان کے ہاتھ کے نقوش جو نظر آئے، تو مولوی صاحب کی آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر پھر گئی، سلسلۂ درس منقطع کر کے اس پُرزہ پر نظر جمادی، کئی بار ''ہا! میاں!'' فرمایا، میں نے پوچھا ''کیا بات ہے مولوی صاحب؟'' انہوں نے مرحوم کے فضائل وحسنات، ان کے اوصاف وکمالات اور ان کی جواں مرگی کا حال ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا کہ ہم دونوں خاصے متاثر ہوئے۔

اب آگے بڑا نازک مرحلہ آتا ہے، مولوی صاحب نے مرحوم کا سراپا بیان کرنا شروع کیا اور خاص زور ان کی ''کھالی داڑھی'' پر دیا، مولوی صاحب جب جوش بیان میں ہوتے تھے تو ک کا لفظ کھ فرماتے تھے مثلاً کالا کو کھالا، کہتے تھے، جب کھالی داڑھی نے طول کھینچا اور تکرارات کی صورت اختیار کر لی تو قطعاً بلا ارادہ اور بالکل بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی اور میں زور سے ہنس پڑا، مولوی صاحب بڑے نازک دماغ بھی تھے، کیا مجال جو کوئی خلاف شان حرکت برداشت کر لیں انہوں نے دفعتاً پوچھا، کیا ہوا میاں؟ کیوں ہنسے؟ میرے لیے یہ کٹھن گھڑی تھی، مولوی صاحب کو اگر یقین ہو جاتا کہ ان کے بیانِ غم پر مجھے ہنسی آئی ہے تو شائد میں ہمیشہ کے لیے ان کی بارگاہ میں مردود ہو جاتا، لیکن

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

دفعتاً مولوی صاحب کے کوئی ملنے والے آ گئے، وہ ان کی طرف مخاطب ہو گئے، جب یہ صاحب چلے گئے تو میں نے غم والم کی پوری کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے پھر مرحوم کا ذکر چھیڑا، اور ہمہ تن متوجہ ہو کر مولوی صاحب کا بیان سنتا رہا۔

ندوہ میں ہمارے ابتدائی دور کے ایک ساتھی وصی احمد صاحب (جواب طبیہ کالج دہلی میں پڑھتے تھے) لکھنؤ آئے اور سیدھے ہمارے پاس آ گئے۔ اپنے علیل بھائی کو لے کر آئے تھے جن کا آپریشن

ہونے والا تھا، آپریشن ناکام ہوا دوسرے روز ان کا انتقال ہوگیا۔ ظاہر ہے ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونا، انتظامات میں مدد دینا، وصی احمد صاحب کے لیے جملہ امکانی آسانیاں بہم پہنچانا ہمارا فرض تھا، وہ ہمارے ندوی بھائی تھے، ان کے بھائی گویا ہمارے بھائی تھے، حامد صاحب نے کفن وغیرہ کے انتظامات میں وصی احمد صاحب کی مدد کی، جب ہم لوگ تجہیز و تکفین و تدفین کے ارادے سے جانے لگے تو مولوی صاحب سے اجازت لی، حالانکہ وصی احمد صاحب مولوی صاحب کے شاگرد نہیں تھے، لیکن محض انسانی ہمدردی سے وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہوگئے، میں نے کہا، مولوی صاحب اس گرمی میں آپ کہاں زحمت کریں گے، یہاں سے عیش باغ تک پا پیادہ جانا اور آنا ہے، کوئی ۸۔۹ میل کا چکر ہوگا، لیکن مولوی صاحب نے ایک نہ سنی، فرمایا، ''واہ میاں مجھے کیا سمجھتے ہو کیا میں اتنا بوڑھا ہوں کہ ایک مسلمان کی میت کو کاندھا بھی نہ دوں؟ وہ کسی طرح نہ مانے اور ہم سب کے ساتھ عیش باغ تک جہاں قبرستان تھا گئے، برابر میت کو کاندھا دیتے رہے، واپسی پر وہ آسانی سے یکہ پر واپس آسکتے تھے، لیکن چونکہ آٹھ دس آدمی ساتھ تھے اور یہ سب پیدل جارہے تھے، مولوی صاحب کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ تنہا یکہ پر بیٹھ کر الگ الگ روانہ ہو جائیں، میرے اصرار پر فرمایا ''میاں، سب کے ساتھ آئے ہیں ساتھ جائیں گے، ساتھ کیوں چھوڑیں؟'' آخر انہوں نے اپنا کہا کیا اور عیش باغ سے پھر پا پیادہ واپس آئے، واپسی پر ہم لوگ تھک کر چُور ہوگئے تھے لیکن وہ ویسے ہی ہشاش بشاش تھے، گویا ماندگی تھی ہی نہیں۔

تعطیل کے ختم ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے کہ بخاری کی تکمیل ہوگئی۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے، طالب علمی کے زمانہ میں ہم میں سے کسی نے بھی اس توجہ اور انہماک شغف اور شوق کا اظہار نہیں کیا تھا، ان کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی، بخاری ختم ہم نے کی تھی، لیکن باچھیں ان کی کھلی جارہی تھیں، بند قبا ان کے ٹوٹے جارہے تھے، اس خوشنودی کی سند میں مولوی صاحب نے ہمیں وہ انعام دیا جو زیادہ سے زیادہ تھا، توقع اور امید، اہلیت اور استحقاق سے کہیں زیادہ، بہت زیادہ تھا!

مولوی صاحب نے ہمیں دو سندیں مرحمت فرمائیں۔ ایک سند تو بلفظ وہ تھی جو ان کے استاد جلیل حضرت شیخ محمد صاحب یمنی نے انہیں مرحمت فرمائی تھی، بس فرق یہ تھا، کہ اپنے نام نامی کے بجائے میری سند میں میرا اور عبدالسلام صاحب کی سند میں ان کا نام ڈال دیا تھا دوسری سند ندوہ کے فارم پر مہتمم دارالعلوم کی حیثیت سے ہمیں مرحمت فرمائی، اب شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب کی غیبت کے باعث مولوی صاحب کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوگیا، یعنی اب وہ شیخ الحدیث بھی تھے اور دارالعلوم

کے مہتمم بھی، ان دونوں ذمہ داریوں کو اپنے معیار کے مطابق انہوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔

جس سال میں دہلی (جامعہ) گیا ہوں، اسی سال میں شدید ملیریا میں مبتلا ہوا۔ علاج کی طرف توجہ نہ کی، مرض بڑھتا گیا اور بگڑتا گیا، کئی مہینے کے بعد زندگی سے مایوس ہو کر میں وطن کے قصد سے روانہ ہوا، ندوہ پہنچا اور مجیب اللہ صاحب (ندوی، ایم، اے، علیگ) کے ہاں مقیم ہوا، ان کا اصرار تھا کہ لکھنؤ میں علاج کراؤں، مولوی صاحب کو اطلاع ہوئی وہ بھی اپنے مریض کو دیکھنے تشریف لائے، بڑی دیر تک تشریف فرما رہے، اور اصرار فرماتے رہے، کہ میں لکھنؤ میں علاج کراؤں، مجھے یقین تھا، میں بچوں گا نہیں، اسی لیے میں وطن جانا چاہتا تھا کہ وہیں آسودۂ خاک ہوں، میں نے کسی کی نہ سُنی اور وطن چلا گیا۔

میں ہی نہیں میرے دوست خود مولوی صاحب میری زندگی سے مایوس تھے، عبدالسلام میرے بعد لکھنؤ آئے انہوں نے مجیب اللہ صاحب کو ورغلایا وہ بیچارے ڈاکٹر عبدالعلی کے پاس گئے انہیں خیرآباد جانے کی زحمت اٹھانے پر آمادہ کیا۔ پھر ٹیکسی کا انتظام کیا اور ڈاکٹر صاحب کو لے کر خیرآباد پہنچ گئے۔

مولوی صاحب سے ضبط نہ ہوا، وہ بھی خیرآباد تشریف لائے، شام کی گاڑی سے مجیب وغیرہ بھی پہنچ گئے، ڈاکٹر صاحب کی معجز نما دوا نے حیرت انگیز فائدہ کیا، ایک ہفتہ میں بالکل تندرست ہو گیا، لکھنؤ آیا، عمران خاں نے دو قسم کا گوشت اور کئی قسم کی مٹھائیاں دسترخوان پر جمع کی تھیں، میں نے اس طرح کھایا جیسے بیمار ہی نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کی حذاقت کا میں ہمیشہ سے قائل تھا، اب ان کی مسیحا نفسی کا بھی قائل ہو گیا۔

ندوہ کی انجمن طلبائے قدیم عرصہ ہوا مرحوم و مغفور ہو چکی تھی، ہم اب ندوہ کے طالب علم نہیں تھے لیکن ''قدیم طالب علم'' تو تھے، ہمارے اس حق سے کون انکار کر سکتا تھا، جامعہ میں رہ کر ہم نے انجمن طلبائے قدیم کو زندہ کیا، صرف زندہ ہی نہیں کیا اس میں حرکت اور عمل کی لہر پیدا کر دی، دو تین بڑے شاندار سالانہ جلسے ہوئے، ایسے شاندار جو ندوہ کی تاریخ میں یادگار رہیں گے، پہلا جلسہ شاید ۳۲ء میں بڑے دن کی تعطیلات میں ہوا تھا۔ دور دور سے لوگ شرکت کے لیے آئے تھے، مجلس استقبالیہ کی طرف سے مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام تھا، میں بھی مہمانوں کے کیمپ میں مقیم ہوا، اور بھی کئی دوست ساتھ تھے، مولوی صاحب تشریف لائے، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد شکایت کی کہ تم یہاں کیوں ٹھہرے؟ تمہیں تو میرے ساتھ ٹھہرنا چاہیے تھا، اچھا اب چلو اور وہیں رہو، مولوی صاحب اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جو اپنا ہو وہ کہیں اور ٹھہرے کہیں اور کھائے، کسی اور کا مہمان ہو، صرف عمران خاں کے بارے میں مولوی صاحب نے مجھے مستثنیٰ کر رکھا تھا، میرے ان کے تعلقات سے وہ واقف تھے، اس لیے اس معاملہ

میں دخل نہیں دیتے تھے، البتہ کہیں اور ٹھہر جاؤں تو مولوی صاحب اسے برداشت نہیں کرتے تھے۔ جب مولوی صاحب دعوت کرتے، گوشت خود لاتے، اپنی خاص نگرانی میں اور کبھی کبھی اپنے دست مبارک سے پکاتے تھے، جانتے تھے مجھے گوشت کا بہت شوق ہے، زیادہ سے زیادہ بوٹیاں مجھے مرحمت فرماتے آخر وقت تک ان کا اصرار جاری رہتا تھا، میاں کھاؤ، ابھی کھایا ہی کیا ہے اور کھاؤ، لو یہ بوٹی۔

میرے اور عبدالسلام صاحب کے تعلقات ہمیشہ سے کچھ عجیب وغریب قسم کے رہے ہیں۔ مولوی صاحب ہم دونوں سے اتنے ہل مل گئے تھے، کہ کوئی تکلف نہیں رہ گیا تھا، اگر چہ حفظ مراتب میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، مولوی صاحب عبدالسلام صاحب کو''عبدالسلام''نہیں ''عبدرئیس'' کہتے تھے، بات یہ تھی کہ یہ حضرت اپنی زبان کبھی بند نہیں کرتے تھے موقع بے موقع بحث پر ہمیشہ تیار رہتے تھے، اور کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ جاتے تھے، جو بعض اوقات طوفان خیز بن جاتی تھی، اس سلسلے میں مجھ سے اکثر نار وا حرکتیں ان کی ''اصلاح وتربیت'' کے لیے سرزد ہوتی رہتی تھیں جو''ضرب خفیف'' سے شروع ہو کر نہ معلوم کہاں کہاں تک پہنچتی تھیں، مولوی صاحب کو میرے ان کے یہ تعلقات اتنے بھائے کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے ''میاں اپنے عبد کو ڈانٹو'' میں ڈانٹتا تو مولوی صاحب بڑی دیر تک لطف لیتے رہتے، کبھی فرماتے''میاں'' تمہارے عبد نے یہ کیا! گویا مولوی صاحب نے ان کی شکایت کی اور اب چاہتے تھے کہ ان کے سامنے میں اپنے ''عبد'' کی اصلاح وتربیت کروں، جب میں ارشاد کی تعمیل کرتا کن الفاظ میں کہوں مولوی صاحب پر اہتزاز اور انبساط کی کیسی کیفیت طاری ہوتی تھی، وہ قہقہہ لگا کر کبھی نہیں ہنستے تھے لیکن اس موقع پر ان کے دہن مبارک سے قہقہہ کی ہلکی سی آواز نکلنے لگتی تھی، کبھی میں نہ ہوتا اور مولوی صاحب عبدالسلام صاحب کو چھیڑنا چاہتے تو فرماتے اچھا رئیس کو آنے دو، اس سے کہوں گا۔

مولوی صاحب کی تنخواہ اگر چہ سو روپے سے نہیں بڑھی، لیکن وہ اتنے فراخدل تھے کہ یہ ساری آمدنی ان کی مہمانداریوں، دوست نوازیوں، غریب طلبہ کی اعانت اور مفت خوروں کی دلجوئیوں پر صرف ہو جاتی تھی، پنجاب یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور بعض دوسری جگہوں کے ممتحن بھی تھے، اس طرح سال بھر میں انہیں چار پانچ سو روپے مل جاتے تھے، لیکن یہ رقم بھی کم ایسا ہوتا تھا کہ ان کی ذات پر خرچ ہوتی ہو، وہ کسی درجہ میں بھی روپیہ کو عزیز نہیں رکھتے تھے، روپیہ ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا، وہ حقیقتاً اسے ہاتھ کا میل سمجھتے تھے، آیا اور گیا۔

جو لوگ ان کی اس اُفتادِ طبیعت سے واقف تھے وہ ان کی اس عادت سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے

تھے۔ ''قرض'' لے لیا، اب نہ مقروض صاحب دیتے ہیں نہ مولوی صاحب مانگتے ہیں بات آئی گئی ہوگئی، میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے قرض لے لے کر مولوی صاحب کو سخت دشواریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیا، ان کی زبان مبارک شکوہ سے آلودہ نہ ہوئی، انہوں نے تقاضا بھی نہیں کیا، نادہند مقروض کی صورت دیکھ کر وہ خود شرما جاتے تھے۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

طبیعت بالکل بچوں کی سی پائی تھی، وہی سادگی، وہی بھولا پن، وہی معصومیت، وہی بے فکری جو بچوں کی خصوصیت ہوتی ہے مولوی صاحب کی بھی تھی، کھانا جیسا مل گیا کھا لیا، کپڑا جیسا میسر آیا پہن لیا، چارپائی ہوئی تو اس پر آرام فرمایا، فرش ہوا تو اس پر استراحت فرما گئے۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب کسی کام سے ڈاکٹر صاحب کے پاس امین آباد تشریف لے جا رہے تھے میں اور عبدالسلام صاحب ساتھ تھے شاید دسمبر یا جنوری کا مہینہ تھا ہم دونوں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے پھر بھی سردی سے ٹھٹھرے جا رہے تھے مولوی صاحب اس شان سے بالا خانہ سے برآمد ہوئے کہ پاؤں میں نری کا سُرخ جوتا (کاش وہ مل جائے اور اس کی خاک آنکھوں کی زینت بن سکے) جسم مبارک پر وہی گاڑھے کے کپڑے، سر پر پگڑی، کاندھے پر سرخ رومال، روئی کا ایک شلوکہ بھی پہنے ہوئے تھے، لیکن اس ٹھاٹھ کے ساتھ کہ اس کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے۔ میں نے کہا، مولوی صاحب بٹن لگا لیجئے، فرمایا میاں بٹن لگاتے ہوئے میں گھبراتا ہوں، میں نے عرض کیا ''سردی بہت ہے'' ارشاد ہوا میاں سردی نوجوانوں کو بہت لگتی ہے۔ اصل میں وہ اپنی آن کے خلاف سمجھتے تھے کہ شلوکہ کے بٹن لگائیں، جب انہوں نے جوانی میں یہ نہیں کیا تو اب بڑھاپے میں کیوں کریں؟ آگے بڑھے موتی محل کے پل پر پہنچے، اب تو مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں کھڑا ہوا، مولوی صاحب بھی کھڑے ہوگئے، میں نے بے کچھ کہے سنے شلوکہ کے سب بٹن لگا دیے وہ مسکراتے رہے اور میری اس گستاخی پر ذرا بھی برہم نہ ہوئے۔

مولوی صاحب جس طرح اپنے ظاہری فضل و کمال سے بے پروا اور بے خبر تھے اسی طرح اپنے باطنی عروج و ارتقاء کا احساس بھی نہیں فرماتے تھے، وہ جس طرح متبحر عالم تھے، اسی طرح ایک برگزیدہ صوفی بھی تھے، لیکن جس طرح ان کے علم و فضل پر خاکساری کا پردہ پڑا ہوا تھا، اسی طرح ان کا روحانی عروج و ارتقاء بھی پردۂ خفا میں مستور رہتا تھا۔

ہمہ وقت مولوی صاحب باوضو رہتے تھے، جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو، جاڑے میں ان بے

چارے کو گرم پانی کہاں سے ملتا، لیکن وہ ضعیفی اور پیرانہ سالی کے باوجود ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے، بے وضو رہنا کسی حالت میں بھی انہیں گوارا نہ تھا۔

ان کے زہد و عبادت کے معمولات بھی ایسے تھے کہ چشم ظاہر پرکھ نہیں سکتی تھی کہ وہ عابد اور زاہد ہیں، تہجد کی نماز بالالتزام پڑھتے، پھر فجر تک اَوراد و وظائف میں مشغول رہتے، نماز فجر غلس میں پڑھتے، پھر چہرہ انور پر رومال ڈال کر اپنے معمولات ادا کرتے، یہاں تک کہ اشراق کا وقت آ جاتا، پھر اس سے فارغ ہوتے۔

کم لوگ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب حضرت شیخ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت تھے، صرف بیعت نہیں مجاز بھی، وہ خود اسے اس طرح چھپاتے تھے جیسے کوئی بڑا راز ہے اور اس راز کا افشا کوئی بڑی معصیت!

حق بات کہنے میں، علم کا وقار قائم رکھنے میں وہ مرعوب ہونا، بڑی سے بڑی شخصیت سے متاثر ہونا، دارالعلوم کے حکام والا مقام اور ارکان والاشان سے مداہنت کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہ تھے، اگر کوئی علم کی توہین کرتا تھا، علماء کا وقار مجروح کرتا تھا، اپنی جہالت کے زعم میں خود اپنے تئیں علامۂ دوران سمجھنے لگتا تھا، اقتدار کی ترنگ میں اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا تھا، پھر مولوی صاحب قابو میں نہیں رہتے تھے، وہ سامنے بھی بہت کچھ کہتے تھے، اور جب پس پشت موقع آ جاتا بحث چھڑ جاتی تھی، تو بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، ان کے طنزیات لطیف مستقل سامان وجد و کیف ہوتے تھے۔

''اپنے'' طالب علموں کا وہ دوسروں سے بھی اتنا ہی احترام کراتے تھے جتنا خود ان کا کیا جاتا تھا، ایک مرتبہ نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی لکھنؤ تشریف لائے، اور حسب معمول منشی احتشام علی صاحب کے دولت کدہ واقع خیال گنج میں اقامت پذیر ہوئے۔

مولوی صاحب امراء، رؤسا سے ملنے میں بہت ہچکچاتے تھے، وہ اسے علم و فن کے خلاف شان سمجھتے تھے، کہ علماء اُمراء کے دربار میں جائیں، ان کے دولت کدوں کا طواف کریں، ان کی ڈیوڑھیوں پر بار بار پہنچیں، لیکن شیروانی صاحب اس اصول سے مستثنیٰ تھے مولوی صاحب اس کے قائل تھے کہ وہ ''عالم'' ہیں، وہ بھی مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے، مولوی صاحب کے جی میں آیا کہ منشی صاحب کے یہاں جا کر ان سے ملیں۔ ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے ''صلاح'' پوچھی، ہم نے تائید کی، تیار ہو گئے، اپنے ساتھ مجھے اور عبدالسلام کو بھی لیتے گئے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا، کوٹھی کے صحن میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، دھوپ میں منشی صاحب اور شیروانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، دوسری کرسیوں پر کچھ اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے، صرف ایک کرسی خالی تھی، شیروانی صاحب بڑے تپاک سے ملے اٹھ کر مصافحہ کیا اور کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا "تشریف رکھیے" مگر مولوی صاحب کہاں بیٹھنے والے تھے؟ "میاں جب تک ہمارے ساتھی (ہم دونوں) نہ بیٹھیں، ہم کیسے بیٹھ جائیں؟ خود بھی کھڑے رہے اور اپنے ساتھ حاضرین کو بھی کھڑا رکھا، جب تک اور کرسیاں نہ آ گئیں، اور ہم لوگ نہ بیٹھ گئے وہ کسی طرح نہ بیٹھے، ان کی یہی شان تھی، وہ اپنے شاگردوں کو حقیر اور کم مایہ نہیں سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو ٹونک کا ویرانہ پسند تھا، اپنے اس وطن کو وہ ہندوستان کے تمام مقامات سے بہتر اور برتر سمجھتے تھے، وہاں کی ندی کا پانی ان کے نزدیک اتنا ہاضم تھا کہ جب اس کے فضائل بیان کرتے تو سفوف جالینوس اور نمک سلیمانی بھی اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے۔

ٹونک کے در و دیوار سے بھی انہیں محبت تھی، وہاں کے عہد گزشتہ کی کہانیاں بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے، وہاں کی عدالت میں داڑھی منڈوں کی گواہی قاضی نہیں قبول کرتا، اس پر مولوی صاحب کو بڑا فخر تھا۔ وہ اپنے وطن کی اس "اسلامیت" پر نازاں تھے ہم لوگ گوش ہوش سے ان کی یہ پیاری پیاری باتیں سنا کرتے، اسی دوران میں وہ دعوت بھی دیتے کہ میاں ایک دفعہ ٹونک ضرور آؤ، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں یہ تمنا پوری نہ ہوئی، البتہ جامعہ کے زمانہ طالب علمی میں اتفاقاً یہ آرزو برآئی۔

میں جامعہ میں جب داخل ہوا تو پاس ہی طبیہ کالج میں میرے ابتدائی دور کے ایک ندوہ کے ساتھی نصیر الدین صاحب (مولانا معین الدین صاحب اجمیری سابق صدر جمعیت العلماء ہند اور غازی محی الدین صاحب اجمیری سکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی کے بھتیجے اور شفاء الملک حکیم نظام الدین صاحب کے فرزند سعادت مند) بھی پڑھتے تھے۔ ہم دونوں کے ندوہ میں بہت گہرے مراسم تھے۔ اب کئی برسوں کے بعد دہلی میں ملاقات ہوگئی، تو عہد ماضی اور زیادہ جوش اور سرگرمی سے تازہ ہوگیا، ان کا فاضل وقت میرے پاس "محمد علی ہوسٹل" میں صرف ہوتا تھا، میرے فرصت کے اوقات ان کے بورڈنگ ہاؤس میں گزرتے تھے، ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ اجمیر گیا، اور وہاں جا کر میں نے ٹونک چلنے کا تقاضہ کیا، چناں چہ دوسرے روز ہم لوگ ٹونک روانہ ہوگئے، شام کو پہنچے، نصیر صاحب اپنے تعلقات کے سبب حکیم برکات احمد صاحب مرحوم کے ہاں ٹھہرے، اور مجھے بھی زبردستی (ان کی اس طرح کی زبردستیوں کا میں ہمیشہ تختۂ مشق

بنا رہا ہوں) وہیں ٹھہرایا۔

ٹونک پہنچ کر نصیر صاحب نے کہا ''صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ عید اگر اجمیر میں نہ ہوئی تو والد صاحب بہت خفا ہوں گے، اور اب اتنا ہی وقت ہے کہ آج کی رات رہو اور صبح ہوتے ہی چل دو'' یہ الفاظ کچھ ایسے خوف و دہشت کے لہجے میں انہوں نے کہے کہ میں بھی راضی ہو گیا، حالاں کہ تکلیف بہت ہوئی، سوچا یہ تھا کہ ٹونک میں دو تین دن رہیں گے، لیکن ایک دن بھی رہنے کا موقعہ نہ ملا۔ افطار کے بعد ہم دونوں مولوی صاحب کے علم کدہ پر پہنچے، گھر کے پاس ہی مسجد تھی، مولوی صاحب کے بڑے بھائی حضرت مولانا محمود حسن خاں صاحب (صاحب معجم المصنفین) وہاں معتکف تھے، مولوی صاحب بھی انھی کے پاس تشریف رکھتے تھے، اچانک ملاقات ہوئی، بہت خوش ہوئے بچھ بچھ گئے، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں دوسری جگہ ٹھہرا ہوں تو بہت برہم ہوئے، بار بار شکوہ فرماتے تھے۔ ''میاں آئے بھی تو بس اتنی دیر کے لیے!'' میں نے کھانا وہیں کھایا، مولوی صاحب کا بس چلتا تو سارے گھر کو بھوکا رکھتے اور جو کچھ تھا (ماشاءاللہ بہت کچھ تھا) سب مجھے نوش جاں کرا دیتے۔

انہیں بڑی تمنا تھی کہ مجھے ٹونک کی سیر کراتے، وہاں کا قلعہ، وہاں کی جامع مسجد، وہاں ان کا بنایا ہوا مدرسہ فرقانیہ یہ سب مجھے دکھاتے، لیکن اب رات ہو چکی تھی۔ اور صبح یہ مسافرت ختم ہونے والی تھی، اب کیا ہو؟ مولوی صاحب سب سے زیادہ اسی بات پر ملول تھے۔

لیکن مولوی صاحب آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے اسی وقت انہوں نے لالٹین سنبھالی اور تیار ہو گئے ''چلو میاں'' ان کی اس جواں ہمتی پر میں عش عش کر گیا! ابھی افطار و طعام سے فارغ ہوتے ہیں ذرا دیر بھی آرام کا موقعہ نہیں ملا، اور اب کئی میل پیدل چلنے پر تیار ہیں، آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں، ہم دونوں چلے، پہلے تو مولوی صاحب نے وہاں کا بازار دکھایا پھر دور سے وہاں کا قلعہ دکھایا جو اندھیرے اور کہر کے سبب مجھے نظر نہ آیا، لیکن اس خیال سے کہ مولوی صاحب مزید تکلیف نہ کریں، میں نے اس کی خوش نظری کی پورے شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ تعریف کر دی، مولوی صاحب آگے چلے اب جامع مسجد پہنچے اس کا ایک ایک در دکھا رہے ہیں، اس کی مضبوطی، پختگی اور خوب صورتی اور خوشنمائی کے گن گا رہے ہیں۔ لالٹین اٹھا اٹھا کر اس کے ہر مینارہ کی مینا کاری اور صنعت پر خاص توجہ دلا رہے ہیں، یہاں سے نکلے تو اب انہوں نے اپنا قائم کیا ہوا مدرسہ فرقانیہ دکھایا۔ جس میں قرآن شریف قرأت، اور ابتدائی عربی کی تعلیم ہوتی تھی، یہ مدرسہ مولوی صاحب نے قائم کیا تھا، اس پر بڑی محنت کی تھی، اس کی ترقی پر ان کی توجہ

ہمیشہ مرکوز رہتی تھی، خدا کے فضل سے اس وقت تک کامیابی سے چل رہا ہے۔

تقریباً گیارہ بجے ہم اس راؤنڈ سے فارغ ہوئے، میں نے چاہا کہ مولوی صاحب اپنے مکان تشریف لے جائیں، لیکن میں مہمان تو انہیں کا تھا، یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ "مہمان" کو تنہا چھوڑ دیں؟ وہ میری قیام گاہ تک تشریف لائے، بڑی دیر تک جلوہ فرما رہے، زیادہ تر علمی اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر رات گئے تشریف لے گئے۔

صبح اٹھتے ہی ہم لوگ جے پور روانہ ہوگئے، وہاں کچھ دیر قیام کر کے اجمیر چلے گئے عید کا چاند ریل میں دیکھا اور عین نماز کے وقت اجمیر پہنچے۔

مولوی صاحب عام علماء کرام کے برعکس عربی بے تکلفی سے بولتے تھے لکھتے بھی روانی سے تھے، فارسی پر بھی اچھا خاصا عبور تھا، لیکن اردو کا شاید بالکل مطالعہ نہیں کیا تھا، پچھلے زمانہ کے لوگ اردو کو کم مایہ اور حقیر زبان سمجھتے تھے اس لیے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے تھے، مولوی صاحب بھی پرانے زمانے کے آدمی تھے، اور اردو زبان کی افادیت اور اہمیت کے قطعاً معترف نہیں تھے، پھر بھی کوئی اچھی کتاب مل جاتی تھی، تو اسے شوق سے پڑھتے تھے اور اس کی تعریف میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

مولوی صاحب کے لیے سب سے زیادہ دقت آزما کام اردو میں کچھ لکھنا ہوتا تھا، اب وہ اتالیق تھے، ہر روز لکھنے سے انہیں کام رہنے لگا، ہر درخواست انھی کے توسط سے جاتی اور اس پر انہیں رائے لکھنی پڑتی، اردو رسم الخط میں مولوی صاحب یائے معروف و مجہول کا فرق نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے "بخار" کی وجہ سے ایک روز کی درخواست دی، وہ طالب علم کا دل بھی رکھنا چاہتے تھے اور جھوٹ بولنا بھی انہیں منظور نہ تھا اس لیے کہ درخواست دہندہ کو بخار نہیں تھا، مولوی صاحب نے اس درخواست پر تحریر فرمایا: "یہ کہتی ہیں کہ انہیں بخار ہے، لہٰذا ایک روز کی رخصت دی جائے" اس پر مجھے بہت ہنسی آئی بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ ان کا رسم الخط یہی ہے۔

قرآن شریف مولوی صاحب خاص لحن سے پڑھتے تھے، اتنا مؤثر دلنشین اور موہ لینے والا لحن جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ عربی میں وہ خطبہ دیتے تھے، وہ بھی اسی طرز کا ہوتا تھا، انہوں نے جب سے جمعہ کی نماز پڑھانا شروع کی، بیرونی نمازیوں (لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ) کی تعداد میں غیر معمولی اور نمایاں اضافہ ہوگیا تھا۔

ان کی دھج ایسی ہوتی تھی کہ دیکھنے والے پر رعب بھی پڑتا اور اثر بھی، ان کی سادگی پر ہزاروں

بناوٹیں قربان، پاؤں میں نری کا سُرخ جوتا، دبلا بدن، میانہ قد، بڑی بڑی مخمور آنکھیں، ریش مبارک سفید، سر پر ایک پگڑی، اونچا پائجامہ، نیچا کرتہ، چلتے اس طرح سے تھے جیسے ڈھلوان جگہ سے کوئی اتر رہا ہو، رفتار خاصی تیز۔

آواز گرجدار نہیں تھی لیکن پُر وقار تھی، انداز میں خاکساری نمایاں، جس سے ملتے جھک کر ملتے، ترفع نمود اور نمائش کے جذبے سے کوسوں دور، وہ دل کھول کر ملتے تھے، چاہتے تھے دوسرے بھی ایسے ہی ملیں، کاٹ پیچ کے آدمیوں سے دور رہتے تھے، بعض دفعہ ایسے لوگوں کے منہ پر ان کی کمزوری ظاہر کر دیتے تھے۔

ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، ان کی طبیعت ایک سادہ ورق تھی، ان کا مزاج، ان کے عادات واطوار، ان کے شمائل وخصائل سب میں اسلامیت للہیت اور شائستگی کا جلوہ نمودار رہتا تھا۔

وہ خفا ہوتے تھے تو اپنی خفگی کو چھپاتے نہیں تھے، جتنے خفا ہوتے تھے اس سے زیادہ کا اظہار کرتے تھے۔ پھر جب خوش ہوتے تھے تو اس طرح گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، ہمارے دو ساتھیوں سے وہ اسٹرائک کے زمانے میں بہت خفا تھے، اس خفگی کا علی الاعلان اظہار بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ یہی ذکر چھڑا، ان کی خفگی کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کی تمازت اور حدت سے معتوبین جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے۔ میں نے خوشامد کی، نہیں مانے۔ التجا کی، شرف قبول سے محروم رہی۔ سفارش کی، رد کر دی گئی۔ پھر ان کا سراپا نور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما اور ان دونوں کو معاف کر دینے کی استدعا کی مولوی صاحب ذرا ٹھنڈے ہوئے، میری خوشامد کا سلسلہ جاری رہا، تھوڑی دیر کے بعد ان کا آئینہ کی طرح صاف شفاف دل گرد وغبار سے پاک ہو گیا، سب کچھ بھول گئے، سب کچھ معاف کر دیا۔ یا تو وفورِ غضب سے چہرہ تمتمایا ہوا تھا یا جوش مرحمت میں پھول کی طرح کھل گیا۔

ان دونوں معتوبین میں سے ایک صاحب بعد میں ندوہ کے دفتر میں ملازم ہو گئے، مولوی صاحب ان سے اب اس طرح پیش آئے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، ان کی خفگی افسانہ پارینہ بن چکی تھی، انہوں نے اپنی سعادت مندی، خدمت گزاری اور طاعت کیشی سے مولوی صاحب کا دل موہ لیا، پھر تو وہ ان سے اتنے خوش ہوئے کہ قریب قریب انہیں اپنا معتمد علیہ بنا لیا۔

وہ داڑھی پر، نماز کی پابندی پر، وضع اسلامی پر زور دیتے تھے، لیکن ان کی خوشی اور خفگی کا معیار جداگانہ تھا، اس کا ان چیزوں سے تعلق نہیں تھا، وہ صورت نہیں دل دیکھتے تھے ان کی نگاہیں دل کی

گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں۔ دل کے معائنہ کے بعد وہ جو رائے قائم کرتے تھے اس میں تبدیلی کم ہوتی تھی، ان کے کئی ایسے شاگرد تھے جن کی داڑھی یک مشت دو انگشت کے حدود سے تجاوز کر چکی تھی اسلامی وضع بھی رکھتے تھے، نماز کے بھی پابند تھے، ان کی خدمت گزاری میں بھی سرگرم رہتے تھے، ان کی ہر بات کی تائید بھی کرتے تھے وہ اگر دن کو رات فرمادیں تو وہ لوگ

"ایں ماہ پروین"

کا نعرہ لگانے لگیں، لیکن ان سے مولوی صاحب ذرا بھی خوش نہیں تھے۔ بعض اوقات تو بری طرح جھڑک دیتے تھے، کبھی ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے، کبھی ان کی باتوں سے اثر نہیں لیتے تھے، کبھی اپنا شریک حلقہ نہیں بناتے تھے، برعکس ازیں بعض ایسے طلباء تھے جو اس سختی سے شرائط بالا پورے نہیں کرتے تھے، انہیں مولوی صاحب تنبیہ کرتے رہتے تھے، سمجھاتے رہتے تھے ان کی اصلاح میں برابر سرگرم رہا کرتے تھے لیکن دل کے معائنہ کے بعد انہیں "اپنا لیتے" تھے، انہیں زیادہ سے زیادہ چاہتے تھے، ان کی ہر بات مانتے تھے، ان کا خیال رکھتے تھے، اثر قبول کرتے تھے۔

دل کے پہچاننے کا کمال مولوی صاحب میں ایسا تھا کہ طبقۂ علماء میں بالخصوص یہ چیز بہت کم ملے گی، یہ حضرات زیادہ تر ظواہر کو دیکھتے ہیں رائے قائم کر لیتے ہیں اور اکثر غلط رائے قائم کرتے ہیں، مولوی صاحب کی نظر بطون پر رہتی تھی، اس لیے ان کی رائے بہت کم غلط ہوتی تھی، اور انہیں اپنے فیصلہ میں شاذ و نادر تبدیلی کرنی پڑتی تھی۔

دسمبر ۱۹۳۳ء میں ندوہ کی مسجد کا افتتاح تھا، اس میں شرکت کے لیے میں دہلی سے آیا تھا، اسی زمانہ میں سید مرتضیٰ بہادر کی زیر صدارت لکھنؤ میں خلافت کانفرنس ہو رہی تھی، وہیں خلافت کی ادارت کے معاملے طے ہوئے اور جنوری ۱۹۳۴ء کے آغاز میں میں بمبئی روانہ ہو گیا۔

میں بمبئی روانہ ہوا چلتے وقت مولوی صاحب نے نصیحت فرمائی میاں علم کی مزاولت جاری رکھنا، اس جملہ کو بار بار فرمایا، کچھ سوچتے اور یہی فرماتے۔

بعض اہم مسائل پر مولوی صاحب نے عربی زبان میں چھوٹے چھوٹے رسالے املا کرائے تھے، ان کی تمنا تھی یہ عام ہوں، پھیلیں اور اشاعت پائیں تاکہ لوگ مستفید ہوں، ان میں ایک رسالہ ایسا تھا جو ان کی تحقیق و تدقیق، محنت و مطالعہ، دقت خیال اور وسعت نظر، کاوش و جستجو کا شاہکار کہا جا سکتا تھا، لیکن اس کے مندرجات کم علم اور کم سواد لوگوں کے لیے گمراہی کے موجب بھی ہو سکتے تھے مولوی صاحب اس کی

اشاعت کے خاص طور پر شائق تھے، میں نے کہا مولوی صاحب اس رسالہ کی عام اشاعت اُردو تو اُردو، عربی بان میں بھی مناسب نہیں ہے، فرمایا "کیوں میاں" میں نے عرض کیا "آپ کا یہ رسالہ مضمون بہ بغیرلہلہ" ہے، بہت ہنسے، بڑی دیر تک لطف لیتے رہے، بار بار اس لفظ کو فرماتے دہراتے اور تبسم فرماتے۔

مسئلہ حجاب اور طلاق پر بھی انہوں نے بڑی دماغ کاوی اور دیدہ ریزی سے الگ الگ رسالے لکھے تھے۔ ان میں سے پہلا رسالہ میں ۱۹۳۷ء میں اپنے ساتھ بمبئی لے آیا، بمبئی میں بہتر سے بہتر عربی ٹائپ موجود تھا اور لکھنؤ میں بدتر سے بدتر ٹائپ ملنے میں بھی دشواریاں تھیں، میں اگر لیتھو میں چھاپنا چاہتا تو بڑی آسانی سے خلافت پریس میں چھاپ سکتا تھا، لیکن میں چاہتا تھا اس رسالہ کی اشاعت بلاد اسلامیہ میں بھی ہو، اور وہاں کے لوگ ٹائپ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ لیتھو کے عربی مطبوعات میں خواہ وہ کتنے ہی پُر مغز اور اہم ہوں ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔

بدقسمتی سے بعض ایسے موانع پیش آئے کہ وہ دو برس تک نہ شائع ہوسکا۔ آخر ۱۹۳۸ء میں میری کوشش اور ان کے ایک عزیز شاگرد مولوی خلیل شرف الدین صاحب الکتّی کی مہربانی سے وہ شائع ہوا، مولوی صاحب اسے مطبوعہ صورت میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، وہ چاہتے تھے، ان کی علمی تحقیق عام ہوجائے، لوگ جمود، قدامت اور "وجدنا علیہ آبائنا" کی گمراہی سے نکلیں، اپنے دماغ سے سوچیں، اپنی آنکھ سے دیکھیں، اپنے دل سے پرکھیں، جو پہلو مضبوط پائیں اسے اختیار کرلیں اور اسی پر عمل پیرا ہوں، وہ اپنے نور بصیرت کے متعلق خدا سے اقبال کے الفاظ کہا کرتے تھے

مرے قافلہ میں لٹادے اسے
لٹادے ٹھکانے لگادے اسے

مولوی صاحب کا استخارہ بڑے غضب کا ہوتا تھا، کبھی غلط پڑا ہی نہیں۔ جب کوئی مصیبت ہو پریشانی ہو تکلیف ہو اپنے لیے یا اپنے مخصوص عزیزوں اور شاگردوں کے لیے وہ استخارہ کرتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ نماز عشا کے بعد ایک مخصوص دعا پڑھتے تھے، اس میں اس بات کا ذکر بھی کرتے تھے جس کے لیے استخارہ کر رہے ہوتے تھے، پھر سو جاتے تھے، رات کو خواب میں اس امر کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کچھ معلوم ہو جاتا تھا، جو کچھ معلوم ہوتا تھا میرے علم میں وہ ہمیشہ صحیح ہوتا تھا، دو ایک واقعات میرے سامنے گزرے اور وہ بالکل مولوی صاحب کے استخارہ کے مطابق صحیح اور درست ثابت ہوئے۔

مولوی صاحب کشف وکرامت کے جذب وسلوک کے مدعی نہ تھے بیشک وہ صوفی تھے لیکن ان کی

طریقت شریعت سے جدا نہ تھی۔

ہندوستان کے نامور بزرگ شیخ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مسترشد تھے اور مجاز بھی تھے بیشک وہ صوفی تھے لیکن ان سب خصوصیتوں کو وہ چشم مردم سے پنہاں رکھتے تھے۔ ان کا اظہار و اعلان بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔

ہم دونوں پر (مجھ پر اور عبدالسلام صاحب پر) ان کی خاص نوازش تھی، علوم ظاہری کی طرح علوم باطنی بھی ہمیں گھول کر پلا دینا چاہتے تھے، ہماری روحانی اصلاح و تربیت ان کی بہترین آرزو تھی، ان کی مرضی تھی کہ ہم ان سے بیعت ہو جائیں، ایک روز ندوہ کی مسجد میں ہم دونوں نماز فجر کے بعد ان کے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے۔

خوشا روزے و خرم روز گارے

یہ کتنی بڑی سعادت تھی لیکن کتنے بڑے بدبختوں کے حصے میں آئی جو ہرگز اس کے اہل نہ تھے۔

۱۹۳۹ء میں دہلی میں راقم الحروف کا نکاح ہوا، میری تمنا تھی مولوی صاحب بھی اس میں شریک ہوں صرف شریک ہی نہ ہوں، وہی نکاح بھی پڑھائیں، وہ چپ چپاتے دہلی روانہ ہو گئے، اتفاق سے اسی گاڑی سے میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد جعفری بھی شرکت کے لیے تشریف لا رہے تھے، انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ مولوی صاحب دہلی اسی مقصد کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں، انہوں نے پوچھا آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ فرمایا جہاں تم جا رہے ہو میاں۔ بھائی صاحب نے لاکھ لاکھ مختلف ترکیبوں سے پوچھا لیکن انہوں نے نہ بتانا تھا نہ بتایا، دہلی کے اسٹیشن پر میں استقبال کے لیے موجود تھا، اب بھائی سمجھے کہ مولوی صاحب کیوں تشریف لائے ہیں۔

دہلی سے روانہ ہونے لگے تو خیر و برکت کی بہت سی دعائیں دیں، اس خلوص و اپنائیت سے جس کی مولوی صاحب کے پاس کمی نہ تھی، لیکن اب ان کے بعد یہ جنس نایاب ہے، ناپید ہے، عنقا ہے۔

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں؟

میں اسٹیشن تک پہنچانے گیا، ان کا بستر کیا، اصرار کیا کہ وہ استراحت فرمائیں، ان کا مزاج بھی کچھ ناساز تھا فوراً لیٹ گئے، گاڑی روانہ ہوئی، اور میں، نہ معلوم کیا سوچتا ہوا واپس آ گیا۔

آخری ملاقات ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی، اس کے کچھ دنوں بعد مولوی صاحب بعض حالات سے دل برداشتہ ہو کر، کچھ وطن کی کشش سے مجبور ہو کر ٹونک چلے گئے۔

وہ اپنی خودداری پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دیتے تھے، ٹونک جاکے مالی اعتبار سے وہ بہت تکلیف میں رہے لیکن انہیں یہ اطمینان تھا کہ اب ''نوکر'' نہیں ہیں، اب ضعیفی بھی غالب آچکی تھی، عمر تقریباً ۷۵ سال کی ہوگی، تقریباً دو سال تک اپنے وطن میں علم وفن کے فیوض سے لوگوں کو مستفید کرتے رہے پھر وقت گیا، وہ وقت جو آکر کبھی نہیں ٹلتا جو نہ جوان کے ساتھ رعایت کرتا ہے، نہ بوڑھے کے ساتھ، وہ موت سے خائف نہیں تھے۔

نشانِ مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید، تبسم بر لب اوست

ان کا وقت جب آیا تو وہ پوری تیاری کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے اور رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

مبارک ہے وہ سرزمین جس کے سینہ پر حیدر حسن خاں کا جسم نورانی ہیشگی کی نیند کے لیے رکھا گیا۔ وہ حیدر حسن جو علم کی زینت تھا، جس کے دم سے قال الرسول کی محفلیں آباد تھیں، جس کا وجود قال اللہ کہنے والوں کے لیے شمع ہدایت تھا، جو ''قال اقول'' اور قیل وقال کرنے والوں سے روگرداں رہتا تھا، جس کا جسم پھول کے مانند سبک، جس کی روح نور سے زیادہ لطیف۔

آہ اب ایسے لوگ کہاں ہیں جن پر انسانیت فخر کرے، اخلاق کو جن پر ناز ہو، کردار جن کے وجود سے روشن اور تاباں ہوں۔ ہوں گے کچھ لوگ ضرور ہوں گے، لیکن حیدر حسن کے سے نہ ہوں گے، ہماری نظر میں تو وہی ایک پیر مرد دانا تھا، جس کے ساتھ یہ سب خصوصیتیں رخصت ہوگئیں۔ اس ایک ہستی کے اٹھ جانے سے علم وفضل، تحقیق وتدقیق، انسانیت اور للہیت شرافت اور کرامت وقار اور ایثار، زہد وانکسار کی دنیا سونی ہوگئی۔

دوست ہوں یا عزیز، اُستاد ہوں یا بزرگ، ساتھی ہوں یا رفیق ہم ہر ایک کے سامنے ایک جداگانہ رنگ میں نظر آتے ہیں، دوست کے سامنے بے تکلف ہوجاتے ہیں اپنی کہتے ہیں اس کی سنتے ہیں، عزیز پر کوئی مصیبت ہو ہمارا خون جوش میں آجاتا ہے اور ہم سراپا عمل ہوکر اس کے مداوا میں مصروف ہوجاتے ہیں، استاد کی خدمت کرنا، احترام کرنا، اطاعت سے پیش آنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں، بزرگ کے سامنے ہم معصومیت کی تصویر بن جاتے ہیں، ہمہ تن گوش ہوکر اُس کی باتیں سنتے ہیں۔ اس کی زندگی سے سبق، اس کے کارناموں سے ہمت، اس کی عظمت سے ہدایت حاصل کرتے ہیں، ساتھی ہمارے کام آتا ہے، وہ

ہمیں سکھ پہنچاتا ہے ہم اس کے آرام کا خیال کرتے ہیں، وہ کچھ ہم سے چاہتا ہے ہم کچھ اس سے تقاضہ رکھتے ہیں، رفیق سے ہمارا ناطہ بس کام تک ہوتا ہے، کوئی ایک بات ہے جس میں وہ ہمارا ہم اس کے رفیق پھر اس کی منزل اور ہمارا راستہ جدا، یہی وجہ ہے کہ ہم دوست کے سامنے جو کچھ ہوتے ہیں عزیز کے سامنے نہیں ہوتے، استاد کے سامنے ہمارا جو رنگ ہوتا ہے بزرگ کے سامنے نہیں ہوتا، ساتھی ہمارا جو روپ دیکھتا ہے، رفیق اس کا درشن نہیں کر پاتا، یہ ہماری انفرادی حیثیتیں ہیں جو اسی وقت اُجاگر ہوتی ہیں۔ جب ان کا محل ہو، موقع ہو۔

مولوی صاحب ہمارے دوست بھی تھے اور عزیز بھی، استاد بھی اور بزرگ بھی، ساتھی بھی اور رفیق بھی، ہر رنگ میں ہم نے انہیں دیکھا پرکھا جانچا اور کھرا پایا، وہ دوست کی حیثیت سے ہمارے راز دار، عزیز کی حیثیت سے ہمارے جان نثار، استاد کی حیثیت سے رہبر، بزرگ کی حیثیت سے اخلاق ونصیحت کے پیام بر، ساتھی کی حیثیت سے دکھ اور درد کے ساتھی، رفیق کی حیثیت سے تن من دھن سے ہر کام میں شریک، ہمارے لیے تعین مشکل ہے کہ وہ ہمارے کیا تھے، ہم ان کے کیا تھے، ہم ان کی خاک پا بھی نہیں تھے لیکن وہ ہمارے سب کچھ تھے، بہت کچھ تھے اور ایسے کچھ تھے جس کا بیان لفظ وعبارت کی مدد سے ناممکن ہے۔

ہم نے انہیں دور سے بھی دیکھا اور نزدیک سے بھی، غصہ میں بھی اور عالم مرحمت میں بھی، تلخ اور کھری نکتہ چینی کرتے بھی اور تعریف وتوصیف کے دریا بہاتے ہوئے بھی، دُکھ میں بھی اور خوشحالی میں بھی، تنہائی میں بھی اور مجمع میں بھی، دوستوں میں اور حکام والا مقام کے دربار میں بھی، ارکان والاشان کے قصور ومحلات میں بھی، ہمعصروں میں بھی تنگ نظروں میں بھی، قدر شناسانِ علم کے سامنے بھی نمائندگان جہل وجہل مرکب کے حضور میں بھی، ہر رنگ میں ہر مقام پر، ہر حیثیت سے وہ صرف حیدر حسن خان تھے اور کچھ نہیں تھے!

ہمارا ان کا دس برس تک ساتھ رہا، یہ مدت خاصی طویل ہے۔ اتنے عرصہ میں ہم نے دیکھا ہے، پرانی دوستیاں تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئیں گہرے تعلقات داستانِ پارینہ بن گئے، خلوص اور یگانگت کے دعوے نقش باطل ثابت ہوئے، جو پہلے اچھے تھے اب برے، بہت برے بن گئے۔ جو پہلے بُرے تھے اب اچھے بہت اچھے نظر آنے لگے۔ اتنے طویل عرصہ میں انسان کی رائے اس کے تجربے اس کے مشاہدے اس کے فیصلے کتنے کچھ منقلب نہیں ہوتے؟ دوسروں پر بھی یہی گذرتی ہے۔ ہم پر بھی یہ گزر چکی ہے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں اتنے مکمل مشاہدے اور مفصل تر تجارب کی روشنی میں بھی حیدر حسن خاں کا

وجود سمندر کا وہ ''مینارۂ نور'' بنا رہا، جس سے زندگی کے جہاز اور ہستی کے سفینے صراط مستقیم حاصل کرتے ہیں۔ ہلاکت کی چٹانیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

پہلے سمجھے تھے ہم نے مولوی صاحب کو خوب جی بھر کے دیکھ لیا اور اب کہ وہ ہم میں موجود نہیں معلوم ہوتا ہے ایک برق جہندہ تھی جو چمکی اور غائب ہوگئی۔

جھانک کر اس نے جو چلمن ڈال دی
دیکھنے والوں نے گردن ڈال دی

شعر عامیانہ ہوتو ہو، لیکن حسب حال ضرور ہے۔

بے شک یہ خاکی دنیا حیدر حسن خاں کے وجود سے محروم ہوگئی، لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ اس مرد مومن کا استقبال دوسری دنیا میں کس شان سے ہو رہا ہے۔ اس دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آ کر وہ رسول کا شارح اور مفسر پیام براوردائی اس دنیا میں پہنچ چکا ہے جہاں نہ نوکری کی پابندیاں ہیں نہ دوسروں کے اشارۂ چشم وابرو کا کچھ مفہوم ہے، نہ کوئی حاکم ہے نہ کوئی محکوم۔ وہاں صرف رحمت ہے، ربوبیت ہے، شانِ مغفرت ہے، جس کے جلو میں یہ نعائم موجود ہوں وہ رونے والوں کا دیدۂ تر کیوں دیکھے؟

جا! اے بے قرار روح یثرب کے سرکار کے دربار میں جا! تیری خدمات مقبول ہوئیں، اُسی دربار میں ہیشگی کی زندگی بسر کر۔

الوداع۔ الوداع!

عبدالمجید سالک

مولانا گرامی

مولانا غلام قادر گرامی جالندھر کے رہنے والے تھے اور ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں مبدءٔ فیاض سے فارسی شاعری میں وہ کمال حاصل ہوا۔ کہ عرفی ونظیری کی یاد تازہ ہوگئی۔ میر محبوب علی خاں نظام دکن کی نظر انتخاب نے ان کو اپنے دربار کے لیے منتخب کر لیا۔ چناں چہ آپ شاعر دربار اور استاد نظام کی حیثیت سے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ حیدر آبادی شیروانی اور آڑا پاجامہ پہنتے تھے، سر پر بڑی سی رنگین دستار باندھتے، بھری بھری داڑھی، موٹے موٹے خدوخال، چمکتی آنکھیں، بے حد ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج۔ ڈاکٹر اقبال سے خصوصی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور ڈاکٹر صاحب ہی کے دولت کدہ پر مجھے سب سے پہلے مولانا کا نیاز حاصل ہوا۔ ابتدا میں ڈاکٹر صاحب اپنے فارسی اشعار میں ان سے مشورہ بھی لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا گرامی کا تعارف کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر عرفی ونظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو وہ گرامی ہے۔ آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا ہے۔ اسی طرح مولانا گرامی کے دل میں بھی ڈاکٹر صاحب کی بے حد قدر ووقعت تھی۔ چناں چہ فرماتے ہیں

در دیدۂ معنی نگہباں حضرتِ اقبالؔ
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

استغراق فی الشعر

گرامی کی طبیعت میں ایک خصوصیت ایسی تھی جو میں نے عمر بھر کسی شخص میں نہیں پائی۔ یعنی شعر میں ایسا انہماک تھا کہ باقی تمام امور سے انقطاع کلی ہوگیا تھا۔ اگر جالندھر سے چل کر لاہور پہنچنا ہے تو کوئی ٹرین میں بٹھادے اور کوئی لاہور پہنچ کر اتارے ورنہ انہیں بالکل احساس نہ ہوگا کہ کہاں اُترنا ہے۔ وہ فکر شعر میں مستغرق پشاور پہنچ جائیں گے۔ ڈاکٹر اقبال کہا کرتے تھے کہ گرامی شعر میں تمیذ روح الامین ہے اور باقی تمام معاملات میں چغد ہے۔

جب کبھی حیدرآباد سے رخصت لے کر آتے تو ڈاکٹر صاحب علی بخش کو جالندھر بھیج دیتے کہ مولانا گرامی کو لوالائے۔ علی بخش کسی نہ کسی طرح انہیں لاہور لے آتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے علی بخش گیا اور ڈاکٹر صاحب کی طرف سے سلام و پیام دے کر کہنے لگا۔ مولوی صاحب آپ کل صبح میرے ساتھ چلے چلئے۔ کہنے لگے ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔ کیوں نہ چلیں گے ڈاکتر (ڈاکٹر کی ٹ کو ہمیشہ ت سے بدل دیا کرتے تھے) ہمارا دوست ہے۔ اپنے دوست کے ہاں کیوں نہ چلیں گے۔ دوسرا دن ہوا، صبح ہی بستر بندھوایا۔ جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پھر خدا جانے جی میں کیا آیا، بستر کھلوادیا، ارادہ ملتوی کردیا۔ اب علی بخش جز بز ہورہا ہے۔ اس کو سمجھا رہے ہیں۔ کل چلیں گے، تم فکر نہ کرو۔

تیسرا دن آیا۔ پھر بستر بندھ گیا۔ تانگا منگالیا گیا۔ تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ اندر گئے باہر آئے۔ باہر گئے اندر آئے۔ بیگم سے باتیں کیں۔ کچھ ضروری چیزیں لے کر ٹرنک میں ٹھونسیں۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد باہر نکلے۔ گرمی کا موسم تھا۔ تانگے کی نشست تپ گئی تھی۔ علی بخش اگلی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ مولانا پچھلی نشست پر بیٹھے ہی تھے کہ بے چین ہوکر اٹھے۔ ارے تانگہ بہت گرم ہے۔ یہ کہا اور نیچے اتر گئے، علی بخش سے کہا تم چلے جاؤ۔ ڈاکٹر سے کہ دینا کہ تانگہ گرم ہوگیا تھا اب سردیوں میں آئیں گے۔ غرض مولانا کو جالندھر سے لانا بھی ایک شدید مرحلہ تھا۔ جسے علی بخش ہی طے کرسکتا تھا۔ دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا۔

بیگم کا پیغام

جب ایک دفعہ مولانا ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچ گئے تو پھر یہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ مہینا پڑے ہیں۔ ساری رخصت یہیں بسر ہوگئی۔ بیگم گرامی (اقبال بیگم ترک تخلص۔ اردو کی شاعرہ

تھیں) پیغام پر پیغام بھیج رہی ہیں۔ لیکن یہاں کچھ اثر ہی نہیں۔ ایک دن جالندھر کے دو تین آدمی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر مولانا سے ملنے آ گئے۔ بیگم نے ان کو سمجھا کے بھیجا تھا کہ بلطائف الحیل مولانا کو لاہور سے جالندھر واپس آنے پر آمادہ کرنا۔ مولانا نے ان لوگوں سے پوچھا کیوں بھئی ہمارے گھر میں تو خیریت ہے؟ انہوں نے سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا، حضرت خیریت تو ہے مگر بیگم صاحبہ کو اسہال ہو رہے ہیں۔ یہ سن کر مولانا سخت مضطرب ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ جس شخص کو اسہال ہونے لگیں وہ مشکل ہی سے بچتا ہے۔ وہ آدمی تو یہ کہ کر چل دیئے۔ لیکن مولانا کو رٹ سی لگ گئی۔ بیگم کو اسہال ہو رہے ہیں۔ میں بھی عجب آدمی ہوں، یہاں آ کر بیٹھ رہا۔ کہیں کوئی نیکی بدی ہوگئی تو کیا کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب عدالت سے واپس آئے تو ان کے سر پر سوار ہو گئے۔ میں فوراً جالندھر جاؤں گا۔ اقبال بیگم کو اسہال ہو رہے ہیں۔ جلدی سے انتظام کرو۔ اب میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا کی کمزوری معلوم تھی۔ انہوں نے نہایت سکون سے سوٹ اتارا۔ کپڑے تبدیل کیے اور اس دوران میں ایک رباعی کے تین مصرعے کہہ لیے۔ تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''مولانا خدا فضل کرے۔ لیکن اسہال کوئی خطرناک مرض نہیں۔ یوں آپ جس وقت چاہیں گے۔ میں آپ کو جالندھر بھجوا دوں گا لیکن ایک رباعی ذہن میں اڑ گئی ہے تین مصرعے ہو سکے ہیں چوتھا ہونے میں نہیں آتا، اور آپ جانتے ہیں۔ چوتھا مصرع جان رباعی کہلاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تینوں مصرعے سنا دیئے اور کہا۔ ذرا فکر تو کیجئے شاید چوتھا مصرع ہو جائے۔

چوتھا مصرع ہو گیا

اب مولانا اس چوتھے مصرع کی فکر میں مستغرق ہو گئے اور بیگم کا خیال دھواں بن کے اڑ گیا۔ بیٹھے ہوئے گنگنا رہے ہیں، کھڑے ہوئے گنگنا رہے ہیں۔ حقہ پی رہے ہیں اور گنگنا رہے ہیں۔ ایک آدھ مصرع کہہ کر ڈاکٹر صاحب کو سنایا جو انہیں پسند نہ آیا۔ دوبارہ فکر ہوئی۔ لیکن کوئی مصرع ٹھیک نہ بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب اوپر کے کمرے میں جا کر سو گئے۔ اب مولانا اسی مصرع کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ رات کے تین بجے نہایت چست و برجستہ مصرع ہو گیا۔ مولانا نے علی بخش کو جگا کر کہا۔ علی بخش جاؤ ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ اس نے کہا۔ مولوی صاحب کوئی تکلیف یا ضرورت ہو تو مجھے حکم دیجیے۔ ڈانٹ کر کہا۔ نہیں تجھ سے کام نہیں ڈاکٹر سے کام ہے۔ وہ بیچارا اوپر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر صاحب جاگ اُٹھے۔ علی بخش نے کہا، مولوی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ پوچھا خیر تو ہے؟ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ عرض کیا

بظاہر تو بھلے چنگے ہیں۔ خیر ڈاکٹر صاحب سردی میں دُھسّہ اوڑھ کر نیچے اترے۔ ''حضرت خیر تو ہے''؟ فرمایا۔ اجی سنو، مصرع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مصرع سن کر داد دی اور جازت چاہی۔ کہنے لگے۔ اب جا کر سو رہو گے؟ اجی کہاں جاتے ہو۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علی بخش سے کہا۔ میاں اس وقت تو چائے کو جی چاہتا ہے۔ علی بخش نے جھٹ سٹوو روشن کیا، چائے پکائی۔ جب چائے تیار ہو گئی۔ تو مولانا کیا فرماتے ہیں۔ آہا۔ اگر اس وقت سنگترے ہوتے تو مزا آ جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش سے کہا۔ جاؤ۔ لوہاری دروازے کے کسی دکاندار کو جگا کر سنگترے لے آؤ۔ بے چارہ علی بخش سوں سوں کرتا ہوا لوہاری ردروازہ گیا۔ دکاندار کو جگا کر سنگترے لایا۔ مولانا نے بہت مزے لے لے کر کھائے۔ چائے پی اور پھر ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگے۔ اب تم جاؤ اور سو رہو۔ حالاں کہ اس وقت سورج نکل رہا تھا۔

دن گوبھی رات گوبھی

ایک دن کھانے پر بیٹھے تو کہا۔ علی بخش۔ آجکل گوبھی نہیں ملتی؟ عرض کیا۔ حضرت، بہت ملتی ہے۔ حکم دیا کہ شام کو گوبھی ضرور پکانا۔ شام کو جب گوبھی پک کر سامنے آئی۔ تو پوچھنے لگے یہ کیا ہے؟ کہا گیا گوبھی۔ بگڑ کر کہنے لگے صبح گوبھی، شام گوبھی۔ دن گوبھی، رات گوبھی۔ بڈھے آدمی کو بادی سے مار ڈالو گے کیا؟ علی بخش نے کہا۔ آپ ہی نے حکم دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا۔ تم چپ رہو۔ صبح گوبھی کی فرمائش کرنے کے بعد مولوی صاحب اب تک اپنے تصور میں خدا جانے کتنی دفعہ گوبھی کھا چکے ہیں۔ تم بھی سچے ہو اور یہ بھی سچے ہیں۔

کوہ ہمالیہ

بعض اوقات سردیوں کے موسم میں دفعۃً رات کے وقت انہیں محسوس ہوتا کہ سر کے نیچے تکیہ کافی اونچا نہیں۔ نیچے سے توشک نکال کر لپیٹتے اور سرہانے رکھ لیتے۔ پھر بھی طبیعت مطمئن نہ ہوتی تو لحاف کو گاؤ تکیہ بنا ڈالتے اور پھر صبح کے وقت شکایت کرتے کہ ساری رات جاڑے میں مر گیا۔ تم لوگ کافی بستر کیوں نہیں دیتے۔ علی بخش کہتا۔ مولوی صاحب بستر تو دیا تھا لیکن آپ نے کوہ ہمالیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا۔ اس پر اسے بُرا بھلا کہنے لگتے۔

ایک دفعہ میں نے نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے متعلق کہ ان کے لنگوٹیے یار تھے، دریافت کیا کہ ان کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ جواب دیا ''خامی میں پختہ ہوگیا ہے میاں'' میں اس جامع مانع رائے کو سن کر پھڑک گیا۔

سوء اتفاق ملاحظہ ہو کہ مولانا بھی کانوں سے بہرے تھے اور بیگم گرامی بھی اونچا سنتی تھیں۔ جالندھر کے بعض احباب کا بیان ہے کہ رات کو جب کبھی ہم مولانا کے گھر کے پاس سے گزرتے تو دیوار سے لگ کر خوب شعر سنتے۔ کیوں کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو چلا چلا کر اپنے شعر سنایا کرتے تھے۔

ناجائز فائدہ

مولانا گرامی کا ایک نوکر تھا غلام محمد۔ بہت نمازی اور پرہیزگار۔ مکان کے پاس ہی مسجد تھی۔ غلام محمد ہر نماز مسجد میں جا کر پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ مولانا نے آواز دی غلام محمد! کسی نے بتایا۔ ظہر کی نماز پڑھنے گیا ہے۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ پھر آواز دی غلام محمد! پھر کسی نے بتایا کہ عصر کی نماز پڑھنے گیا ہے۔۔۔۔ بہت بگڑے۔ کہنے لگے۔ ''جب دیکھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ جب پوچھو نماز پڑھنے گیا ہے۔ نابکار۔ قرب مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے''۔ یہ ''ناجائز فائدہ'' بھی خوب رہا۔

نکاحِ ثانی

مولانا گرامی کے ہاں عمر بھر اولاد نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ بعض عزیزوں نے کہا کہ آپ کی اس بیگم سے اولاد نہ ہوگی۔ آپ دوسرا نکاح کیجئے۔ پہلے تو نانا کرتے رہے۔ آخر راضی ہوگئے اور ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہ آئی تھی۔ اقبال بیگم کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ لاہور آ کر ڈاکٹر صاحب سے ملیں اور کہا۔ آپ اپنے دوست کو سمجھائیے۔ اس بڑھوتی کے زمانے میں اسے نکاح کی کیا سوجھی۔ بیگم بیچاری بہت روتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علی بخش کو بھیج کر مولانا کو بلوایا۔ دریافت حال کیا۔ اور کہا۔ آپ نے برا کیا۔ اگر اقبال بیگم کے خلاف آپ کو شکایت ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ خواہ مخواہ بلا قصور اس پر سوت لا بٹھائی یہ کہاں کی انسانیت ہے؟ لیکن مولانا تھے کہ پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتے تھے۔ ''نکاح میں کیا حرج ہے؟ نکاح سنت رسولؐ ہے۔ ملت کے بڑے بڑے، لوگوں نے تین تین چار چار نکاح

کیسے ہیں۔ میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ میرے بعد میرا نام کون لے گا؟"

تیر نشانے پر

ڈاکٹر صاحب اس بے زبان کی تر زبانی سے بہت پریشان ہوئے لیکن آخر شاعر کو زیر کرنے کے لیے جذبات کے حربے سے کام لیا اور کہا کہ اولاد ہی سے نام نہیں رہتا۔ آپ کا کلام مدت دراز تک زندہ رہے گا اور لوگ آپ کو یاد رکھیں گے۔ لیکن جب روز قیامت آقائے دو جہاں ﷺ کا دربار لگے گا اور ساری امت حضورؐ کے قدموں میں جمع ہوگی اور اقبال بیگم حضورؐ کا دامن تھام کر فریاد کرے گی کہ اے دو جہاں کے آقا۔ میرا انصاف کر۔ عمر بھر میں نے اس بڈھے کی خدمت کی۔ لیکن اس نے بے قصور و بے گناہ مجھ پر سوکن لا بٹھائی اور میری زندگی کو تلخ کر دیا۔ اُس وقت بڈھا گرامی کیا جواب دے گا۔ اے بوالہوس! کیا تو نے جواب سوچ لیا ہے؟

بس پھر کیا تھا۔ تیر نشانے پر لگا۔ مولانا گرامی زار زار رونے لگے اور چلا چلا کر کہنے لگے۔ یا رسولؐ اللہ! میں بھول گیا۔ میرے آقا مجھ سے خطا ہوگئی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر۔ ڈاکٹر بتاؤ اب میں کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو تسلی دی اور کہا کہ فوراً واپس جا کر اس عورت کو طلاق دے دو اور حضورؐ کے عتاب سے بچ جاؤ۔ مولانا گرامی نے جا کر اس عورت کو طلاق دے دی۔ اور آدھا مہر بھی ادا کر دیا۔

پان سیر سونا

مولانا بدحواس آدمی تو تھے ہی۔ ایک دن میر محبوب علی خاں نظام دکن کا دربار لگا ہوا تھا۔ حسب دستور تمام ارکان دربار اپنے اپنے منصب پر کھڑے تھے مولانا بھی اپنے مقام پر استادہ تھے۔ لیکن ازار بند لٹک رہا تھا۔ حضور نظام کی نگاہ پڑ گئی۔ انہوں نے پیش کار حضوری سے کہا۔ گرامی کو دیکھو۔ ازار بند لٹک رہا ہے اور کچھ ہوش نہیں۔

پیش کار پریشان ہوا کہ کہیں عتاب نہ ہو جائے، جھٹ بات بنائی۔ اور کہا حضور والا۔ گرامی پریشان رہتا ہے۔ یہاں جو منصب ملتا ہے۔ وہ نوکر چاکر گھوڑا گاڑی میں خرچ ہو جاتا ہے۔ وطن میں ہمشیر کی شادی درپیش ہے (حالاں کہ بہن کوئی تھی ہی نہیں) یہ پنجاب کے لوگ لڑکیوں کو جہیز میں سونے کے مخصوص زیور

دیتے ہیں۔ اس لیے بیچارہ فکر مند رہتا ہے۔ میر محبوب علی خاں میں پرانے بادشاہوں کی سی فیاضی تھی۔ حکم دیا کہ گرامی کو پان سیر سونا دے دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ گرامی کو پان سیر سونا ملا تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پیشکار سے پوچھا۔ اس نے سارا قصہ سنایا۔ شام کے وقت مولانا اپنے مکان پر یاروں میں بیٹھے ڈون کی لے رہے تھے۔ ''ابھی تو ازار بند لٹک ہی رہا تھا کہ پان سیر سونا ملا۔ اگر کہیں کھل گیا ہوتا تو دس سیر ملتا۔''

''ھُن چھڈ یار''

ایک دفعہ کا ذکر ہے حضور نظام نے سر دربار مولانا گرامی کو حکم دیا کہ اپنا کلام سناؤ۔ مولانا نے سات اشعار سنا کر تسلیمات پیش کیں (دستور دربار یہی تھا کہ سات شعر سنا کر تسلیم کرو اور ہٹ جاؤ۔ اگر حضور مزید فرمائش کریں تو اور سناؤ ورنہ نہیں) نظام نے کہا اور سناؤ۔ مولانا نے سات اشعار اور سنائے اور تسلیم کی۔ حضور نظام بھی موج میں تھے انہوں نے فرمایا، ''گرامی اور سناؤ'' اس پر مولانا نے بے ساختہ پنجابی میں کہا۔۔۔ ''ھُن چھڈ یار۔ میں تھک گیاں'' نظام خدا جانے کچھ سمجھے یا نہیں۔ لیکن مولانا کا پیچھا چھوڑ دیا۔ یہ خود فراموشی کی نہایت دلچسپ مثال ہے۔ شعر سناتے سناتے آپ کو یاد ہی نہ رہا کہ کس کے سامنے شعر پڑھ رہا ہوں۔ اور جب تھک جانے کے باوجود مزید فرمائش ہوئی تو یوں جواب دیا۔ گویا کوئی بے تکلف پنجابی دوست سامنے بیٹھا ہے۔

مختلف لطائف

مولانا کی ذات دلچسپیوں کی پوٹ تھی۔ ان کی ذات سے دن بھر لطائف صادر ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً صبح دس بجے علی بخش نے آ کر کہا۔ مولوی صاحب کھانا کھا لیجئے۔ فرمایا۔ واہ علی بخش تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ارے ابھی تو ناشتا کیا ہے اور ابھی کھانا کھالوں؟ کوئی ساڑھے دس بجے علی بخش نے کہا۔ مولوی صاحب کھانا لاؤں؟ فرمایا۔ پھر تم نے وہی رٹ لگائی۔ ارے میاں ابھی تو ناشتا کیا ہے۔۔۔ علی بخش جا کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا۔

ابھی پندرہ منٹ نہ گزرے ہوں گے کہ مولانا برآمدے میں نکل آئے اور چلانا شروع کیا۔ علی بخش علی بخش! وہ بھاگا ہوا آیا۔ حکم مولوی صاحب۔ کہنے لگے۔ بڑے بیدرد ہو تم لوگ۔ دوپہر ہونے کو آئی

بھوک سے جان نکلی جاتی ہے اور کھانا نہیں دیتے جلدی سے کھانا لاؤ۔

ایک دن میں تیسرے پہر ڈاکٹر صاحب کے گھر گیا۔ باہر مولانا کرسی پر بیٹھے تھے اور دوسری کرسی پر آٹھ دس سنگترے پڑے تھے۔ میں نے کہا مولانا سنگترے منگائے ہیں؟ کہنے لگے ہاں۔ ابھی علی بخش بازار سے لایا ہے۔ اب میری رگِ شرارت پھڑکی۔ میں نے کہا مولانا۔ یہ تو کھٹے معلوم ہوتے ہیں۔ کہنے لگے اچھا؟ آپ کہتے ہیں تو ضرور کھٹے ہوں گے۔ یہ علی بخش بڑا ہی احمق ہے۔ اسے کیا معلوم سنگترہ کس کو کہتے ہیں۔ بس جو کچھ کسی نے دیا اٹھا کے لے آیا۔ اس کے بعد علی بخش کو بلا کر کہا کہ یہ کھٹے سنگترے کیوں اٹھا لائے؟ وہ کہنے لگا مولوی صاحب میٹھے ہیں۔ اس پر بگڑ کر کہا واہ میٹھے ہیں! سالک صاحب جیسا معتبر آدمی تو کہہ رہا ہے کہ کھٹے ہیں اور یہ میٹھے بتا رہا ہے۔ علی بخش سمجھ گیا۔ ایک طرف ہو کر میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ میں نے سنگتروں کو ٹٹول کر دیکھا۔ اور کہا، مولانا غلطی ہوگئی۔ یہ تو ناگپوری ہیں۔ ضرور میٹھے ہوں گے۔ یہ سن کر بہت شگفتہ ہوئے اور کہنے لگے۔ جی ہاں ضرور میٹھے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ سارے شمالی ہندوستان میں علی بخش جیسا ''سنترہ فہم'' آدمی موجود نہیں۔

لاہور میں آخری پھیرا

۱۹۲۵ء یا شاید ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ مولانا گرامی آخری دفعہ لاہور تشریف لائے وہ قصہ بھی سن لیجئے۔ انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔۔۔ اور نواب سراج الدین احمد سائل اس میں نظم پڑھنے والے تھے۔ نواب صاحب کے داماد ڈپٹی مرزا عبدالرب امرتسر میں مجسٹریٹ تھے۔ لہٰذا نواب صاحب جلسے سے چند روز پہلے امرتسر پہنچ گئے۔ اور مرزا عبدالرب سے کہا کہ ہمارا ایک پرانا یار گرامی جالندھر میں رہتا ہے۔ اس کو یہاں لے آؤ تو چند روز لطف سے کٹ جائیں گے۔ چناں چہ مرزا صاحب جالندھر گئے اور جوں توں کر کے مولانا گرامی اور بیگم گرامی کو زبردستی موٹر میں ڈال کے لے آئے۔ جس دن جلسہ تھا۔ مرزا صاحب نواب سائل اور مولانا گرامی کو موٹر میں بٹھا کر لاہور لائے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں انجمن کے کارکنوں سے کچھ آزردہ تھے اور جلسے میں جانے سے انکار کر چکے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ آپ جلسے میں جایئے اگر گرامی آ گئے ہوں تو ان کو کسی طرح لوا لایئے۔

جلسے میں نواب سائل نے لاٹ صاحب پنجاب کے زیر صدارت نظم پڑھی۔ شیخ عبدالعزیز مرحوم سیکرٹری انجمن نے مولانا سے بہت اصرار کیا کہ آپ بھی چند اشعار سنایئے۔ آپ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں۔

میں میر محبوب علی خاں کا شاعر دربار ہوں فرنگیوں کے سامنے شعر نہیں سنا سکتا۔ خیر جلسہ ختم ہوا۔ مولانا اور نواب صاحب کار کی طرف بڑھے تو میں نے جالیا اور عرض کیا کہ میں سالک ہوں۔ اخاہ کر کے لپٹ گئے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کا پیغام دیا تو آپ کچھ تامل اور عذر کرنے لگے۔ میں نے نواب سائل صاحب سے گزارش کی۔ کہ آپ ہی ذرا سفارش فرما دیجیے۔ وہ کہنے لگے سالک صاحب گرامی تو بادشاہ ہیں۔ جی چاہے گا چلے جائیں گے۔ نہ چاہے گا تو کسی بڑی سے بڑی سفارش سے نہ جائیں گے۔ ابھی ہم امرتسر سے لاہور آ رہے تھے۔ اٹاری پر ذرا کی ذرا کار رکی تو مولانا اتر کر پیدل امرتسر کی طرف چل دیے اور ہم سے کہنے لگے کہ تم لوگ لاہور جاؤ۔ میں امرتسر جاتا ہوں۔ میرا لاہور میں کیا کام ہے۔

خیر۔ میں نے منت سماجت کر کے مولانا کو کار سے اتار لیا حفیظ جالندھری کہیں سے آ نکلے۔ میں نے کہا۔ بھاگ کر ایک تانگہ لے آؤ۔ وہ تانگہ لائے تو ہم مولانا گرامی کو ساتھ لے کر ڈاکٹر اقبال کے ہاں پہنچ گئے۔ دونوں دوست بے حد مسرت سے بغل گیر ہوئے اور گفت وشنید کے پھول بکھیر نے لگے۔ رات کے گیارہ بجے تک ہم وہیں بیٹھے رہے۔

صبح میرے پاس اسلامیہ کالج کے چند طلبہ آئے اور کہنے لگے سالک صاحب حسن اتفاق سے مولانا گرامی آئے ہوئے ہیں۔ بے شمار لوگ ان کا کلام سننے کے مشتاق ہیں۔ اگر آپ کسی طرح مولانا کو آمادہ کر لیجیے تو ہم حبیبیہ ہال میں ایک خاص اجتماع کا انتظام کیے لیتے ہیں۔ خدا جانے یا قسمت یا نصیب۔ اب کبھی مولانا لاہور میں آ سکیں گے یا نہیں۔ ان کی زبانی چند اشعار تو سن لیں۔ میں مولانا کی ضدی طبیعت کو جانتا تھا۔ میں نے طلبہ سے کہا کہ تم ''جالندھر ایسوسی ایشن اسلامیہ کالج'' بن جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آج دوپہر کو آپ حبیبیہ ہال میں کلام سنائیں گے کیوں کہ وہاں طلبہ نے جلسے کا انتظام کیا ہے۔ حسب توقع مولانا نے انکار کر دیا۔ اور پیری اور تکان کا عذر کیا۔ اس پر میں نے اپنا حربہ استعمال کیا اور کہا۔ مولانا یہ لڑکے جالندھر کے ہیں۔ انہوں نے اسلامیہ کالج میں جالندھر ایسوسی ایشن قائم کر رکھی ہے۔ اور ہمیشہ اپنے ہمسروں میں ڈینگیں مارتے رہتے ہیں کہ ہمارے شاعر کا جواب نہیں، گرامی آئیں گے تو ہم تم کو ان کا کلام سنوائیں گے اب اگر آپ تشریف نہ لے گئے تو جالندھر کے ان نوجوانوں کی بڑی ذلت ہوگی (حالاں کہ ان میں سے ایک بھی جالندھر کا نہ تھا)

حبیبیہ ہال میں

مولانا موم ہو گئے ''اچھا؟ یہ بچے جالندھر کے ہیں؟ پھر تو میں ضرور آؤں گا۔ سالک صاحب۔ آپ کی ڈیوٹی ہے۔ آپ مجھے ساتھ لے کر جائیں گے۔'' عرض کیا۔ مولانا بسر و چشم۔ چناں چہ طلبہ نے حبیبیہ ہال میں فرش فروش کا انتظام کر کے سٹیج بنا دیا مولانا گرامی سٹیج پر تشریف فرما ہوئے۔ حقہ لگا دیا گیا۔ اور باہر جلسہ انجمن میں اعلان کر دیا گیا کہ جلسے کے خاتمہ پر مولانا گرامی حبیبیہ ہال میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ ارباب ذوق وہاں تشریف لائیں۔ جب ہال بھر گیا تو میں نے مولانا سے کلام کی فرمائش کی۔ کہنے لگے نہیں، پہلے اور لوگ پڑھیں۔ میں بے حد پریشان ہوا کہ اب شعرا کو کہاں سے لاؤں۔ اتنے میں منشی میراں بخش جلوہ سیالکوٹی نظر آئے۔ یہ ایک بلند قامت۔ سیاہ فام۔ ڈاڑھی اور پگڑی اور لمبے کالے چغے والے شاعر تھے۔ پرانے فیشن کے اور بے تکے شعر کہا کرتے تھے اور انجمن کے جلسے میں اکثر آتے تھے۔ میں نے ان سے فرمائش کی۔ مولانا حقے کی نے منہ میں لیے کرسی پر بیٹھے تھے۔ جلوہ نے ایک غزل سنائی۔ جس کی زمین تھی۔ سحر کی آستیں۔ قمر کی آستیں۔ جب مقطع پڑھا

یار کا جلوہ جو دیکھا اڑ گئے درزی کے ہوش
آستیں کی کی کمر اور کی کمر کی آستیں

تو مولانا ایک دم کیا فرماتے ہیں ''واہ رے تیری کی کی کی'' قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔ اور جلوہ صاحب بہت برہم ہوئے۔

اس کے بعد حفیظ جالندھری نے ایک نظم سنائی۔ پھر مولانا نے مجھ سے باصرار ایک فارسی غزل کی فرمائش کی جو میں نے پڑھ کر سنائی اور مولانا سے عرض کیا کہ اب اور کوئی نہیں۔ آپ ہی کی باری ہے۔ اس پر مولانا نے کوئی ایک گھنٹے تک اپنا کلام بلاغت نظام سنایا۔

جب یہ جلسہ ختم ہوا تو مولانا شاعری کے آسمان سے اتر کر پھر اپنی عام سطح پر آ گئے۔ میں نے سید احمد شاہ بخاری کا تعارف کرایا۔ کہنے لگے۔ اچھا؟ تو یہ بخارا کے رہنے والے ہیں؟ پھر یہ تو ہماری غلطیاں نکالتے ہوں گے۔ بخاری یہ سن کر کسی قدر خفیف ہوئے۔ پھر میں نے سید امتیاز علی تاج کو پیش کیا۔ ''اچھا؟ تو یہ مولوی ممتاز علی صاحب کے صاحبزادے ہیں؟ مولوی صاحب تو ہمارے پرانے دوست ہیں۔'' یہ کہ کر امتیاز کے چہرے پر ہاتھ لہرا لہرا کر کہنے لگے۔ واہ بھئی واہ بھئی واہ۔ اس واقعہ کے بعد ہم مدت تک مولانا کی اس حرکت کو یاد کر کے امتیاز کو چھیڑا کرتے تھے۔

ان تمام بدحواسیوں کے باوجود مولانا گرامی محبت اور خلوص کے پتلے تھے۔ڈاکٹر اقبال سے تو خیر پرانی رسم وراہ تھی۔لیکن مجھ سے اور حفیظ جالندھری سے بھی بے حد محبت کرتے تھے۔مرتے وقت بھی ہم تینوں ہی کو یاد کر رہے تھے۔
اللّٰہم اغفرلہٗ

ملّا واحدی

مصورِ غم علامہ راشد الخیری

مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی تصنیفات پڑھنے کے بعد اس کا یقین مشکل سے آ سکتا ہے کہ مولانا خوش طبع بھی ہوں گے۔ اور جنہیں رواروی میں مولانا سے ایک آدھ مرتبہ ملاقات کا موقع ملا ہے وہ تو انہیں خوش طبع کیا شاید خوش اخلاق ماننے میں تامل کریں گے۔ مولانا نے دو تین کتابیں مزاحیہ لکھی ہیں۔ لیکن ان کا امتیاز خصوصی حزن نویسی تھا۔ تو جس کی ساری عمر اوروں کو رُلانے میں گزری ہو وہ خود کیسے ہنس سکتا ہے۔ اور جو ملنے جلنے سے اتنا بیزار ہو کہ بڑے بڑے آدمیوں کو اس کی صحبت میں دو منٹ بیٹھنے کی آرزو ہی رہے اُسے مذاق کی کیا سوجھ سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا بے حد زندہ دل، بے حد شگفتہ مزاج، بے حد خوش طبع انسان تھے۔

میں ایسے تین شخصوں کو جانتا ہوں جو مولانا کے لڑکپن سے بڑھاپے تک دوست رہے۔ ایک مرزا محمد اشرف صاحب گورگانی۔ بی۔ اے، دوسرے مولوی اشرف حسین صاحب بی۔ اے، تیسرے قاری سرفراز حسین صاحب عزمیؔ۔ تینوں مولانا کے سامنے ہی اللہ کے ہاں سدھار چکے۔ یہ ایک جماعت تھی جو علم و فضل اور ذہانت اور طباعی کے اعتبار سے دہلی کی آخری شمع تھی۔ اور زندہ دلی میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ ان دوستوں میں کس طرح کا مذاق ہوتا تھا۔ اس کی دو معتدل مثالیں سناتا ہوں۔

مولانا طرز تحریر میں شروع شروع شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب یعنی اپنے پھوپا کے پیرو رہتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ مولانا کو ''جانشین مولوی نذیر احمد'' لکھ دیا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے

فرزند مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم بھی بیس کتابوں کے مصنف تھے۔ اور عمر میں مولانا سے بڑے تھے۔ انہیں کسی نے جالگایا کہ بیٹے کے ہوتے بھتیجے کو جانشین بتایا جارہا ہے۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے تو اس کی پرواہ نہیں کی مگر قاری سرفراز حسین صاحب نے اس کا خاصا لطیفہ بنادیا۔ کوئی شادی تھی جس میں ہم سب جمع تھے۔ مولانا نے بہت ڈھیلی ڈھالی ٹخنوں تک نیچی شیروانی پہن رکھی تھی۔ قاری صاحب، مولوی بشیر الدین صاحب سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''واحدی نے راشد کو'' جانشین مولوی نذیر احمد'' غلط نہیں لکھا۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی میں نے اپنی ان دونوں آنکھوں سے مولوی نذیر احمد کے پاس یہ شیروانی دیکھی ہے۔ جو آج راشد کے جسم پر ہے۔'' ایک شام کو ایڈورڈ پارک میں یہی مجمع تھا۔ کوئی بڈھا، سفید ڈاڑھی، خمیدہ کمر، بھیک مانگتا اس مجمع کے اندر آ کھڑا ہوا۔ مولانا نے بے ساختہ کہا۔ ''آؤ میاں قاری برکت اللہ۔ بڑی مدت میں شکل دکھائی۔ تمہارے دیدار کو تو آنکھیں ترس گئیں''۔ قاری برکت اللہ صاحب۔ قاری سرفراز حسین صاحب کے والد کا نام تھا۔ اور یہ گفتگو قاری برکت اللہ صاحب کے انتقال کے پچاس برس بعد کی ہے۔

دو پھبتیاں یاد آ گئیں۔ مولانا نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ آخر وقت میں سر ڈاڑھی اور بھویں سب بگلا تھیں۔ اور سر کے بال خوب بڑھے ہوئے اور اُلجھے سے تھے۔ ایک دن مولانا ننگے سر کھڑے تھے کہ قاری صاحب آ پہنچے اور فرمایا۔ ''حضرت مولانا روئی کے بیچ میں نوکری کرلی ہے''۔ قاری صاحب خضاب استعمال کرتے تھے۔ ایک روز ڈھاٹا باندھے تھے اور ڈھاٹے میں سے روئی ذرا باہر نکل رہی تھی۔ مولانا نے کہا'' واہ قاری صاحب صرف دُم کی کسر ہے''۔ یعنی دُم لگالو تو لنگور معلوم ہو گے۔

تیکیچو بیس سال سے مولانا کی اکثر میرے ہاں نشست رہتی تھی۔ اور مولانا کے آخری دور کے ہم تین ساتھی تھے۔ میں خواجہ فضل احمد خاں صاحب شیدا۔ اور مولانا عارف ہسوی۔ ہم چاروں قریب قریب روز ملتے تھے۔ اور دن میں کئی کئی دفعہ ملتے تھے۔ میں اپنے چاروں دوستوں کی جماعت میں نسبتاً خشک تھا۔ اس واسطے بے تکلفی مولانا کی حقیقتاً خواجہ فضل احمد صاحب اور مولانا عارف سے تھی۔ خصوصاً خواجہ فضل احمد صاحب سے۔ لیکن مولانا چوکتے مجھ سے بھی نہیں تھے۔ اور میں بھی ان کی مہربانیوں کے سبب اتنا گستاخ ہو گیا تھا کہ'' شام زندگی'' لکھنے کا جب فیصلہ ہوا تو مولانا مہینوں اُڑان گھائیاں دیا کئے۔ مولانا نے بے شمار کتابیں تیار کر ڈالیں۔ لیکن مجبور ہوئے بغیر قلم ہاتھ میں نہیں لیا کرتے تھے۔ اپنی طبیعت سے مجبور ہو جائیں یا بچوں اور دوستوں کی خواہش سے دب جائیں۔ بہر کیف لکھتے تھے۔ زبردستی سے، اور لکھتے تھے تو

دس منٹ سے گیارہوں منٹ لکھنے پر صرف نہیں کرتے تھے۔ دس منٹ لکھا اور باہر آ گئے میرے ہاں تشریف لے آئے، کسی تانگہ والے کے پاس جا کھڑے ہوئے، کسی دکاندار سے باتیں کرنے لگے اور پھر جا کر لکھنا شروع کر دیا۔ اور پھر دس منٹ بعد کرسی کاٹنے لگی۔ یہی سلسلہ تمام دن جاری رہتا تھا۔ میں نے شام زندگی لکھنے کے فیصلہ میں رخنہ پڑتے دیکھا تو ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری میں میز کرسی بچھوادی۔ اور مولانا آئے تو ان سے کہا۔ ''چلو اس کوٹھڑی میں۔'' اور ان کے کوٹھڑی میں گھستے ہی کنڈی لگا دی اور سنا دیا کہ چاہے لکھو۔ چاہے نہ لکھو۔ کنڈی دو گھنٹے سے پہلے نہیں کھلے گی۔ مولانا عارف اس سازش میں شریک تھے۔ مولانا نے ایک دفعہ عارف صاحب سے فرمایا۔ ''ارے تجھے خدا نے کانگرس کی محبت اس لیے دی ہے کہ تو بار بار جیل جائے اور میرے جس بیجا کا بدلہ اترے۔ اچھا ہے یہیں بھگت لے ورنہ خدا کے ہاں بیدیں کھانی پڑتیں۔'' مولانا کو کھانے پکوانے اور غربا کو کھلانے کا بے حد شوق تھا۔ مہینہ میں دو تین بار دیگیں نہ کھڑکیں تو وہ پژمردہ ہو جاتے تھے۔ مجھے بھی دیگ کا سالن بھاتا ہے لہٰذا جب دیگ چڑھتی تھی مولانا کہہ دیتے تھے۔ ''ملاجی شام کو پیالہ بھیج دینا''۔ اور میں پیالہ بھیجتا تھا۔ اس دن اس خاص کھانے کی اطلاع کئے بغیر خواجہ فضل احمد صاحب کی مولانا نے دعوت کر دی۔ مغرب کی نماز کے بعد خواجہ فضل احمد صاحب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ حبشی، رَبی اور ملانے، پٹھان، بخاری، بنگالی کھڑے ہیں۔ اور سب کے ہاتھ میں پیالے ہیں۔ خواجہ فضل احمد صاحب کہتے ہیں کہ میرے آگ لگ گئی لیکن مولانا نے یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا کہ ''فضلو تیرا پیالہ کہاں ہے۔ ارے بے پیالے ہی آ گیا چل بھاگ یہاں سے۔ میں سالن بھی دوں اور پیالہ بھی دوں''۔ پھر قریب پہنچ کر ہاتھ پکڑا اور چمکار کر فرمایا۔ ''نواب صاحب یہ کھانا انہی لوگوں کے واسطے پکوایا کرتا ہوں۔ آپ نے عقل سے کیوں کام نہ لیا۔ میں حضور کی دعوت کرتا تو تنہا حضور کی نہ کرتا اتنے میں عارف صاحب بھی آ گئے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ حضور کی دعوت کرتا تو اس عرفو کی بھی تو کرتا۔ اور بھئی ان لوگوں کے ساتھ کھانا ہے تو کچھ ان میں سے اوپر کھا رہے ہیں۔ جاؤ۔ تم دونوں بھی کھالو۔

عارف صاحب کا انتقال مولانا کے انتقال سے صرف پندرہ دن پہلے ہوا تھا۔ عارف صاحب کے انتقال کی خبر مولانا کو نہیں ہونے دی تھی۔ عارف صاحب مولانا کو پوچھتے پوچھتے مر گئے اور مولانا عارف صاحب کو مرتے مرتے پوچھا کیے۔ آخری دنوں میں کسی نے مولانا سے کہہ دیا کہ عارف اب اچھے ہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ ''کیوں مجھے بناتے ہو۔ وہ بھلا بچنے والا تھا۔ وہ جا چکا لیکن ایک آدھ کو اس کے پیچھے

پیچھے ضرور جانا پڑے گا۔ اکیلے اس کا دل تھوڑا ہی لگ سکتا ہے''۔ انتقال سے چار روز پہلے شہنشاہ جارج پنجم کی رحلت کا کوئی صاحب ذکر کر رہے تھے۔ ایک بزرگ بولے کیوں جی اب بادشاہ کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا۔ مولانا کی نقاہت کی وجہ سے آنکھیں بند تھیں۔ یہ دلچسپ سوال سن کر بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور زبان پر برجستہ یہ فقرہ آیا۔ ''نہیں جناب کے حق میں وصیت کر گئے ہیں۔''

غرض جس طرح تحریر و تقریر میں مولانا ہر ہر فقرہ کو درد واثر سے بھر دیتے تھے۔ اُسی طرح بات چیت میں مولانا کا ہر ہر فقرہ پُر لطف ہوتا تھا۔ مولانا نے بُری صحبت میں پھنس کر بیوی بچہ سے بے پرواہی اختیار کر لینے والے ایک شوہر کی اور اس کے بیوی بچہ کی تصویر کھینچی ہے۔ بچہ کی زبان سے کہلواتے ہیں۔ ''اماں۔ ابا ہم کو گود میں نہیں لیتے۔ خیر۔ میں اب بڑا ہو جاؤں گا۔ میں بھی اماں ہی کو گود میں لوں گا ابا کو نہیں لوں گا۔''

ماں بچہ کی بات پر پہلے مسکراتی ہے۔ پھر بچہ کو خوب بھینچ کر پیار کرتی ہے۔ اور جواب دیتی ہے۔ ''اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ تم جیتے رہو۔ بس یہی سب کچھ ہے''۔

بچہ اور ماں کے فقرے کیا ہیں۔ تیر و نشتر ہیں۔ دو ہی فقروں میں مولانا نے دل ہلا دیئے۔ وہی مولانا مرتے مرتے مذاق کرتے ہیں کہ شہنشاہ جارج پنجم ان صاحب کے حق میں وصیت کر گئے ہیں جنھیں فکر تھا کہ شہنشا جارج پنجم کا جانشین کون ہوگا۔

مولانا بالکل آزاد اور بے نیاز طبیعت کے انسان تھے۔ جو کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی اسے ظاہر کر دینے میں انہیں باک نہ تھا۔ تحریر، تقریر، بات چیت، میل ملاقات سب مواقع پر مولانا کی اس طبیعت کا اظہار ہوتا تھا۔ گھر میں کرتہ اتارے اور تہ بند باندھے بیٹھے ہیں۔ آپ ملنے جایئے۔ وہ اسی شان سے باہر آ جائیں گے۔ آپ کتنے ہی بڑے شخص ہوں آپ کے سامنے بن کر نکلنے کا خیال ان کے دل میں نہیں گزرے گا۔ اللہ اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کے سوا انہوں نے کسی کی بڑائی کے آگے کبھی سر نہیں جھکایا۔ اور کبھی کم حیثیت لوگوں پر اپنی بڑائی کی دھونس نہیں جمائی۔

ایک طرف ان کی یہ حالت تھی کہ گنے چنے دو چار احباب کے درمیان بیٹھے ہیں۔ یکا یک کوئی اجنبی آ گیا اور مولانا نے ایک کہی نہ دو کہی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خاص مولانا ہی کے ملنے کی کسی نے زحمت گوارا کی ہے اور مولانا اس سے بات کرتے گھبرا رہے ہیں۔

بائیس تیئیس برس کی بات ہے۔ مولانا جامع مسجد کے نیچے سے چلے آتے تھے۔ دہلی کے ایک

مشہور شاعر نے مولانا کو آواز دی۔ پنجاب کے ایک بڑے آدمی شاعر صاحب کے ہمراہ تھے۔ شاعر صاحب نے کہا۔ ''مولانا یہ فلاں صاحب ہیں۔ آپ کی زیارت کے مشتاق تھے''۔ مولانا دو سیکنڈ رکے اور فرمایا۔ ''اچھا'' اور روانہ ہوگئے۔ سو ایک طرف تو یہ حالت تھی اور دوسری طرف دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ رمضان کا مہینہ، جمعہ کی شام، سینکڑوں مرد عورت مولانا کے ہاں سے کھانا لے جارہے ہیں۔ ایک بڑھے کو مولانا نے اپنے ہاتھ سے کھانا لا کر دیا۔ اور پھر دور تک اس سے باتیں کرتے چلے گئے۔ یہ مولانا کے بچپن کے یار تھے۔ لنگوٹیے یار۔ بچپن میں انسان ہر درجہ اور ہر حیثیت کے بچوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ مگر بڑا ہو کر سب کو بھول جاتا ہے۔

مولانا نے جوانی میں لڑنت کی تھی۔ ایک پہلوان ان کے ہم عمر ابھی مرے ہیں ان سے بس یہ وضع تھی کی آمنا سامنا ہوا اور مولانا کا چہرہ کھل گیا۔ اور بغلیں کھل گئیں۔ اب سینہ آگے آگے ابھارے جاتے ہیں۔ قریب پہنچے اور پہلوان صاحب کو گلے لگا لیا۔ مزاج پرسی کی، بال بچوں کو پوچھا، ایک آدھ ہنسی کی بات کی اور رخصت۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندانی قبرستان، مہندیوں میں ستر اسی برس کے ایک صاحب رہتے ہیں۔ ان کا اسم گرامی بھی عبدالعزیز ہے بہت سیدھے سادے بھولے بھالے اور نیک آدمی ہیں۔ مگر زبان اور طرز گفتگو کرخنداری ہے۔ مولانا کی اور عبدالعزیز صاحب کی بڑے مزیدار باتیں ہوا کرتی تھیں یہ مولانا کو جہاں مل جاتے وہیں مولانا ان سے گھل مل باتیں شروع کردیتے ایک دفعہ کی باتیں سنئے۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کی سترھویں تھیں۔ مولانا فیض بازار کی پٹری پر کھڑے سترھویں میں جانے والوں کے تانگوں اور موٹروں کا تماشہ دیکھ رہے تھے کہ عبدالعزیز صاحب تشریف لے آئے۔ مولانا نے پوچھا۔ ''کہاں سے''۔ عبدالعزیز صاحب بولے۔ ''میاں سلطان جی سے چلا آتا ہوں۔ میاں وہاں ہُن برس رہا ہے ہُن''۔ مولانا نے فرمایا۔ ''عبدالعزیز تمہیں رشک آتا ہے تو تم بھی پیری مریدی کرنے لگو۔'' عبدالعزیز بولے۔ ''میاں ہمیں رشک کاہے کو آنے لگا۔ مولوی صاحب! تم نے قرآن تو پڑھا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ بندے سارے گناہ معاف کردوں گا۔ ایک سے لے کر ہزار گناہ کرکے آجا، کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر تو نے شرک کیا تو سمجھ لے بخشوں گا نہیں۔''

بے پڑھے لکھے دوستوں سے مولانا اس طرح ملتے تھے۔ جیسے خود بھی پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ عبدالعزیز کے اس سوال سے کہ تم نے قرآن تو پڑھا ہوگا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوست انہیں اپنے

سے روپے پیسے میں اونچا سمجھتے تھے اور یہ ایسا فرق تھا جسے مولانا چھپا نہ سکتے تھے۔ ورنہ مولانا نے انہیں یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ مولانا ستر اسّی کتابوں کے مصنف ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اتنی جدوجہد کر چکے ہیں کہ دنیا ان کی گرویدہ ہے۔ ملک کے مصلحوں میں اُن کا شمار ہے۔

مولانا جاہل دوستوں کو کیا محسوس کراتے۔ خود ان کو اپنے بلند مرتبہ کا احساس نہ تھا۔ دنیا ان کی بابت کیا رائے رکھتی ہے وہ اسے سوچتے بھی نہ تھے ۱۸۵۷ء کے بہت بعد تک دلّی پرانے لوگوں سے بھری رہی۔ مولانا نے ان کی صحبت پائی تھی اور قدیم تہذیب کا دم مولانا کے سامنے ٹوٹا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں اب سے دور خواجہ فضل احمد صاحب کی لڑکی جو اس وقت سیکر میں تھی سخت بیمار پڑ گئی جس کی وجہ سے خواجہ فضل احمد بہت پریشان تھے۔ اس کی خبر پا کر مولانا دن میں کئی کئی بار خواجہ فضل احمد صاحب کے ہاں جاتے اور دریافت کرتے۔ کوئی خبر آئی، کوئی خط آیا، کوئی تار آیا اور ہر طرح تسلی تشفی دیتے۔

خواجہ فضل احمد صاحب کا بیان ہے کہ جس دن میں سیکر روانہ ہونے لگا ہوں اس دن بہت دیر مولانا میرے پاس ٹھیرے۔ چلنے لگا تو قریب آ کر کان میں کہا ''روپے کی ضرورت تو نہیں ہے''۔ میں نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ الحمد اللہ۔'' لیکن ان کی اس دل سوزی کی ادا سے جی باغ باغ ہوگیا۔ اور قدیم دوستوں کے جو تذکرے اگلے بزرگوں سے سنے تھے اُن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

مولانا شادی کی محفلوں میں زیادہ شریک نہ ہوتے تھے۔ لیکن تکلیف اور غم اپنے تو اپنے غیروں کے ہاں بھی سنتے تو تڑپ جاتے۔ غریب سے غریب مسلمان کے جنازے کے ساتھ چالیس قدم جانا اب صرف مولانا پر فرض رہ گیا تھا۔

نصیر خاں اور اس کی بیوی مولانا کے ''تربیت گاہ بنات'' میں ملازم تھے۔ بڑھیا بچیوں کو گھروں سے لانے کا کام کرتی تھی اور بڑھے کے سپرد ڈیوڑھی بانی تھی۔ بڈھا مرنے لگا تو بیگم راشد الخیری کو ساتھ لے کر اس کے تنگ اور تاریک مکان میں جا بیٹھے اور پوری رات مرنے والے کے سرہانے آنکھوں میں کاٹ دی۔

شوکت سبزواری

عندلیب شادانی

شخصیت اُردو ادب کے کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے جو تنقیدی تحریروں میں زیادہ برتا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے کثیر الاستعمال الفاظ کی یہ خصوصیت ہے کہ جتنا ان کا استعمال ادب میں زیادہ ہوتا ہے ان کا مفہوم دھندلاتا چلا جاتا ہے۔ عام استعمال میں آنے والی ٹھوس مادی چیزوں میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کثرتِ استعمال سے وہ گھس جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی گھستے گھستے مٹ بھی جاتی ہیں۔ لیکن لفظوں میں یہ اصول کارفرما نہیں ہوتا۔ لفظ استعمال سے منجھ کر نکھرتے ہیں ان کے مفہوم میں کسی قسم کا ابہام ہوتا ہے تو بار بار کے استعمال سے وہ بھی دور ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ادب کا مزاج نرالا ہے۔ یہاں الفاظ نکھرتے نہیں، دھندلاتے ہیں۔ منجھتے نہیں کجلاتے ہیں۔ آج اردو ادب میں جو الفاظ استعمال کئے جارہے ہیں، ان کا مفہوم آج سے پہلے تو کچھ واضح بھی تھا۔ لیکن آج کثرتِ تعبیر نے خوابِ پریشاں بنا رکھا ہے۔

شخصیت کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کوئی اسے کردار کے معنی میں استعمال کرتا ہے، کوئی سیرت کے معنی میں، کسی کے نزدیک روزانہ زندگی کے واقعات شخصیت کا پُرتو ہیں، کسی کے نزدیک ظاہری شکل و صورت، وضع قطع، خط وخال میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شخصیت ان سے ورا ہے۔ وہ نہ کردار ہے، نہ سیرت، نہ روزانہ نقل وحرکت، نہ ظاہری شکل وشباہت۔ شخصیت ایک فطری چھاپ ہے۔ ایک پختہ مزاج ہے جس کی تعمیر میں جبلت کو بھی اتنا ہی دخل ہے، جتنا گردوپیش کے موثرات اور خارجی محرکات کو ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت میں گوشت، پوست، رگ و پے وغیرہ سبھی کا حصہ ہے۔ ان کی خاص قسم کی

ترکیب سے اس کے جسم کا ڈھانچہ بنا ہے۔ قدیم یونانی طبیب عناصر اربعہ کی چار مختلف اور متضاد کیفیات کے اعتدال کو مزاج کہا کرتے تھے۔ یہ شاید صحیح نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شخصیت انسان کا باطنی مزاج ہے جس کی تعمیر مختلف قسم کی اخلاقی کیفیات سے ہوئی ہے۔ مشہور نقاد اسپنگارن نے لکھا ہے کہ ہم اپنے دوست سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے حسن سیرت، صاف گوئی، دیانت، ذہانت، ذوقِ شعری ہی نہیں بلکہ حسنِ صورت، ظرافت، خوش باشی اور صحت کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری گرویدگی اس کی شخصیت سے ہوتی ہے جو ہر چندان تمام ذاتی محاسن اور اخلاقی فضائل سے مل کر بنی ہے۔ لیکن پھر بھی ان سے ماورا اور آزاد ہے۔

شخصیت کے سلسلے میں ایک دو غلط فہمیاں اور ہیں۔ ان کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ سب سے بڑی غلط فہمی تو یہ ہے کہ شخصیت عام طور سے بنی بنائی چیز سمجھی جاتی ہے جس میں گرد و پیش کے اسباب و حالات کی وجہ سے کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ غلط ہے۔ شخصیت بنی بنائی چیز نہیں، وہ حالات کے زیر اثر ڈھلنے والی اور آئے دن بننے بگڑنے والی ہے۔ میں نے اوپر اسے فطری چھاپ اس لیے بتایا تھا کہ اس کے تعمیر میں بیک وقت دو قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ایک جبلت جو خود ایک طرح کی پختہ اور فطری چھاپ ہے۔ دوسرے خارجی حالات۔ اوّل اوّل انسان جبلت کی چھاپ لیے پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ بڑا ہو کر شعور کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کی یہ جبلی چھاپ دھندلا جاتی ہے اور گرد و پیش کے مخصوص حالات کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ جب حالات بدلتے ہیں تو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ یہ چھاپ بھی بدل جاتی ہے۔ اس لیے کسی شخصیت کے خط و خال اجاگر کرنے کے لیے اس کے نت نئے بدلنے والے پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ دوسرے شخصیت کے بے نقاب ہونے کی بہت سی راہیں ہیں، بہت سے دروازے ہیں۔ جن سے شخصیت جھانکتی ہے۔ ان میں سے کچھ سیدھی، صاف اور کشادہ ہیں، کچھ ٹیڑھی میڑھی اور تنگ و تاریک ہیں۔ عام طور سے لوگ سیدھی اور کشادہ راہوں سے شخصیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن شخصیت کی جھلک تیرہ و تار راہوں سے دکھائی دیتی ہے۔ چور دروازے اس کے مشاہدے کے لیے زیادہ موزوں ہیں، ان چور دروازوں تک رسائی آسان نہیں۔ ایک ادیب اور شاعر کی شخصیت کے لیے اس کی تحریریں اور اس کا کلام کبھی کبھی چور دروازے کا کام دیتا ہے۔ ایک شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے جس میں وہ اصلی خط و خال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ بہت سے نقادوں نے اسلوب بیان کو ادیب کی شخصیت قرار دیا ہے۔ اسلوب ہو یا مواد دونوں میں ادیب کی شخصیت جھلکتی ہے۔

شعر اگر آپ بیتی ہے تو شاعر کی شخصیت کے مطالعہ کے لیے اس سے اچھا اور قابلِ اعتماد مواد اور کہیں نہیں مل سکتا۔ شعر کے انتخاب سے اگر دل کا معاملہ کھل سکتا ہے اور رسوائی کا سامان بہم پہنچ سکتا ہے۔ بقول شاعر

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

تو شعر کہنے سے شاعر کی تشہیر تک ہو سکتی ہے۔

اول اول عندلیب شادانی کی شخصیت کے مطالعے کا موقع مجھے اس کے جستہ جستہ اشعار اور سچی کہانیوں کے ذریعے ملا جو رسالہ "ساقی" میں پریم پجاری کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ شادانی نے پریم پجاری کا پردہ، جس سے خود ان کی شخصیت کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے، شاید اس لیے اختیار کیا تھا کہ ان کہانیوں میں صحیح اور سچے واقعات بیان ہوتے تھے اور شادانی اپنے دل کا معاملہ کسی پر کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ شادانی کی شاعری کو بھی سچی کہانی ہی سمجھیے۔ کہانی میں جو روداد بے پردہ بیان کی گئی ہے یہاں اس پر شعر کے ابہام کا ہلکا سا پردہ پڑا ہوا ہے۔ شادانی نے کہیں لکھا ہے کہ میں دل کی باتوں کے سوا دوسرے مضامین کو غزل میں داخل کرنے کا حامی نہیں۔ گزشتہ دس برس میں میں نے تقریباً تین سو غزل کے شعر کہے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے آپ بیتی نہ کہہ سکیں۔ شادانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ سبھی آپ بیتی ہے۔ ان کی کہانیاں تو آپ بیتیاں ہیں ہی، ان کی غزلیں اور نظمیں بھی آپ بیتی ہیں اور ان کی تنقیدیں بھی آپ بیتی کی حیثیت رکھتی ہیں، جو کسی شخصی جذبے یا انفرادی تاثر کے ماتحت لکھی گئی ہیں۔ اگر ان سب پر یکجائی نظر ڈالی جائے تو شادانی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جسے میں ان کی شخصیت کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو صرف اسی ایک پہلو پر قائم ہیں۔ یہ شاید شخصیت کا وہ جبلی پہلو ہے جسے گرد و پیش کے حالات نے اور زیادہ پختہ کر دیا ہے۔

شادانی کے یہاں "انا" کی بڑی اہمیت ہے۔ نفسیات میں ایسے شخص کو انانی (Egotist) کہتے ہیں۔ جدید نفسیات نے انانیت کی بہت سی شاخیں بنائی ہیں جن میں سے ایک خود پرستی بھی ہے جو انانیت کی ایک بڑھی ہوئی لَو ہے۔ ہمارے ادب کی بعض بڑی شخصیتیں خود پرستی کی حد تک انانی تھیں۔ غالب بھی انھی میں سے ہیں اور میں اپنے ایک مضمون میں غالب کی شخصیت کے اس پہلو پر کسی قدر تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ غالب کے یہاں انانیت سے خود بینی پیدا ہوئی اور خود بینی سے خودداری۔ خودداری نے آزادہ روی کو جنم دیا۔ اور آزادہ روی نے انہیں کائنات کی سیر کرائی۔ لیکن شادانی کے یہاں انانیت خود

بنی اور خودداری سے آگے نہ بڑھی۔ وہ مطالعہ نفس میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس اعتبار سے شادانی دروں بیں، (Introvert) ان کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک ہم ان کی کہانیوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان کے کلام میں بھی۔ ان کی کہانیاں ان کی زندگی کے واقعات ہیں اور ان کے اشعار ذاتی تجربات۔ ان واقعات و تجربات میں ان کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ خود اس داستان کے ہیرو ہیں۔ باقی دوسرے کردار ہیرو کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو روشن کرتے ہیں۔ شادانی کے کلام میں جو نشاطی رنگ جھلکتا ہے وہ اسی دروں بینی کی پیداوار ہے۔ شادانی نے آنکھ کھول کر کبھی آس پاس کی زندگی پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ اپنے دل سے پھوٹنے والی خوشیوں اور مسرتوں میں ایسے مگن رہے کہ گرد و پیش کی چیخیں ان کے کانوں تک نہ پہنچیں۔ ان کی زندگی کے دو باب ہیں جن کا ذکر انہوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں!
انہی کی یاد میری زندگی ہے

جب تک وہ خوشی سے ہم کنار رہے مسرت کی پھواریں ان کے دل سے چھوٹتی رہیں۔ اور جب خوشی کی گھڑیاں گذر گئیں تو ان کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ دوسروں کے درد سے متاثر ہونے کا موقع انہیں کہاں ملا اور ان کے دل کے تاروں کو غم و اندوہ کے مضراب نے کب چھیڑا؟

شادانی نے اردو کے جدید شعراء کے کلام پر کچھ اعتراضات کیے ہیں اور اس میں فنی غلطیاں نکالی ہیں اس سے بھی ان کی انفرادیت پسند شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اردو کے ان اساتذہ کے کلام کا مطالعہ انفرادی نقطۂ نگاہ سے کیا۔ اسے ذاتی معیاروں پر پرکھ کر دیکھا۔ اور جب انہیں شاعر کی زندگی اور اس کے کلام میں تضاد نظر آیا تو وہ شاعر کو رسم پرست اور اس کے کلام کو رواجی کہنے لگے۔ اگر وہ انفرادیت کے تنگ دائرے سے باہر نکل کر دیکھتے اور آفاقی یا خارجی نقطۂ نگاہ پیدا کرتے تو وہ ان شعراً کے کلام کو صرف ان کی زندگی پر منطبق کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اس میں انہیں گرد و پیش کی تصویر نظر آتی اور وہ ان کی آواز کو کائنات کے دُکھی دلوں کی صدائے بازگشت سمجھ کر اس پر معترض نہ ہوتے۔

....

شادانی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۶ء میں بریلی میں ہوئی، میں اس زمانے میں ایک مقامی کالج میں اردو کا استاد تھا۔ شادانی موسم خزاں کی چھٹیاں بریلی میں اپنی بیگم کے پاس گزار رہے تھے جو اس وقت گورنمنٹ گرلز کالج کی پرنسپل تھیں۔ ایک روز میرے ایک رفیق چودھری عبدالمجید، جو شادانی کے رفیقِ

درس رہ چکے تھے، میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ''چلو شادانی سے مل آئیں۔'' میں نے شروع میں انکار کیا۔ لیکن جب انہوں نے یہ بتایا کہ شادانی کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا ہی دل کش ہے۔ تمہیں ان کا کلام اسی دل کش انداز میں سنوائیں گے، تو میں آمادہ ہوگیا۔ اور ہم دو چار احباب شادانی سے ملنے بیگم شادانی کی قیام گاہ پر پہنچے۔ میں نے شادانی کی کہانیوں اور عاشقانہ اشعار کو پڑھ کر ان کی ایک ذہنی تصویر بنا رکھی تھی۔ جب شادانی مسکراتے ہوئے باہر آئے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کی صورت میری ذہنی تصویر کے مطابق ہے۔ وہی دراز قد، چھریرا بدن، بڑی بڑی روشن آنکھیں، اونچی پیشانی، مسکراتا ہوا حسین چہرہ اور مترنم آواز۔ مختصر تعارف کے بعد شعر سنانے کی فرمائش ہوئی اور جب انہوں نے اپنی رسیلی آواز میں اپنے چٹیلے شعر سنانے شروع کیے تو مجھ پر ایک عجیب وجد آفریں کیفیت طاری ہوگئی اور ایسا محسوس ہوا کہ کوئی میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں، سخن سرائی نہیں۔ ایک تاثر کا صحیح اور سچا بیان ہے۔ شعر کے بارے میں میرا معیار ذرا سخت قسم کا ہے۔ بہت کم میں کسی شعر کو داد کے قابل سمجھتا ہوں۔ اب یہ شادانی کی شخصیت کا اثر سمجھئے یا ان کی دل کش مترنم آواز کا یا غالب کے الفاظ میں تقریر کی لذت کا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کے بعض شعروں کی میں نے خوب دل کھول کر داد دی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں میرے دل کی بات کہی گئی ہے۔

اس مختصر ملاقات کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو شادانی کے متعلق ایک نقش ابھرا ابھرا سا میرے ذہن میں تھا کہ وہ مجسم شعر و نغمہ ہیں اور بقول شخصے جہاں بھی کوئی حسین عورت ہے وہ ان کی رشتہ دار ہے۔ اس کے بعد بریلی ہی میں دو چار ملاقاتیں اور ہوئیں جن میں میں نے انہیں بہت ہی خوش باش، ظریف، نکتہ رس اور بذلہ سنج پایا۔ ان کی زبان سے ڈھلے ڈھلائے شعر بھی سُنے، ان کی خوش گفتاری کا لطف بھی لیا، اور ان کے چٹکلوں اور لطیفوں سے حظ بھی حاصل کیا۔ شادانی بڑے نکتہ رس اور خوش گفتار ہیں۔ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ قیامِ بریلی کے زمانہ میں انہوں نے انگلستان کے کچھ دلچسپ واقعات مجھے اپنے مخصوص انداز میں سنائے۔ میں ان سے اس درجہ متاثر ہوا میں نے اسی وقت ان سے درخواست کی کہ آپ ان کو قلم بند کر کے شائع فرما دیں۔ یہ یقیناً ان کے اندازِ بیان کی سحر آفرینی کا اثر تھا۔

اس کے بعد شادانی ڈھاکے چلے آئے اور میں میرٹھ چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک ان سے رسمی خط و کتابت رہی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مغربی یو۔ پی میں ایک بھونچال آیا جس نے زندگی کی طنابیں تک اکھاڑ پھینکیں۔ بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں میں ڈھاکہ آ گیا۔ اس زمانہ سے میں شادانی

کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں اور ان کی دلچسپ لیکن سادہ شخصیت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی شخصیت کو دلچسپ اس لیے کہا کہ وہ بڑی مسحور کن اور حسین شخصیت ہے اور سادہ اس لیے کہ وہ سیدھے اور یک رنگ خطوط سے بنی ہے۔ اس میں نہ ٹیڑھے میڑھے خطوط ہیں اور نہ نفسیاتی گر ہیں۔ اس لیے اس کا مطالعہ بہت آسان ہے۔ میں نے پورے چار سال اس کا مطالعہ کیا ہے۔ شادانی کو سمجھنے کے لیے صرف چار روز کافی ہیں۔ میں شادانی کی شخصیت کو انوکھی شخصیت نہیں سمجھتا۔ ہمارے ادب میں انوکھی شخصیتوں کی کمی ہے اور شاید اسی لیے اردو میں کوئی بڑا کارنامہ وجود میں نہ آسکا۔ بڑے کارناموں کی تخلیق سادہ قسم کی شخصیت نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے گرہ در گرہ پیچیدہ شخصیت کی ضرورت ہے۔

شادانی حسن پرست ہیں۔ اس حسن پرستی کا اثر ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا ہے۔ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ لباس پہنتے ہیں۔ ان کے ہر کام میں ستھرا پن ہے۔ ان کی تحریر حسین و جمیل ہوتی ہے۔ صاف اور بے داغ کاغذ پر موتی سے ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ عبارت لکھنے کا انداز بھی سلیقہ مندانہ ہے اور شاید یہ اسی حسن پرستی اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ کا اثر ہے کہ وہ پان اور سگرٹ دونوں سے بیزار ہیں۔ ہماری مشرقی تہذیب میں برگِ سبز تحفۂ درویش کی حیثیت رکھتا ہے اور سگرٹ جدید مغربی تہذیب کی مئے دو آتشہ ہے۔ لیکن شادانی اپنے حسنِ ذوق کے باعث نئی اور پرانی تہذیب کی ان برکتوں سے محروم ہیں۔

شادانی کی حسن پرستی ان کی انفرادیت پسندی کی پیداوار ہے۔ اس لیے اس میں آفاقیت پیدا نہ ہو سکی۔ ان کا عشق بڑا ہی محدود قسم کا ہے ان کے یہاں حسن چاہے جانے کے لیے نہیں اپنانے کے لیے ہے۔ بڑے فنکاروں نے حسن سے اپنے تخیل میں رنگ بھرا، رعنائی خیال اور رنگینیٔ بیان کا اکتساب کیا۔ شادانی انانیت پسند ہیں۔ وہ مانگنے کے قائل نہیں قبضہ کرنا جانتے ہیں۔ یہ ان کے اس نقطۂ نگاہ کا اثر ہے کہ وہ حسن کے جس منظر کو اپنا نہیں سکتے اور اس پر قبضہ جمانا ان کے اختیار سے باہر ہے، اس میں انہیں حسن نظر نہیں آتا۔ وہ پھول کی نرم و گداز پتیوں اور اس کی مست کن مہک پر اکتفا نہیں کرتے۔ اسے شاخ سے توڑ لینا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کے ادبی نظریوں پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ ان میں شکست و ریخت اور تخریب کا ذوق زور پکڑ گیا اور تعمیر کی جگہ تشہیر نے لے لی۔

وہ صرف محبت نہیں کرتے، نفرت کرنا بھی جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت یک رخی نہیں، جو نفرت نہیں کر سکتا وہ محبت بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کی محبت ان کی نفرت سے بڑھی ہوئی ہے۔ ان کے

احباب، رفقاء اور عام شناسا اکثر ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں اسے کمزوری اس لیے کہتا ہوں کہ ان کے اس طرزِ عمل سے ان کو نہ سہی، ان کے اصولوں کو جو انہیں عزیز ہیں نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ان کی شخصیت میں محبت اور نفرت کے عدم توازن سے ان میں کچھ اور کمزوریاں بھی پیدا ہوگئی ہیں۔ وہ ہر شخص سے دل کھول کر ملتے ہیں اور محبت سے ابتدا کرتے ہیں۔ اس لیے خودغرض اور مطلب پرست لوگ جھوٹی محبت جتا کر انہیں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ شادانی اپنی نیک نیتی اور سادگی کی بنا پر، جو ان کی محبت کی پیداوار ہے، خودغرض لوگوں کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے وہ بڑے دقیقہ رس اور ذہین ہیں۔ لیکن ان کی فطرت معصوم ہے۔ کبھی کبھی اصل اور نقل میں وہ فرق نہیں کر پاتے۔ ظاہر پر فریفتہ ہو کر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور حقیقت بہت بعد میں ان پر آشکار ہوتی ہے۔ ان کے ایک رفیق اور منہ چڑھے شاگرد نے پورے دو سال تک انہیں اس فریب میں مبتلا رکھا کہ وہ ان کی حسب ''ہدایت'' کام کر رہا ہے۔ اور بالکل آخر میں اس کا انکشاف ہوا کہ انہیں فریب دیا جا رہا تھا۔

ڈھاکے میں وہ گذشتہ ستائیس سال سے ہیں۔ اور اپنی باغ و بہار طبیعت، خلمنسا ہت، نیز معاشرے میں اپنے مقامِ عالی کی وجہ سے وہ یہاں کے اوپر کے طبقے میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ اور درمیانی طبقے میں بھی ہر دل عزیز اور مقبول ہیں۔ اس لیے اہل غرض بڑی تعداد میں ان کو گھیرے رکھتے ہیں اور صبح سے لے کر شام تک ایک تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ وہ ان سب کے اٹکے ہوئے کام نکالتے ہیں۔ یونیورسٹی کے حلقے میں بھی ان کا رسوخ بڑھا ہوا ہے۔ جب میں ڈھاکے آیا تھا اس وقت وہ شعبۂ فنون (فیکلٹی آف آرٹس) کے ڈین تھے۔ اور آج کل ہیڈ ین ہیں۔ ان کی رائے وزن رکھتی ہے۔ اکثر اہم معاملات ان کے مشورے سے طے پاتے ہیں۔ وہ اپنے اس موقف سے اپنی ذات کو شاید ہی کوئی فائدہ پہنچاتے ہوں۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں وہ کبھی دریغ نہیں کرتے۔ اس شہرت اور عزت سے فائدہ تو بڑی بات ہے اُلٹا ان کا زیاں ہوا ہے۔ کسی زمانے میں دل لگا کر وہ ٹھوس علمی کام کیا کرتے تھے۔ بعض مفید تصانیف کا انہوں نے ڈول ڈال رکھا تھا۔ لیکن اب ان کے مشاغل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ کسی علمی کام کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ جسے اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر علم و ادب اور فن کی خدمت کرنی چاہیے تھی، وہ اپنی اخلاقی بلندی سے مجبور ہو کر غرض مندوں کی کاربراری کر رہا ہے۔ علم کی دیوی کی طرف سے جو وہ بے اعتنائی برت رہے ہیں، وہ شاید کبھی معاف نہ کرے گی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور نقصان بھی

ہوا جس کا تعلق شادانی کی شخصیت کی تعمیر سے ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کام نکالنے کی صرف ایک صورت ہے جسے تملق، چاپلوسی، مداہنہ وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ شادانی کے گرد و پیش جن غرض مندوں کا جمگھٹا رہتا ہے، وہ قریب قریب سبھی اس چلتے ہوئے ہتھیار سے کام لیتے ہیں اور مصاحبوں کی طرح جاو بے جاان کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ نے فلاں نظم خوب کہی۔ فلاں شعر پر آپ نے جو تنقید کی ہے، اس کا جواب نہیں ہوسکتا۔ آپ پاکستان کے نئے اور پرانے شاعروں میں سب سے اونچے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگر چہ شادانی بڑی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں۔ اور ان کو شیشے میں اتارنا آسان نہیں۔ لیکن اس منزل سے کوئی ''سفری'' اپنا سامان سلامت نہ لے جاسکا۔ ان تعریفوں کا شادانی پر غیر شعوری طور سے اثر ہوتا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض اصولوں کے معاملہ میں وہ ذرا کٹر ہوتے جارہے ہیں۔

کل تک وہ بے رحم قسم کے نقاد تھے۔ انہوں نے اکثر بڑے شاعروں کے کلام پر ''جرأت مندانہ'' تنقیدیں لکھیں اور آج بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بخشنا نہیں جانتے۔ لیکن اخلاقی وسعت اور ذہن وفکر کی تابنا کیوں کے باوجود وہ اپنے کلام اور طرزِ عمل پر کسی قسم کی تنقید گوارا نہیں کرتے۔ مجھ سے برابر وہ یہی کہتے ہیں کہ میں جائز تنقید سے ناخوش نہیں ہوتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جرح و تنقید سے وہ ناخوش نہیں ہوتے۔ وہ اتنے وسیع الاخلاق ہیں کہ ان کی ناخوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن انہیں تنقید گوارا نہیں یہ بھی درست ہے۔ یا تو وہ اس تنقید کو جائز نہیں سمجھتے، یا دل کے کسی گوشے میں ان کی ناخوشی دب کر رہ جاتی ہے جسے وہ اُبھرنے نہیں دیتے۔ جس زمانے میں انہوں نے ''خاور'' کے نام سے ایک اردو ماہنامہ ڈھاکے سے نکالا، چاپلوس قسم کے لوگوں کی ان پر یورش تھی۔ تقاضا کے کرکے انہوں نے ''خاور'' کے لئے مجھ سے ایک مضمون لیا۔ ''اردو'' حالی نمبر کے لیے بھی میں نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ ان کے ایک شاگرد نے ان سے جا کر کہا کہ حالی پر میں نے جو مقالہ لکھا ہے، وہ زیادہ بہتر ہے۔ خاور کے لیے اسے حاصل کرنا چاہیے۔ شادانی نے اسی وقت مجھے ایک پرچہ لکھا اور اس میں اس امر کی شکایت کی کہ جو چیز بہتر ہے وہ ''خاور'' کو نہیں دی گئی۔ میں نے بمشکل انہیں یقین دلایا کہ ''خاور'' کو جو چیز دی گئی ہے، وہ بھی اسی درجے کی ہے۔ اس کے بعد پرچہ چھپ کر آیا تو انہوں نے اس کی بابت میری رائے دریافت کی۔ میں نے اس نٹ کی طرح، جو اپنے رفیق کو بانس پر پیٹ کے بل ناچتے اور کرتب دکھاتے دیکھ کر نیچے سے ڈھول پیٹ کر کہتا

ہے۔" کسر رہ گئی! کسر رہ گئی!" کہا، پرچہ ابھی معیار کو نہیں پہنچا۔ اور ساتھ ہی ایک مقالے پر دبے دبے لفظوں میں کچھ اعتراض بھی کیا۔ شادانی یک بیک بگڑ گئے اور کہنے لگے، "معلوم نہیں لوگوں کا معیار کیا ہے۔ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ سبزواری نے کیا لکھا ہے۔ اس کا سر ہے نہ پیر۔" میں یہ سُن کر خاموش ہو گیا۔

مجھے یقین ہے کہ بعض معاملات میں ان کا تشدد ابھی حال کی پیداوار ہے اور اس کی تربیت میں تملق پسندوں کی بے جا ستائش کا بڑا حصہ ہے۔ اگر ان کے کسی اصول پر نکتہ چینی کی جائے تو وہ اس کی اچھی سی نفسیاتی وجہ نکال لیتے ہیں اور اعتراض کی معقولیت اس طرح بڑی آسانی سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ کوئی دو سال ہوئے ان کا مجموعۂ کلام "نشاطِ رفتہ" بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس پر مختلف ادبی حلقوں کی طرف سے تبصرے ہوئے۔ آلِ احمد سرورؔ اور نیازؔ فتح پوری نے دھیمے دھیمے لہجے میں اعتراضات کیے۔ لیکن بزرگ محترم آثرؔ لکھنوی نے تو بلند آہنگ تنقید لکھی جس میں وہی مدرّسانہ انداز اختیار کیا گیا تھا جو کبھی شادانی عصرِ حاضر کے شعراء کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے اختیار کر چکے تھے۔ شادانی نے اس تنقید کو پسند نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ سب نقاداُن سے ناخوش ہیں۔ ان سے ذاتی عداوت اور کاوش رکھتے ہیں اس لیے کہ وہ ایک زمانہ میں ان کے محبوب شعراء کے کلام کو اپنے بے پناہ اعتراضات کا نشانہ بنا کر ان کے شیشۂ عقیدت کو پاش پاش کر چکے ہیں۔ انہوں نے ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ "معترضین کی ناواقفیت یا غلط فہمی جذبۂ انتقام سے قطع نظر اعتراضات کا باعث ہوئی ہے"۔ ایک موقع پر ایک نومشق نے ایک تبصرے کے سلسلے میں میرے ایک مضمون کو ہدفِ مطاعن بنایا۔ اس پر شادانی کے محترم بزرگ مولانا حامد حسن قادری نے ان کے ایک عزیز شاگرد کی وساطت سے انہیں ان مطاعن کی طرف توجہ دلائی۔ شادانی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس میں ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ اس نومشق نے قادری صاحب کے متعلق اپنے تبصرے میں کچھ چبھتی ہوئی باتیں کہیں ہیں اس لیے وہ ناخوش ہو کر جذبۂ انتقام کے ماتحت یہ لکھ رہے ہیں۔

شادانی کسی زمانے میں مطالعہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ علم کی تحصیل میں انہوں نے جو ریاض کیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ حال میں ان کی کاوش اور علمی ریاض کے چند نمونے میں نے دیکھے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس زمانے میں علم کی دیوی کے پجاری تھے اور ان پر کام کرنے کے دھن سوار تھی۔ وہ تمام رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گذار دیتے تھے۔ آج بھی ان کا شوق اتنا ہی تیز ہے۔ یہ اور بات ہے

کہ ان کی توجہ بٹ گئی ہے۔ اب معاشرے میں ان کے مقام نے ان کو سیاسی جوڑ توڑ پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ان کا ذہن صرف علمی وادبی مسائل کی نبردگاہ تھا۔ آج وہ سیاست کی بساط بھی ہے۔ لیکن سرسوتی دیوی سے ان کا ناطہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ میں جب ان کے پاس جاتا ہوں تو گھنٹوں علمی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی یاد نہیں دلاتا کہ آپ کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے یا فلاں میٹنگ میں آپ کو شرکت کرنی ہے۔

شادانی کا حافظہ بلا کا ہے۔ انہیں بڑی پرانی پرانی باتیں یاد ہیں اور وہ انہیں اس طرح سناتے ہیں گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔ ان کی طبیعت کو شعر سے خاص مناسبت ہے۔ فی البدیہہ شعر کہتے ہیں۔ دوسروں کے اشعار بھی بڑی تعداد میں ازبر ہیں۔ طبیعت شگفتہ پھول ہے اس لیے لطیفے اور چٹکلے خوب مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ لطیفے انہیں سن کر یاد ہو گئے یا خود ان کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہیں۔ وہ خود یہ کہتے ہیں کہ یہ لطیفے ان کے دماغ میں محفوظ ہیں۔ ان کی مخصوص مجلسیں بڑی پُر بہار ہوتی ہیں جہاں ان کی طبعی ظرافت کی پھواریں چھوٹتی رہتی ہیں۔ ان کی مجلس سے اکتا کر کبھی کوئی نہیں اُٹھتا۔

کھانے کا میں نے اوپر کہیں ذکر کیا تھا۔ کھانے کے بارے میں وہ شاید حضرت مسیحؑ کے اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ انسان صرف کھانے سے زندہ نہیں رہتا۔ وہ بہت کم مقدار میں کھاتے ہیں اور جو کچھ کھاتے ہیں وہ بہت ہی سادہ اور ہلکا ہوتا ہے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ وہ کسی چیز کے پابند نہیں۔ پان، سگرٹ، حقہ وغیرہ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ وہ ڈھاکے میں رہتے ہوئے بھی جہاں کی آب وہوا مرطوب ہے، چائے نہیں پیتے۔ انہیں صرف کام کی دُھن ہے۔ جب وہ کام کرنے بیٹھتے ہیں تو دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر۔ اور جب تک مکمل نہیں کر لیتے اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ جب وہ دوپہر کا کھانا کھائے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں تو شام کو واپس آ کر کھاتے ہیں۔ اور اکثر یہی ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بغیر کچھ کھائے پئے مشین کی طرح کیسے کام کر لیتے ہیں۔ انہیں مدت سے نزلہ کی شکایت ہے۔ باری باری سے اس کے دورے سے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے کبھی کبھی وہ صاحب فراش ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس زمانہ میں بھی انہیں اسی انہماک، شوق اور تن دہی سے کام کرتے دیکھا ہے۔

انہیں کسی کھیل سے دلچسپی نہیں۔ جسمانی ہو یا ذہنی۔ جس طرح ایک ماہر سازندے کی ساری جسمانی طاقت کھنچ کر اس کی انگلیوں میں آ جاتی ہے، جن سے وہ ساز کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ اسی طرح شادانی

کی ساری دلچسپیاں ان کی آنکھوں میں جمع ہوگئی ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے "بقدرِ شوق" کام لیتے ہیں۔ کبھی کبھی سنیما بھی دیکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت جب کوئی اچھی تصویر ہو اور کوئی صاحب نظر دیکھ کر اس کی تعریف کرے۔ ان کی سب سے بڑی دلچسپی حسن کاری ہے اور ان کا سب سے بڑا کام احساسِ فرض۔ لیکن ان کی حُسن کاری کی حدود ہیں اور ان کے احساسِ فرض کی بھی۔ کسی کو سامنے بٹھا کر حسین شعر کہنا ان کا حاصلِ زندگی ہے اور پورے احساس کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینا ان کی زندگی ہے، اور ان کی شخصیت ان کے حاصلِ زندگی اور زندگی کا حاصل جمع۔ غالبؔ نے یہ شعر اپنے متعلق کہا تھا۔ لیکن یہ شادانی کی زندگی اور شخصیت پر زیادہ صحیح اور پورا اُترتا ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

شورش کاشمیری

عبدالمجید سالکؔ

ہوش کی آنکھ کھولی تو گھر بھر میں مولانا ظفر علی خاںؔ کا چرچا تھا۔ ''زمیندار'' کی بدولت خاص قسم کے الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ انہی الفاظ میں ایک ٹوڈی کا لفظ بھی تھا۔ ''زمیندار نے اس کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ مولانا ظفر علی خاں کے اپنے الفاظ میں راس کماری سے لے کر سری نگر تک اور سلہٹ سے لے کر خیبر تک اس لفظ کا غلغلہ مچا ہوا تھا، جس شخص کا ناطہ بلاواسطہ یا بالواسطہ برطانوی سرکار سے استوار تھا وہ فی الجملہ ٹوڈی تھا۔ اس زمانہ میں ہمیں سیاسیات کے پیچ وخم سے کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی۔ ہم نے ٹوڈی کے مفہوم کو اور بھی محدود کر رکھا تھا، وہ تمام لوگ جو مولانا ظفر علی خاں کے مخالف تھے یا جنہیں مولانا سے اختلاف تھا ہمارے نزدیک ٹوڈی تھے۔

اب چوں کہ انقلاب کے دونوں مدیر (مہر و سالک) زمیندار کے مقابلہ میں تھے اور مولانا سے کٹ کے انقلاب نکالا تھا لہٰذا ہمارے نزدیک ان کا عرف یا تخلص بھی ٹوڈی تھا۔ پھر یہ ہفتوں یا مہینوں کی بات نہ تھی، برسوں تک یہی خیال ذہن پر نقش رہا حتیٰ کہ ایک دھائی بیت گئی۔ دوسری دھائی کے شروع میں یہ لفظ کسی حد تک کجلا گیا اور اس کی جگہ بعض مستور الفاظ رواج پا گئے، مثلاً رجعت پسند، کاسہ لیس وغیرہ۔ ان الفاظ میں دشنام کی بدمزگی تو نہ تھی لیکن حقارت کا مخفی اظہار ضرور تھا۔ بالآخر ان ہجو یہ الفاظ کا زور بھی ٹوٹ گیا۔ یہ تمام الفاظ پھلجڑی کا سماں باندھ کر ٹھنڈے پڑ گئے۔ جن تحریکوں کے ساتھ ان کا شباب تھا ان کے ختم ہوتے ہی ان کی رونق بھی مرجھا گئی اور ان کا تذکرہ سیاسی افکار کے عجائب گھروں کی زینت ہو گیا۔

اس دوران سالک صاحب سے کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں، دفتر زمیندار ہی میں ان سے تعارف ہوا لیکن اس تعارف سے صرف علیک سلیک کا راستہ کھلا۔ وہ اپنی ذات میں مستغرق تھے ہم اپنے خیال میں منہمک، تاثر یہی رہا کہ سالک صاحب ٹوڈی اور انقلاب ٹوڈی بچہ ہے۔

سالک صاحب ہمیں کیا رسید دیتے وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ادھر زمیندار نے ہمیں یہاں تک فریفتہ کر رکھا تھا کہ انقلاب کو ہم نے خود ہی ممنوع قرار دے لیا تھا۔ پانچ سات برس اسی میں نکل گئے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو لمبی لمبی قیدوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہم کوئی دس گیارہ نوجوان منٹگمری سنٹرل جیل میں رکھے گئے۔ سخت قسم کی تنہائی میں دن گذارنا مشکل تھا، قرطاس وقلم موقوف، کتب ورسائل پر قدغن، جرائد وصحائف پر احتساب، یہاں تک کہ عزیزوں کے خط بھی روک لئے جاتے۔ وحشت ناک تنہائی کا زمانہ۔ جیل کے افسروں سے بارہا مطالبہ کیا کہ اخبار مہیا کریں لیکن ہر استدعا مسترد ہوتی رہی۔ جب پانی سر سے گذر گیا تو ہم نے بھوک ہڑتال کردی، نتیجۃً حکومت کو جھکنا پڑا۔ ''سول'' اور ''انقلاب'' ملنے لگے۔ ہماری وارڈ کا انچارج ایک مذہبی سکھ سردار شیر سنگھ تھا، کالا بھجنگ، بدہیئت، اور بدرو۔ قیدیوں کو ستانے میں اسے خاص لطف محسوس ہوتا، یہی اس کی خصوصیت تھی۔ چونکہ اخبار اس کی مرضی کے خلاف ملے تھے اور اسے سنسر کرنے کا اختیار تھا لہٰذا ہر روز اخبار کے مختلف صفحے قینچی سے اس طرح کاٹتا کہ سارا اخبار بے مزہ ہوجاتا سیاسی خبریں تو بالکل ہی کٹ کے آتی تھیں۔ یہی زمانہ تھا جب افکار وحوادث سے روزمرہ کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ شیر سنگھ کو پتہ چلا کہ افکار وحوادث باجماعت پڑھے اور سنے جاتے ہیں تو اس نے افکار وحوادث کاٹنا شروع کیے۔ پہلے دن ہمارا خیال تھا کہ کوئی سیاسی خبر کاٹی ہوگی۔ جب ہر روز قینچی چلنے لگی تو ہم نے شیر سنگھ کو متوجہ کیا، وہ معمول کے مطابق طرح دے گیا۔ ہم نے احتجاج کیا اس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا، ہم نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی، وہ مسکرا کے ٹال گیا۔ آخرکار بھوک ہڑتال کی نیو اٹھائی تو وہ اگلے ہی روز پسپا ہوگیا۔ افکار وحوادث مقراض سے محفوظ ہوگئے۔ بظاہر یہ ایک لطیفہ تھا کہ جس اخبار کو ہم سرکاری منادسمجھتے اور جس کالم میں قومی تحریکوں یا قومی شخصیتوں پر سب سے زیادہ پھبتیاں کسی جاتی تھیں ہم نے اسے بھوک ہڑتال کرکے حاصل کیا۔

غرض افکار وحوادث کی ادبی دلکشی کا یہ عالم تھا کہ ہم اس کی چوٹیں سہہ کر لطف محسوس کرتے۔ سیاسی تاثر تو ہمارا وہی رہا جو پہلے دن سے تھا لیکن اس کی ادبی وجاہت کے شیفتہ ہوگئے۔ مہر صاحب کے اداریے ایک خاص رنگ میں ڈھلے ہوتے، ان میں تحریر کی دلکشی اور استدلال کی خوبی دونوں کا امتزاج

تھا۔ سالک صاحب افکار و حوادث میں مطائبات کی چاشنی اور طنزیات کی شیرینی اس طرح سموتے تھے کہ جی باغ باغ ہو جاتا، محسوس ہوتا گویا ہم میکدے میں ہیں کہ رندانِ دردآشام تلخ کام ہو کر بھی خوش کام ہو رہے ہیں۔

ساتھیوں کا ایک مخصوص گروہ تھا، جس میں جنگ کی وسعتوں اور شدتوں کے باعث اضافہ ہوتا رہا۔ میں منٹگمری سنٹرل جیل سے تبدیل ہو کر لاہور سنٹرل جیل میں آ گیا تو پہلا مسئلہ انقلاب ہی کے حصول کا تھا، سید امیر شاہ (جیلر) کی بدولت فوراً ہی انتظام ہو گیا۔ غرض قید کا یہ سارا زمانہ انقلاب سے آشنائی میں کٹ گیا، رہا ہوا تو سالک صاحب سے ان کے دفتر میں جا کے ملا۔ مہر صاحب اس وقت موجود نہیں تھے اور نہ ان سے کھلا ڈلا تعارف تھا، سالک صاحب تپاک سے ملے۔ یہ سن کر انہیں تعجب ہوا کہ پانچ سال قید کٹوانے کے باوجود سرکار نے مجھے تھانہ انارکلی کے حدود میں نظر بند کر دیا اور تحریر و تقریر پر پابندی لگا دی ہے۔ اُنہوں نے اگلے ہی روز شذرہ لکھا جس میں حکومت کو مشورہ دیا کہ ان ناروا پابندیوں کو واپس لے لے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی اس ملاقات میں وہ پھلجڑیاں چھوڑتے رہے۔ باتوں کو سنوارنا، گفتگو کو تراشنا اور ان سے لطائف نکالنا ان کی طبیعت کا وصف خاص تھا۔ اس معاملہ میں ان کی تقریر، تحریر سے زیادہ دلفریب ہوتی۔ انسان اکتاتا ہی نہیں تھا۔ ایک آدھ دفعہ پہلے بھی یہ مشورہ دے چکے تھے اور اب کے بھی یہی زور دیتے رہے کہ سیاسیات میں اپنے آپ کو ضائع نہ کرو، صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور کتاب و قلم کے ہو جاؤ۔ اب جوان سے تعلقات بڑھنے لگے تو دنوں ہی میں بڑھ کے وسیع ہو گئے۔ یہ زمانہ انگریزی حکومت کے ہندوستان سے رخصت ہونے کا تھا۔ برطانوی سرکار کے آخری دو سال تھے۔ احرار نے روزنامہ ''آزاد'' نکال رکھا تھا، ''انقلاب'' پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں کی مرضی کے مطابق نہ تھا، لہٰذا معتوب تھا۔

تمام ملک میں فساد و انتشار سے آگ لگی ہوئی تھی اس افراتفری کے دنوں ہی میں سالک صاحب سے ملاقات کے مزید راستے کھلے خلوت و جلوت میں ان کا اندازہ ہونے لگا سیاسیات سے قطع نظر یہ بات ذہن میں آ گئی کہ وہ ہمارے مفروضہ سے مختلف انسان ہیں بلکہ خوب انسان ہیں۔ یہ بات بری طرح محسوس ہوئی کہ بعض لوگ مستعار عصبیتوں کی وجہ سے بدنام ہوتے ہیں۔ اور انسان بلا تجربہ اپنے دماغ میں مفروضے قائم کر کے انہیں حقیقتیں بنا دیتا ہے لیکن جب یہی لوگ تجربہ یا مشاہدہ میں آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پاسنگ کا سونا ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے لوگ تجربہ و مشاہدہ میں آنے کے بعد دور کا ڈھول

نکلتے ہیں، ان کی ہم صحبتی ان کے خط وخال کو آشکار کر دیتی ہے۔

سالک صاحب کو مستعار عصبیتوں سے دیکھا تو ان کی شگفتہ تصویر نہ بن سکی، یہی باور کیا کہ خوان استعمار کے زلہ ربا ہیں۔ قریب سے دیکھا تو ایک روشن تصویر نکلے۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری فسادات میں امرتسر کے طوفانوں سے نکل کر لاہور میں تھے انہوں نے اس تصویر کو اور بھی چمکا دیا،

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

اُنہیں سالک سے ملے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ لاہور میں ان کے قیام کی بدولت دفتر احرار میں میلہ سا لگا رہا، یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ برس جاری رہا۔ اس سارے عرصہ میں سالک صاحب کا ذکر بھی کئی دفعہ آیا بلکہ آتا ہی رہا۔ شاہ جی ان سے کٹی کئے ہوئے تھے لیکن ان کی تعریف کرتے اور اس تعریف میں یہاں تک فیاض تھے کہ سالک کی قسمیں کھاتے۔ مثلاً فرماتے کہ اُس کی جوانی بے داغ رہی ہے، وہ ایک شریف انسان ہے، اس میں ایک ادیب کا حسن ہے، اس کو اخبار نویسی کے داؤ پیچ آتے ہیں، وہ قابل اعتماد دوست ہے، وہ دغاباز نہیں، اس کے نفس نے کبھی خیانت نہیں کی وغیرہ۔ اور جب اُن سے کوئی شخص یہ کہتا کہ آپ نے اُن کے ساتھ اتنے برس سے بول چال کیوں بند کر رکھی ہے تو شاہ جی آبدیدہ ہو جاتے فرماتے۔ میں نے تعلقات کا انقطاع نہیں کیا، اس نے خود کنارا کیا ہے۔

اور جب یہ عرض کرتے کہ آپس میں صلح صفائی کر لیجئے تو ذرا ترش ہو جاتے۔ فرماتے، جی نہیں میں اس سے قیامت تک نہیں بولوں گا، اس نے میرا دل دکھایا ہے، میں اس کو کیونکر معاف کر سکتا ہوں، مجھے اس کے بچھڑ جانے کا قلق ہے، قلم سے جو نشتر اُس نے لگائے ہیں دل کا ناسور ہیں، یہ اسی کا بویا ہوا ہے جو ہم کاٹ رہے ہیں اور وہ خود بھی کاٹ رہا ہے۔ سالک صاحب سے تذکرہ ہوتا کہ شاہ جی آپ کے بارے میں یہ کہتے ہیں تو وہ بھی خفی خواہش کو دبا جاتے۔ فرماتے کہ شاہ جی تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں بھلا یہ عمر اب طعنے مہنوں کی ہے۔ دونوں طرف دلوں میں صلح صفائی کی اُمنگ موجود تھی۔ لیکن دونوں کو بارش کے پہلے قطرے کا انتظار تھا۔ آخر ایک روز برکھا ہو گئی۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے شاہ جی کو دفتر احرار سے اٹھایا اور احمد شاہ بخاری (پطرس مرحوم) کی کوٹھی پر لے گئے، وہاں سالک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ صورت حال یہ تھی،

وہ ہم سے خفا ہیں ہم اُن سے خفا ہیں
مگر بات کرنے کو جی چاہتا ہے

نظریں چار ہوئیں، سارا گلہ جاتا رہا، شام گلخپ میں کٹ گئی۔ رات بھر پطرس، سالک، تبسم اور شاہ جی لاہور کی سڑکوں پر آوارہ پھرتے رہے۔ شاہ جی اور سالک دونوں خوش آواز تھے۔ شاہ جی حافظ کی اس غزل کا مصرع اولی اٹھاتے، سالک مصرع ثانی۔ اسی میں نصف رات کٹ گئی۔۔۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی ے ناب و سفینۂ غزل است

شاہ جی خود راوی تھے کہ اس رات ہم نے اپنی شخصیتوں کو اپنے وجود سے خارج کر دیا تھا۔ اکثر راہ گیروں کو حیرت ہوتی کہ شرفا قسم لوگ موٹر میں اس طرح ناچتے پھر رہے ہیں۔ غرض شاہ جی اور سالک صاحب اس مراجعت اور مفاہمت سے بے حد خوش تھے۔ پاکستان اور ہندوستان آزاد ہو گئے تو انقلاب عارضی طور پر بند ہو گیا۔ شاہ جی لاہور سے اٹھ کر مظفر گڑھ چلے گئے۔ میں نے ''آزاد'' جاری رکھنا چاہا لیکن پرایا پنچھی تھا پُھر سے اُڑ گیا۔ چٹان کا ڈیکلریشن لے چکا تھا اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ احرار کے دفتر سے چوٹ کھا کر ویرا ہوٹل میں آ گیا۔ چٹان نکالا، سالک صاحب بے حد خوش ہوئے خیر مقدم کا ایک دلآویز خط لکھا جو پہلے شمارہ میں شائع ہوا۔ حالات معمول پر آ گئے تو انقلاب دوبارہ جاری کرنے کا قصد کیا۔ انقلاب کا اپنا دفتر فسادات کی وجہ سے تباہ ہو چکا تھا۔ انہیں دفتر کی تلاش تھی، میں نے اپنے دفتر کا ایک بڑا حصہ انہیں دے دیا اور وہ اس میں فروکش ہو گئے۔ انقلاب دوبارہ جاری ہوا لیکن زمانہ موافق حال نہ تھا، سال چھ مہینے بعد بند ہو گیا، سالک صاحب اس زمانہ میں خاصے پریشان تھے، تاہم اُن کا فقر و استغنا حیرت انگیز تھا۔ اپنے چہرے مہرے سے کبھی پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ یہی دن تھے جب ان سے تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ مجید ملک ان دنوں مرکزی حکومت میں پرنسپل انفرمیشن آفیسر تھے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کا زمانہ تھا، ان کی تقاریر لکھنے کے لیے مجید ملک نے سالک صاحب کو کراچی بلا لیا اور وہاں اٹھارہ سو روپے ماہوار پر یہ خدمت سونپ دی۔ سالک صاحب وہاں تین چار سال رہے، سارا عرصہ ان سے خط و کتابت کا تانتا بندھا رہا۔ میں خط لکھنے میں ذرا سست تھا، وہ خط لکھتے اور اتنے پیارے خط لکھتے کہ سطر سطر سے ان کی شخصیت پھوٹی پڑتی۔ اس سارے عرصہ میں انہوں نے کوئی دو سو خط لکھیں ہوں گے، پھر ۱۹۵۱ء سے یہ شعار بنا لیا تھا کہ ہر سال کے پہلے شمارے میں چٹان کا افتتاحیہ لکھتے۔ اس اداریہ میں اتنی حوصلہ افروز اور نکتہ آفریں باتیں ہوتیں کہ ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوتی۔ وہ بڑ کا درخت نہ تھے کہ اس کے سایہ میں کوئی پودا ہی نہیں کھلتا، وہ سورج اور ہوا کی طرح مہربان تھے۔ دوسروں کا دل بڑھانا بالخصوص

نوجوانوں کو اچھالنا اور اُجالنا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا، ہر شخص کے کام آنا ان کی فطرت ثانیہ تھی، ہر ضرورت مند کی سفارش کرتے اور اس میں کوئی عیب نہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ سفارش تعلقات کی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ سفارش کرنے سے سرکاری فرائض مجروح ہوتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ اس نظام اور اس معاشرہ میں سفارش کرنا انصاف اور حق کی دستگیری کرنا ہے۔ جب تک ضرورت مند کا کام نہ ہوتا انہیں بے چینی رہتی۔ کراچی سے مجھے ایک خط لکھا کہ فلاں شخص تمہارے پاس آ رہا ہے اُسے فلاں شخص سے کام ہے، میں خود آ نہیں سکتا سفارش کا کام میں نے اپنے دو خلیفوں کے سپرد کر دیا ہے۔ لاہور کے خلیفہ تم ہو اور کراچی کے مجید لاہوری۔ اس شخص کے ساتھ جا کر پرزور سفارش کر دو، رتی برابر تساہل نہ ہو، یہ ہر طرح سفارش کے مستحق ہیں۔ میں سال ششماہی کراچی جاتا تو میری خاطر دوستوں کو کھانے پر مدعو کرتے۔ ایک دفعہ نگار ہوٹل میں پرتکلف عشائیہ دیا، میں نے لاہور واپس آ کر خط لکھا کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی، بزرگوں سے خوردوں کی نسبت ہی بڑی شے ہے۔ فوراً خط آیا کہ اس کی ضرورت تھی، تمہارے متعلق یار لوگوں نے بہت کچھ کہہ سن رکھا تھا۔ دفتر چٹان کی عمارت میں انقلاب کا دفتر کھلا تو بعض نے خوفزدہ کرنا چاہا کہ بے ڈھب آدمی کے ساتھ گذارہ مشکل سے ہو گا لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور جو کچھ میں نے پایا اس سے میرے دل میں تمہارے لیے محبت اور عزت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ لوگ تمہیں درشت کہتے تھے، میں نے تمہیں ایک جان نثار دوست پایا ہے، جو سلوک تم نے انقلاب کے ساتھ کیا اُس احسان سے میرا بال بال بندھا ہوا ہے۔

خط پڑھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ ان کے لفظوں میں ایک ایسا انسان بسا ہوا ہے جس کی فطرت سلیم اور روح عظیم ہے۔ معاملہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ میں نے ان سے کرایہ نہیں لیا تھا یا ایک دو مہینے بجلی کا بل اور فون کا کرایہ ادا کر دیا تھا۔ لیکن سالک صاحب ہمیشہ کے لیے رطب اللسان ہو گئے۔ مجھے اسی طرح عزیز رکھتے جس طرح اپنے دوسرے عزیزوں سے انہیں تعلق خاطر تھا۔ دولتانہ وزارت نے چٹان بند کیا تو وہ سخت مضطرب ہوئے۔ اپنے طور پر انہوں نے کوشش بھی کی کہ یہ بندش دور ہو جائے لیکن ان کی پیش نہ گئی۔ خواجہ شہاب الدین ان دنوں وزیر داخلہ تھے، ان سے کہا لیکن وہ بھی چٹان سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔ قصہ کوتاہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ چٹان سال بھر بند رہا، دوبارہ نکلا تو افتتاحیہ لکھا اور اس ٹھاٹھ سے لکھا کہ ادب و انشا کا مزہ آ گیا۔ اس اثنا میں جب کبھی لاہور آتے دفتر چٹان میں ضرور تشریف لاتے۔ فرماتے، گھر سے نکلتا ہوں تو صرف چٹان کے لیے یا راستہ میں مرزا محمد حسین سے مل لیتا ہوں۔ غرض لاہور

میں ہوتے تو دفتر چٹان میں التزاماً آتے شاذ ہی ناغہ کرتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ کئی کئی گھنٹے نشست ہوتی۔ ابوصالح اصلاحی ہر موضوع پر بے تکان بولتے تھے۔ ان سے دن بھر گپ شب رہتی۔ میں ایک روز کسی رومانی دلچسپی میں غائب ہوگیا تو گلہ کیا اور میرے اباجی سے کہہ گئے کہ میں صرف اس کے لیے آتا ہوں اور یہ محفل کی محفل ایک گرہ طلب مصرع پر قربان کر گیا ہے۔ اگلے روز کراچی چلے گئے، ایک پہلودار خط لکھا کہ عشق رسوا ہو جائے تو عشق نہیں رہتا، عیاشی ہو جاتا ہے۔

وہ بڑوں کی طرح چھوٹوں کو ان کی غلطیوں پر لتاڑتے یا جھاڑتے نہیں تھے، نہ ان کے کان کھینچتے اور نہ ان پر وعظ ونصیحت کا بوجھ لادتے۔ ہنسی مذاق میں اصلاح کرتے، دوستوں کی طرح توجہ دلاتے۔ اور بزرگوں کی طرح نقش جماتے تھے۔ ان کی چال ڈھال یا بات چیت سے کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی سرزنش کر رہے ہیں۔ یا ان کے سامنے کوئی مطالبہ ہے۔ ان کا ایک خاص انداز تھا جو انہیں کے لیے مخصوص تھا۔ وہ سب کے لیے یکساں لب ولہجہ رکھتے۔ حفظ مراتب تو بہر حال ہوتا ہی ہے لیکن جہاں تک کسی سے مخاطب ہونے، اس کی سننے، اپنی سنانے اور باہمی مبادلہ افکار کا تعلق تھا وہ خورد وکلاں سب کی عزت نفس کا احترام کرتے تھے۔ البتہ زبان کے معاملہ میں کسی سے خم نہ کھاتے۔ خود اہل زبان ان سے خم کھاتے تھے۔ ان میں اَنا ضرور تھی اور ایگو کا یہ اظہار ہر فن کار یا قلم کار میں ہوتا ہے لیکن دوسروں کے جذبات مجروح کرنے کا تصور بھی ان کے ہاں نہیں تھا۔ وہ اس طرح سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ایک ہی فن سیکھا تھا، کہ دوسروں کا حوصلہ کیوں کر بڑھایا جاتا ہے۔ پختہ مشق ادباء وشعرأ سے لے کر سے لے کر ناپختہ کار ادباء وشعراء اکثر وبیشتر ان کے پاس آتے وہ کسی کی حوصلہ شکنی نہ کرتے۔ ہر شخص کی استعداد کا خیال رکھتے اور شوق بڑھاتے تھے۔ ان کا فیض صحبت عام رہا۔ پطرس مرحوم ان سے مستفید ہوتے رہے، تاثیر مرحوم نے بھی استفادہ کیا، امتیاز علی تاج نے بھی فیض اٹھایا، احمد ندیم قاسمی ان کے شاگرد ہیں۔ قاسمی ان پر نازاں سالک کو ان پر فخر، مجید لاہوری کو بھی انھی سے تلمذ تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر ناز کرتے تھے۔ ''نیاز مندان لاہور'' کا سارا حلقہ ان کا گرویدہ رہا تاہم یہ کوئی مجلس یا حلقہ نہ تھا۔ خود ایک مضمون میں جو انہوں نے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا تھا، اس حلقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل نوجوان ہر چار یاری کو ایک تحریک بنا لیتے اور اس پر خیالات کے تانے بانے بنتے ہیں۔ نیاز مندان لاہور کا اور چھور صرف یہ تھا کہ عبدالرحمٰن چغتائی نے لاہور سے ایک سالنامہ ''کارواں'' نکالا جو اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اس میں اہل زبان کی مدارات کے لیے نیاز مندان لاہور کے نام

سے دو ایک مضمون لکھے گئے۔ جمنا پار کے بعض اہل قلم کا شیوہ تھا کہ وہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کی زبان پر ناک بھوں چڑھاتے۔ پطرس، سالک، تاثیر اور مجید ملک نے مل جل کر ان کا جواب دینا شروع کیا۔ سالک صاحب کی اپنی روائت کے مطابق نیاز مندان لاہور ان چاروں احباب کا مشترکہ نام تھا، جو کچھ لکھنا ہوتا باہم صلاح مشورہ کر لیتے۔ پطرس مضمون لکھتے آپس میں غور کیا جاتا، اس کے بعد مضمون چھپ جاتا۔ غرض ان مضمونوں کی خاصی شہرت ہوگئی۔ یہ گویا پہلا تابڑ توڑ حملہ تھا جو راوی و چناب کے اہل قلم نے گنگا و جمنا کے اہل قلم پر کیا۔ ان مضامین میں معذرت کا انداز تھا ہی نہیں۔ اس سے پہلے اہل زبان پنجاب کے اہل قلم پر حملہ کرتے تو یہاں کے لوگ مسخر و مرعوب ہو جاتے یا پھر ایک ہی چارہ تھا کہ مدافعت میں سند و جواز لائیں یا اہل زبان جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے سامنے سر جھکا دیں۔

نیاز مندان لاہور کے ان مقالوں کا ردعمل یہ ہوا کہ روبرو بات کرنے کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ اہل زبان کو بھی کان ہو گئے، برتری کا غرور جاتا رہا، محض اہل زبان ہونا فضیلت کا باعث نہ رہا۔ نتیجۃً تو تکار بھی زیادہ عرصہ نہ رہی اور نہ اس طرف کے سنجیدہ اہل قلم نے اس میں حصہ لیا۔ سالک صاحب نے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ اس کو تحریک کہنا یا کسی باقاعدہ حلقے سے منسوب کرنا صحیح نہیں اور نہ کبھی اس انداز میں سوچا ہی گیا۔ اب جو لوگ نیاز مندان لاہور میں شریک ہوتے ہیں وہ پطرس، سالک، تاثیر اور مجید ملک کے دوست ضرور تھے لیکن نیاز مندان لاہور کے شریک قلم نہ تھے۔ مثلاً صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حفیظ جالندھری اور امتیاز علی تاج ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے، تاثیر مرحوم ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں استاد تھے، انہوں نے اپنے گرد خوش ذوق شاگردوں کا ایک حلقہ جمع کیا ہوا تھا جس میں محمود نظامی اور حمید نسیم کو خصوصیت حاصل تھی۔ اس سارے گروہ نے عہد کر رکھا تھا کہ ادب و شعر میں جو کچھ ہے انھی کے دم قدم سے ہے۔ پنجاب میں ان سے باہر کچھ نہیں۔ سالک صاحب ان کے پیر و مرشد تھے۔ اس حلقے نے (یا نیاز مندان لاہور ہی کہہ لیجئے) یکے بعد دیگرے چار محاذوں پر جنگ چھیڑی، راوی پار سے جمنا پار پر حملہ ترکانہ ان کا دوسرا مورچہ تھا۔ اس سے پہلے یہ لوگ علامہ سیماب اکبرآبادی کو لاہور سے بھگا چکے تھے۔ سیماب مرحوم اپنے چہیتے ساغر نظامی کے ساتھ لاہور میں وارد ہوئے اور یہاں ٹکنا چاہا۔ مشاعروں میں جھڑپیں ہوئیں جس سے باقاعدہ محاذ کھل گیا۔ سیماب نے ہر چند مقابلہ کرنا چاہا اور کچھ دنوں خم ٹھونک کر ڈٹے رہے لیکن بالآخر پسپا ہو کر بھاگ گئے۔ سیماب سے تکرار کی ایک وجہ ساغر نظامی بھی تھے۔ ان دنوں ساغر خود ایک غزل تھے۔ سیماب ان کے بغیر جی ہی نہیں سکتے تھے۔ اپنے کلام کا بڑا حصہ ان کے حوالے کر

دیا۔ ساغر بلا کے خوش آواز تھے۔ سرخ و سپید رنگ، بوٹا سا قد، سرتا قدم ادا ہی ادا۔ مشاعرہ پڑھتے تو سامعین کو بہا کے جاتے۔ نیاز مندان لاہور کے واحد شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے تو واجبی تھے لیکن گلا انہوں نے بھی نورانی پایا تھا۔ نہ ایک نیام میں دو تلواریں سما سکتی ہیں نہ ایک مشاعرے میں دو گلے۔ سیماب کو زعم تھا کہ وہ میر تقی میر اور اسد اللہ خاں غالب کے ہم رتبہ ہیں، زبان ان کی لونڈی ہے۔ نیاز مندان لاہور اپنی قلمرو میں کسی دوسرے کی فرمانروائی کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ وہ زبان کو اپنی گھوڑی سمجھتے تھے۔ نتیجۃً آپس میں ٹھن گئی۔ شیخ عبدالقادر کی صدارت میں طرحی مشاعرہ تھا۔ قافیہ تھا سیلاب، ردیف تھی رہ گیا۔ ساغر نے دون کی لی، مقطع پڑھا۔۔۔

ساغر کے زمزموں کی تب و تاب الاماں
ہر معرکہ میں شاعر پنجاب رہ گیا

چوٹ حفیظ پر تھی، سالک پھریری لے کر اٹھے،

میاں صاحبزادے! وہ دوسرا مقطع بھول گئے ہو۔۔۔

پیر مغان کی بادہ گساروں سے ٹھن گئی
ساغر کی تہ میں قطرۂ سیماب رہ گیا

مشاعرہ لوٹ پوٹ ہو گیا، سیماب کٹ کے رہ گئے، ساغر کا رنگ اُڑ گیا۔ اسی طرح کے ایک اور مشاعرہ میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ ساغر نے رباعی پڑھی، چوتھا مصرع تھا

یوسف کی قمیص ہے جوانی میری

سالک صاحب نے آواز دی۔۔۔ میاں! وہ بھی پیچھے ہی سے پھٹی تھی۔ مشاعرہ زعفران زار ہو گیا۔ ساغر نے کسی مصرع میں کوئی محاورہ غلط باندھ دیا، سالک صاحب نے سرعام ٹوکا، ساغر نے اپنے طور پر کاٹنا چاہا

کاش آپ کی زبان مجھ میں ہوتی

سالک صاحب نے چمک کر فرمایا،

میاں صاحبزادے! میں اپنی زبان کی بات نہیں کر رہا تمہاری مادری زبان کا ذکر کر رہا ہوں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سیماب صاحب زیادہ دن لاہور میں نہ رہ سکے، ساغر کو لے کر لوٹ گئے۔ میدان حفیظ کے لیے رہ گیا۔ جو عموماً جمنا پار کے مشاعروں سے دل آزردہ ہو کر آتے تھے۔ سالک صاحب زبان سے

بغاوت کے حامی نہ تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ان کی خفی و جلی غلطیوں پر ٹوکتے اور ان کی اصلاح کرتے۔ لیکن وہ اہل زبان کی صرف زبان کے غرور پر برتری کے بھی قائل نہ تھے۔ پاکستان بنا تو دہلی و لکھنؤ کے بعض اہل قلم لاہور آ گئے۔ ان میں نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی بھی تھے۔ باتوں باتوں میں خواجہ صاحب نے سالک صاحب سے کہا، چلیے ہم لوگوں کے آنے سے ایک فائدہ تو ہوگا کہ پنجاب والوں کی زبان صاف ہو جائے گی۔ سالک صاحب نے جھٹ سے فرمایا جی ہاں، انشا اللہ مادری زبان ہو جائے گی۔ خواجہ صاحب تاڑ گئے لیکن مسکرا کے رہ گئے۔

ان کا تیسرا محاذ علامہ تاجور نجیب آبادی کے خلاف تھا۔ سالک صاحب بظاہر کیا طبعیتاً لڑاکا نہ تھے۔ اب چونکہ نیاز مندان لاہور ان کے بھی نیاز مند تھے لہٰذا وہ ان کے لیے تلوار بھی تھے، اور سپر بھی۔ اصل لڑائی حفیظ و تاثیر کی تھی۔ حفیظ کو شاعرانہ حسد و رقابت سے مفر نہ تھا، تاثیر کو فطرتاً چوچلوں میں مزہ آتا تھا۔ تاجور سے کٹا چھنی کا سبب بھی یہی تھا۔ ان سب نے ان پر یلغار کی۔ وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے، انہوں نے بھی خم ٹھونک کر مقابلہ کیا۔ کوئی اور ہوتا تو لازماً بھاگ جاتا لیکن تاجور آخر وقت تک ڈٹے رہے جھکے نہیں۔ آخری عمر میں انہیں سید عابد علی عابد کے ہاتھوں سخت آزار پہنچا۔ لیکن وہ ہر چوٹ کھانے کے عادی ہو گئے تھے۔ عابد صاحب اب تو نیاز مندان لاہور میں شمار ہونا چاہتے ہیں لیکن اس وقت تاجور کے عقیدت مندوں میں تھے۔ ان کی شاعری کو پروان چڑھانے میں بھی تاجور کا ہاتھ تھا، انہی کے رسالوں نے انہیں جلا بخشی۔

تاجور نے لاہور سے جس پائے کے ادبی رسالے نکالے وہ آج تک صحافت میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''ادبی دنیا'' کی نیو رکھی۔ جب تک اس کے ایڈیٹر رہے اس کا ڈنکا بجتا رہا، پھر ''شاہکار'' نکالا، اور شاہکار بنا دیا۔ بچوں کے لیے ہفتہ وار ''پریم'' نکالا، اردو مرکز قائم کیا، اس کے اہتمام میں بہت سے مجموعے مرتب کر کے شائع کیے، بیسیوں نوجوانوں کی ادبی تربیت کی، مشاعروں کو عام کیا۔ غرض جہاں تک زبان اردو کے مذاق کو عام کرنے کا تعلق ہے، ایک ادارہ سے بڑھ کر کام کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو کام پطرس، تاثیر، تبسم، حفیظ اور تاج سے نہ ہو سکا وہ تاجور نے تنہا کیا۔ ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے گرد و پیش نیاز مندان لاہور جیسا کوئی حلقہ نہ تھا کہ وہ لوگ سیاسی فطرت کے ادبی کھلاڑی تھے۔ سالک نے تو عمر بھر قلم ہی کی خدمت کی۔ اور اتنا لکھا کہ انتخاب ہی کے کئی مجموعے شائع ہو سکتے ہیں، لیکن پطرس ادب میں کب تک زندہ رہ سکتے ہیں؟ یہ محل نظر ہے۔ مرحوم ایک ادیب سے

زیادہ ایک محفل آرا شخصیت تھے جنہیں مختلف زبانوں کے ادبیات کا انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا تھا لیکن ان کی یہ خوبی ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔ تاثیر کا ادبی ترکہ محدود ہے اور اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت بھی برائے نام ہے لیکن وہ زبردست ادبی اور سیاسی کھلاڑی تھے۔ انہیں اس برعظیم میں ترقی پسند تحریک کا سرخیل کہا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے ہی داؤں پیچ کی وجہ سے وہ اسی پود کے ہاتھوں مارے گئے جسے انہوں نے خود تیار کیا یا جس کا بیج ان کے اپنے ہاتھوں بویا گیا تھا۔ پاکستان میں ترقی پسند تحریک کو ان کے ہاتھوں شدید نقصان پہنچا۔ لیکن ترقی پسندوں کے ہاتھ سے انہیں بھی بہت سے گھاؤ لگے۔ مجید ملک سرکاری افسر ہو کر سرکاری افسر ہی رہ گئے انہوں نے اس جوڑ توڑ میں کبھی حصہ نہ لیا جو تاثیر مرحوم کا شیوہ خاص رہا۔ تبسم عمر بھر طلبہ کے استاد رہے۔ پھر ریڈیو کے ہو گئے۔ ان کے کلام میں پختگی ضرور ہے، شگفتگی ناواں ناواں ہے۔ امتیاز علی تاج مرنجان مرنج ہیں۔ لیکن انارکلی یا چچا چھکن میں اتنا بوتا نہیں کہ انہیں دوام حاصل ہو۔ ان کی حیثیت ایک مہر شدہ ادیب کی ہے۔ البتہ حفیظ میں ایک بڑے شاعر کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں۔ ان کے بغیر اردو غزل یا اردو نظم کا ہر تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

غرض نیاز مندان لاہور جس حلقہ کا نام رہا وہ پہلی سازش تھی جو ادب میں کی گئی۔ ان لوگوں نے انجمن ستائش باہمی کی بنیاد رکھی۔ صوبہ بھر میں اپنے حلقہ سے باہر نہ تو کسی اہل قلم کی ادبی وجاہت کو یہ لوگ تسلیم کرتے اور نہ اپنے سوا کسی کو بالا سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال کے گرد انہوں نے عقیدت کا حصار بنا رکھا تھا اور اس کے وجوہ تھے۔ سالک صاحب کے مرشد بننے یا بنانے کے بھی محرکات تھے، مثلاً زمیندار سے انقلاب کی کٹا چھنی، عام آویزشوں میں ایک روزنامہ کی ضرورت، سالک کا قلم جس سے ادبی اور سیاسی محاذوں میں رسد پہنچتی تھی۔

ماہناموں میں نیرنگ خیال کے عروج کا زمانہ تھا اور وہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مقابلے میں عالمگیر تھا لیکن وہ ان جھگڑوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ اس پر یوپی اور حیدر آباد کے اہل قلم چھائے ہوئے تھے۔ تاجور پہلے ادبی دنیا پھر شاہکار کے مالک و مدیر رہے۔ حفیظ نے ان کے خلاف قلم اٹھایا، مشاعروں میں تکا فضیحتی ہوئی تو علامہ نے بھی طبیعت کی جولانی دکھائی۔ بڑے زور کا رن پڑا۔ علامہ صاحب نے ادبی دنیا کے سالنامہ میں حفیظ کا نام لیے بغیر لیکن انہیں مخاطب کر کے اس زور کی نظم لکھی کہ زبان وفن کا لطف آ گیا اس نظم میں کھلی ہجو تو نہ تھی لیکن سخت قسم کے نشتر ضرور تھے سالک صاحب نے اس ساری لڑائی میں نیاز مندان لاہور کی مدافعت کی، اور خوب کی۔ تاجور البتہ سالک سے لڑنا نہیں چاہتے تھے، ان سے

ہلکی پھلکی چوٹیں ہوتی رہیں۔ نتیجۃً یہ محاذ کبھی سخت گرم ہوتا کبھی سخت سرد۔

ادھر تاجور نے بھی نوجوان لکھنے والوں کی ایک کھیپ پیدا کی اور وہ نیاز مندان لاہور کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب رہے۔ اختر شیرانی کو ان سے تلمذ تھا، وقار انبالوی ان کے صحبت یافتہ تھے، عبدالحمید عدم نے ان سے فیض اٹھایا، احسان دانش زبان وفن کے رموز میں ان سے متمتع ہوئے، فاخر ہریانوی، فیاض ہریانوی، اودے سنگھ شائق، کرپان سنگھ بیدار ان کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ اس باب میں ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔

ان ادبی معرکوں کی تفصیلات اس وقت سامنے نہیں اور نہ زیر قلم خاکے میں یہ ساری تفصیل آ سکتی ہے البتہ انہیں جمع کیا جائے تو ایک دلچسپ ادبی تاریخ تیار ہو سکتی ہے۔

''موت سے کس کو رستگاری ہے'' تاثیر دیکھتے آنکھوں رخصت ہو گئے۔ پطرس کو امریکہ میں ساونی آ گئی، سالک کو بھی بلاوا آ گیا اور وہ اپنے رب سے جا ملے۔ ان سے پہلے تاجور صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ آخری عمر میں ان کی خواہش تھی کہ سالک سے ان کی صلح ہو جائے۔ خود مجھ سے کئی دفعہ کہا۔ چونکہ روہیلا پٹھان تھے اس لیے طبیعت میں ضد بھی تھی۔ بہرحال ایک دن صلح ہو گئی، دونوں استاد بھائی تھے جب گلے سے آ ملے سارا گلہ جاتا رہا۔

ادھر کئی برس پہلے نیاز منداں لاہور کی ہماہمی کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ حفیظ ان سب سے الگ رہنے لگے۔ بلکہ ان کے خلاف تند و ترش باتیں کرتے۔ تاثیر اور حفیظ میں مدۃ العمر کھچاؤ رہا۔ حفیظ نے سوز و ساز میں سالک صاحب کے خلاف چٹکی لی۔ سالک صاحب کا بیان تھا کہ گرامی علیہ الرحمۃ نے مرنے سے پہلے حفیظ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا تھا کہ اس کی شاعری پر نگاہ رکھنا۔ یہ روایت حفیظ کو ناگوار گذری، ہوا یہ کہ طرفین کے دلوں میں غبار آ گیا لیکن موت نے یہ قضیہ بھی [illegible]۔ سالک رہے نہ تاجور، پطرس رہے نہ تاثیر، رہے نام اللہ کا۔ حفیظ بقید حیات ہیں لیکن ان دوستوں اور ان دنوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کے ظہور اور عروج کا زمانہ تھا۔ نیاز مندان لاہور ان پر بھی حملہ آور ہو گئے۔ اسلامیہ کالج میں فروغ اردو کے نام سے طلبہ کی جو انجمن قائم تھی تاثیر اس کے سرپرست تھے۔ اس میں خاص خاص مصلحتوں سے خاص خاص مضمون لکھوائے پڑھوائے اور چھپوائے جاتے تھے۔ جوش بھی ان کا هدف بنا۔ انھی دنوں احسان دانش نے چمکنا شروع کیا۔ لاہور سے ان کا اٹھنا حفیظ کے لیے قیامت ہو گیا۔ حفیظ اپنے رنگ کے شاعر تھے ان کا ترنم ان کے ساتھ مخصوص

ہو چکا تھا احسان دانش کی شاعری جوش سے شانہ ملا کر نکلی، آواز اس بلا کی تھی کہ جس مشاعرے میں جاتے انھی کا ہو جاتا۔ نیاز مندان لاہور کے لیے یہ نئی افتاد تھی۔ احسان میں کمزوری یہ تھی کہ وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہ تھے قدرت کے عطیہ نے انہیں بالا بلند شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ان دنوں تاثیر کا یہ شہرہ تھا کہ فن وادب میں بیگانہ ہیں۔ احسان نے غزلوں کا مجموعہ ''حدیث ادب'' مرتب کیا تو اصلاح کی غرض سے تاثیر کے پاس لے گئے، تاثیر نے مجموعہ ضائع کر دیا لیکن احسان سے کہا کہ گم ہو گیا ہے۔ احسان نے دوبارہ محنت کر کے مجموعہ مرتب کیا، تاثیر نے اب یہ کیا کہ اسے گم تو نہ کیا لیکن اس کے معیاری اشعار مجروح کر دیئے۔ عجب نہ تھا کہ احسان او، نقصان اٹھاتے لیکن ان پر اصل حقیقت آشکار ہو گئی۔ کہ حفیظ انہیں گوارا نہیں کرتے۔ حفیظ کی مملکت میں کسی دوسرے شاعر کا شاعری یا ترنم کی وجہ سے مقبول ہونا ان کے لوگوں کے نزدیک جرم تھا۔

تاجور نے احسان کا ساتھ دینا شروع کیا۔ احسان روز بروز چمکتے گئے حتیٰ کہ ہر مشاعرہ کے لیے ناگزیر ہو گئے۔ ان کی آواز کا جادو صوبائی عصبیتوں کو ختم کر گیا۔ نیاز مندان لاہور کی ہیبت ماند پڑ گئی، شاعری کی نئی نئی راہیں کھلیں، کئی مدرسہ ہائے فکر پیدا ہو گئے، ادب وانشاء میں اس تیزی کے ساتھ سیلاب آیا کہ نیاز مندان لاہور کا اجارہ خود بخود بیٹھ گیا۔ ''نیاز مندان لاہور'' کا چوتھا محاذ مولانا ظفر علی خاں کے خلاف تھا۔ یہ محاذ زمیندار اور انقلاب کے تصادم سے کھلا۔ سالک صاحب اس کے سالار تھے۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں تن تنہا، دوسری طرف مہر، سالک، دونوں ہی قلم کے دھنی، ان کے لاؤ لشکر میں حفیظ، تاثیر، تبسم، پطرس۔

تاثیر قدوسی نظامی کے فرضی نام سے ظفر علی خاں کے مقابلہ میں نکلے۔ لیکن کہاں راجہ بھوج کہاں نوا تیلی، ظفر علی خاں چوکھی لڑنے میں بے مثال تھے۔ انہوں نے ایک ایک سے دو دو ہاتھ کئے، جو سامنے آیا ڈھیر ہو گیا۔ ہجو نگاری میں ان سے کون نپٹ سکتا تھا۔ بہ قول سید سلیمان ندوی وہ اردو کے تین کامل الفن اساتذہ میں سے ایک تھے۔ اول محمد رفیع سودا دوم اکبر الہ آبادی سوم ظفر علی خاں۔ سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں طرحیں نکالتے اور ادق سے ادق قافیوں میں رونق پیدا کرتے تھے۔ مولانا باخبر رہتے کہ فلاں نظم کس کی ہے؟ اور فلاں دشنام کہاں سے آئی ہے؟ تاثیر کو اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ چھٹکارا مشکل ہو گیا۔ مولانا نے انقلاب کے میمنہ ومیسرہ میں ان لوگوں کو دیکھا تو للکارتے ہوئے اعلان کیا۔۔۔

زمیندار ایک آپ اتنے مگر اوج صحافت پر!!
یہ اک تکل لڑے گا آپ کی ساری پتنگوں سے

چناں چہ اس تکل کے ہاتھوں ساری پتنگیں کٹ گئیں۔ کوئی دو ماہ گھمسان کا یدھ رہا، ادھر بیسیوں سورما، ادھر ایک ہی پرانا پھکیت۔ ہر ضرب کاری۔ آخر علامہ اقبال کی مداخلت سے میثاق ہو گیا۔

سالک صاحب زبان کی باریکیوں سے کما حقہ آگاہ تھے۔ روزمرہ اور محاورہ میں کبھی ٹھوکر نہ کھاتے۔ قواعد زبان سے بخوبی واقف تھے؟ املا کا غایت درجہ خیال رکھتے، اردو اخبار نویسی میں اعلیٰ معیار قائم کیا۔ وہ صحافتی قبیلے کی آخری کھیپ کے شہسوار تھے۔ ان کی ذات میں بیک وقت ادب و شعر کی بہت سی روایتیں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ''راہ و رسم منزلہا'' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ کلام بھی چھپا۔ انقلاب نکلا تو شاعری گاہے ماہے کی چیز ہو گئی۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، اتنا شستہ اور رفتہ ترجمہ کرتے کہ بسا اوقات اصل ماند ہو جاتا۔ کئی ترجمے طبع زاد معلوم ہوتے۔ ٹیگور کی گیتانجلی کا ترجمہ بڑا مقبول ہوا، گاندھی جی نے بھی اس کو سراہا۔ نثر لکھنا ان کے لئے اتنا ہی آسان تھا جتنا آبشار کے لیے بہنا، بے تکان اور بے تکلف لکھتے۔ کسی اسلوب کے مقلد نہ تھے۔ فرماتے مطالعہ انسان کے ذخیرہ معلومات میں اضافہ کا باعث ہوتا اور اس سے اسلوب بنتا ہے۔ جس آدمی کی معلومات جتنی وسیع ہوں گی اس کا اسلوب تحریر اتنا ہی صاف ستھرا ہوگا۔ وہ محض انشاپردازی یا محض لفاظی کے حق میں نہ تھے۔ ان کی تحریریں اس لحاظ سے بڑی دلفریب ہوتیں کہ سیدھے سادے الفاظ میں۔ بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے۔ وہ کسی مسئلہ میں صرف الفاظ پر گذارہ نہ کرتے اور نہ ان کا سہارا لیتے تھے، انقلاب کے شذرات اور مہر صاحب کی غیر حاضری میں اداریئے بھی وہی لکھا کرتے۔ کم لوگ جانتے تھے کہ جو شخص مطائبات نویسی میں یکہ تاز ہے وہ اس قسم کی ثقہ عبارت بھی لکھ سکتا ہے۔ انہیں نثر کے ہر اسلوب پر قابو تھا، وہ شگفتہ ضرور تھے لیکن مزاح کے علاوہ بھی ان کا قلم کسی موضوع پر بند نہیں تھا۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں تاریخ، تذکرہ، سیرت اور ادب کے موضوع بھی ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف کوئی ادیب طناز، بذلہ سنج صحافی یا مطائبات نویس ایڈیٹر ہے۔ ان کی شہرت افکار و حوادث کی وجہ سے ہوئی۔ بلکہ یار لوگوں میں ان کا نام ہی پیر افکار شاہ پڑ گیا۔ افکار و حوادث نے روز ناموں میں مطائبات کو آب و دانہ بخشا۔ اس کی دیکھا دیکھی کئی ایک مطائبات نویس پیدا ہو گئے لیکن افکار و حوادث سر فہرست ہی رہا۔ سند باد جہازی (چراغ حسن حسرت) سے قطع نظر شائد ہی کوئی مطائبات نویس ہو جس کی

زبان میں سالک صاحب جیسی شوخی، ندرت، برجستگی، شگفتہ پن، طنز، گھاؤ، بے ساختگی اور سادگی پائی جاتی ہو۔ انہوں نے سب سے بڑا جہاد جعلی پیروں اور مصنوعی صوفیوں کے خلاف کیا، غلط گو شعراُ اور پوچ نویس ادباء کو آڑے ہاتھوں لیا جس سے اصلاح زبان ہوتی گئی۔ اس کے علاوہ افکار وحوادث میں کانگریس، ور اس کے زعما پر پھبتیاں کسی جاتیں یا ان لوگوں پر چوٹیں چوٹیں ہوتیں جو کانگریس سے قریب اور سرکار کے حریف تھے۔ انقلاب کے اس کردار کا دفاع نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا مزاج حکومت کے نزدیک رہا لیکن زبان کا ذائقہ جو ان کے ہاں تھا اور کہیں بھی نہ تھا زبان ہی کا لطف تھا کہ ان کی پھبتیاں بھی پھول معلوم ہوتی تھیں۔ بسا اوقات ان کی پھبتی ننگی بھی ہو جاتی مگر وہ جس رخ سے پھبتی کستے، طعن توڑتے، مصرع اُٹھاتے، بذلہ فرماتے، لطیفہ گھڑتے اس میں ایک خاص سرور تھا کہ خود چوٹ کھانے والوں کی زبان پر کلمہ تحسین ہوتا۔ وہ اس فن میں بڑے ہی مشاق تھے۔ کوئی سی پھبتی ان کی زبان پر آ کر رہ نہیں سکتی تھی۔ اصل خوبی ان کی یہ تھی کہ وہ الفاظ سے مزاح پیدا نہیں کرتے تھے بلکہ ظرافت ان کے دماغ سے اُگتی تھی۔ سیدھے سادے الفاظ میں چوٹ کر جاتے۔ انہیں مزاح و ہزل کی حدوں کا بھی اندازہ تھا اور بذلہ وطنز کی رگیں بھی پہچانتے تھے۔ وہ فحاشی، پھکڑ، گالی گفتار، ضلع جگت، پھبتی، طنز، ہجو، تضحیک اور طعن کے فرق کو بخوبی سمجھتے تھے۔ کبھی کبھار ان کے الفاظ غصیل بھی ہو جاتے اور ان سے شدید قسم کا گلہ بھی پیدا ہوتا، لیکن شاذ و نادر۔ اس قسم کا گلہ عموماً ذومعنی الفاظ کے استعمال سے پیدا ہوتا۔ وہ قلم اور زبان دونوں کے حاتم تھے، جس محفل میں بیٹھتے، پھبتیوں کی جھاڑ باندھتے اور لطیفوں کا انبار لگاتے۔ قلم اٹھاتے تو ان کا یہی حال ہوتا۔ نام بگاڑنے میں عجیب وغریب خصوصیت کے مالک تھے، مثلاً انگلستان کے وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ کا نام اس کی ہندو نوازی کے باعث رام جی مکندا مل رکھا، عطاء اللہ شاہ بخاری کا بخار اللہ شاہ عطائی، مظہر علی اظہر کا ادھر علی اُدھر۔ ان کے علاوہ کچھ اور راہنماؤں کے نام بھی مسخ کیے لیکن ان میں مطائبات کی شیرینی نہ تھی، دشنام کی سنگینی تھی۔ ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمان صدر مجلس احرار اسلام نے تقریر میں کہا بعض تھڑ دلے ہمیں بدنام کرنے کے لیے چندے کا حساب مانگتے ہیں، ہم لوگ بنیا نہیں کہ حساب لیے پھریں۔ ہمیں اپنی دیانت پر اعتماد ہے جو لوگ ہم پر بھروسہ کرتے ہیں وہ چندہ دیں باقی ہوا کھائیں، سالک صاحب نے افکار وحوادث میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، حضرت مولانا کس کم بخت نے آپ سے کہہ دیا کہ آپ بددیانت ہیں؟ دیانت تو آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ شکایت یہ ہے کہ آپ نے بے نکاحی رکھی ہوئی ہے۔

ایک محفل میں اختر علی خاں (اللہ انہیں بخشے) کے لاابالی پن کا ذکر ہو رہا تھا کہ وہ شہید گنج میں کوئی دستاویز اٹھا کر ماسٹر تارا سنگھ کو دے آئے تھے۔ سالک صاحب نے تبسم فرمایا اور کہا، چھوڑ یار، اختر علی خاں بھی تو تارا سنگھ ہی کا ترجمہ ہے۔۔۔

کلیم صاحب ملٹری اکاؤنٹس میں غالباً ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل یا اس سے بھی کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں شعر و سخن سے ایک گونہ لگاؤ تھا، اکثر مشاعرے رچاتے۔ ایک مشاعرہ میں سالک صاحب بھی شریک تھے۔ کسی نے ان سے کلیم صاحب کے بیٹے کا تعارف کراتے ہوئے کہا،

آپ کلیم صاحب کے صاحبزادے ہیں۔

رگ ظرافت پھڑک اٹھی فرمایا۔۔۔

تو یہ کہیے آپ ضرب کلیم ہیں۔

غرض ان کا سینہ اس قسم کے لطائف الادب کا خزینہ تھا، جس محفل میں ہوتے چھا جاتے۔ برجستہ گوئی، حاضر جوابی، بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی، شعر فہمی، نکتہ آفرینی، یہ سب گویا ان کے خانہ زاد تھے۔ طبیعت میں آمد ہی رہتی، آورد کا ان کے ہاں گذر ہی نہیں تھا۔

ایک تہائی صدی انہوں نے بڑے آدمیوں کی رفاقت اور صحبت میں بسر کی۔ اس زمانہ کا شائد ہی کوئی بڑا ہندوستانی یا پاکستانی ہو جن سے ان کے تعلقات نہ رہے ہوں، بڑے بڑوں سے ان کا ملاپ رہا۔ چناں چہ میری ہی تحریک پر انہوں نے ''یاران کہن'' لکھی۔ جو مکتبہ چٹان سے شائع ہوئی۔ اس میں کوئی بیس نامور لوگوں کا ذکر کیا ہے جن میں اکثر ملک و ملت کے جلیل القدر راہنما تھے۔ ان بزرگوں اور دوستوں کا شائد ہی کوئی لطیفہ ہو جو انہیں یاد ہو اور رہ گیا ہو۔ ''سرگذشت'' کے نام سے انہوں نے اپنے سوانح حیات قلمبند کیے، پہلے ''امروز'' پھر ''نوائے وقت'' میں قسط وار چھپتے رہے، آخر کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔ اس کتاب سے ان کے ذہنی نشو و نما اور ادبی و سیاسی مذاق ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سی برگزیدہ ہستیوں اور نامور شخصیتوں کی سیرت کا عکس بھی مل جاتا ہے۔ حسرت کے الفاظ میں ''سرگزشت'' ہمارے ملک کی چہل سالہ علمی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرقع ہے۔ ظرافت ان کے قلم سے یوں نکلتی ہے جیسے کڑی کمان سے تیر۔ عام طور پر وہ لکھتے لکھاتے کوئی ایسا لطیفہ یا چٹکلہ بیان کر جاتے ہیں کہ خشک سے خشک بحث بھی بامزہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ''سرگزشت'' میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے، اور ''یاران کہن'' تو زیادہ تر ان شخصیتوں ہی کے لطائف کا تذکرہ ہے۔

....

لاہور میں جمعیۃ العلما کا اجلاس ہو رہا تھا، ملک بھر کے علماء جمع تھے۔ سالک صاحب نے ان پر ریشتاغ کی پھبتی کسی۔ مہر صاحب نے مولانا ابوالکلامؒ سے ذکر کیا، انہوں نے بہت داد دی اور کہا کہ لمبی لمبی ڈاڑھیوں کے مجمع کو اس سے بہتر کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ریشتاغ ہٹلر کی پارلیمنٹ کا نام تھا۔

آغا حشر سے ان کی ملاقات ۱۹۱۶ میں ہوئی، جب وہ لاہور میں مقیم تھے۔ دنوں ہی میں گاڑھی چھننے لگی۔ آغا بلا کے بذلہ سنج، نکتہ طراز، اور بدیہہ گو تھے، سالک بھی ان خصوصیتوں میں پیچھے نہیں تھے البتہ آغا صاحب پھکڑ بھی تھے اور گالی گفتار سے رکتے نہیں تھے۔ اہل قلم پر یہ زمانہ کچھ زیادہ مہربان نہ تھا۔ آغا صاحب کا ہاتھ اکثر تنگ رہتا، جب کہیں سے کوئی رقم آتی تو دنوں میں لٹا دیتے۔ طبیعت سخی اور لکھ لٹ پائی تھی۔ سالک صاحب روایت کرتے تھے کہ وہ اور حشر اُن دنوں مونگ پھلی سے جیبیں بھر کے آدھی آدھی رات تک لاہور کی بڑی بڑی سڑکوں پر پھیرے ڈالتے اور دنیا بھر کی گپیں ہانکتے تھے۔ ایک روز آغا صاحب کو کلکتہ سے پانچ ہزار روپیہ آیا، بہت خوش ہوئے۔ تعلیاں بگھارنا ان کی فطرت میں تھا۔ سالک صاحب شام کو ان کے ہاں پہنچے تو عالم ہی دوسرا تھا۔ کہنے لگے، آغا حشر ڈرامہ کا خدا ہے، ہندوستان بھر میں کوئی شخص اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، وہ انڈین شیکسپیئر ہے۔۔۔ سالک نے کہا، جیسا تھرڈ کلاس انڈیا ہے ویسا ہی اس کا شیکسپیئر ہوگا؟ بہت بھنائے، چوں کہ سالک صاحب سے گالی گلوچ کا لین دین نہ تھا لہٰذا اسٹپٹا کر رہ گئے۔ کہنے لگے جانتے ہو پانچ ہزار روپے کتنے ہوتے ہیں؟ سالک نے کہا جی ہاں سنا ہے پانچ ہزار کی چھاؤں میں کتا بیٹھتا ہے۔ بے اختیار ہنس پڑے، فرمایا مسخرے پن سے باز نہیں آتے۔

....

خواجہ حسن نظامی بھی قدرت سے طباع اور طرار طبیعت لے کر آئے تھے، ان کے ہاں بھی زبان کا زور بندھا ہوا تھا۔ دہلی مرحوم کی آبرو تھے۔ جہاں تک ان کی خصوصیتوں کا تعلق تھا وہ کئی خوبیوں کی تصویر تھے، مثلاً پیر بھی تھے، پیرزادے بھی، اخبار نویس بھی تھے اور اہل اللہ بھی، صاحب طرز ادیب بھی تھے اور صوفی باکرامت بھی، تاجر بھی تھے اور سجادہ نشین بھی۔ گویا ایک ذات میں کئی وجود جمع ہو گئے تھے۔ شوشہ چھوڑنے، مصرعہ اٹھانے، تھگلی لگانے، کرتب دکھانے، پتنگ اڑانے، ناٹک رچانے اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ نظام الدین اولیاء اللہ کے جوار میں رہ کر ایک دنیا سے لڑائی لے رکھی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کو حیدر آباد سے پنشن دلوائی، مولانا محمد علی کے لیے بھڑوں کا چھتا ہو گئے، دیوان سنگھ

مقتوں سے تاناری ری شروع کی اور آن واحد میں ملہار گانے لگے، مہاتما گاندھی کی چرغ چون کا بھرکس نکالا، شرر بانند کا ٹینٹوا دبایا، شدھی کو ناکوں چنے چبوائے، تبلیغ کا ڈول ڈالا، انسان کیا! طوفان تھے۔ سالک صاحب چوں کہ نظام خانقاہی کے خلاف لکھا ہی کرتے تھے اس لیے ان سے بھی کبھی کبھار چاؤ چونچلے ہو جاتے۔ خواجہ صاحب بہرحال ایک زندہ دل اور یار باش شخصیت تھے، حجرے میں مجرے کا جواز بھی پیدا کر لیتے۔ بھارت بیاکل تھیٹریکل کے ایک نوعمر اداکار، چونی لال پر خواجہ صاحب کی نظر عنایت ہوگئی، سالک صاحب کو شوخی سوجھی، تین چار اشعار فارسی میں لکھ کر گمنام کی طرف سے خواجہ صاحب کو ڈاک میں بھیج دیے۔۔۔

اے خواجۂ نامدار چونی
در صحبت گلفدار چونی،
من در ہجر تو ایں چنینم
تو در پہلوئے یار چونی،
در حسرت قرب ذات بیچوں
اے صوفی ہرزہ کار چونی،

خواجہ صاحب لاہور تشریف لائے تو سالک صاحب نے چونی لال کا پوچھا۔ خواجہ صاحب بھانپ گئے، فرمایا اچھا تو وہ اشعار آپ کے تھے؟

....

حکیم فقیر محمد چشتی جگراؤں کے تھے، لیکن ان کا وطن ثانی لاہور تھا۔ قدرت نے ان میں حذاقت و طبابت کے علاوہ لطافت وظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ پھبتی کہنے اور ضلع جگت میں بے نظیر تھے۔ سالک صاحب بھی ان کا لوہا مانتے وہ پھبتی کستے ہی نہیں اس میں اصلاح بھی کرتے تھے۔ مثلاً سالک صاحب نے ان کی بوقلمونی پر آٹھوں گانٹھ کمیت کی پھبتی کسی، کہنے لگے کیا سائیسوں کی زبان بولتے ہو؟

مطب میں حکیم صاحب کے پاس نجو طوائف بیٹھی تھی، اتنے میں سالک صاحب آ گئے۔ حکیم صاحب نے نجو سے کہا ان سے ملو ہمارے شہر کے بہت بڑے ادیب اور شاعر عبدالمجید سالک ہیں۔ وہ آداب بجالائی۔ سالک سے کہا کہ یہ لاہور کی مشہور طوائف نجو ہے۔ سالک صاحب نے کہا، نجو؟ بھلا کیا نام ہوا؟ فرمانے لگے لوگ نجو نجو کہہ کر پکارتے ہیں پورا نام تو نجات المومنین ہے۔ نجو کا کھلا چمپئی رنگ، سر

پہ سفید ریشمی دوپٹہ، کناروں پر چوڑا نقرئی ٹھپہ۔ سالک نے کہا، ملاحظہ فرمایا آپ نے، ڈبیہ کا انگور ہے، تشبیہ تام تھی بہت داد دی، حکیم صاحب نے فرمایا،

بھلا اس تشبیہ کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

خمیرۂ گاؤ زبان پہ ورق نقرہ پیچیدہ

سالک صاحب پھڑک اٹھے۔

....

سالک صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کا باغ و بہار ہونا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک دفعہ ان سے یہ پوچھا، سالک صاحب آپ کو معلوم ہے عربی میں کھٹائی کو کیا کہتے ہیں۔ جواب دیا حموض۔ فرمایا کھٹا کرنا تحمیض کہلاتا ہے، برے معنی میں نہیں بلکہ چٹپٹا بنانے کے معنی میں۔ عربی میں ایک قول ہے، نخ مجالسکم، اپنی مجلسوں اور صحبتوں کو چٹپٹا بناؤ۔ تو آپ کے آنے سے ہماری مجلس چٹ پٹی بن گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ سالک صاحب جس مجلس میں ہوتے وہ چٹپٹی ہو جاتی، شرکائے مجلس دیر تک لطف اندوز ہوتے۔

....

ہر شخص کا اندازہ اس کے دوستوں سے کیا جاتا ہے۔ سالک صاحب اوائل عمر ہی سے جن لوگوں کے ساتھ رہے وہ قلم کے لیے مایۂ ناز تھے، اقبال، ابوالکلام، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، ممتاز علی۔ جس پایہ کے یہ لوگ تھے وہ ان کے نام اور کام سے ظاہر ہے۔ ہم سفروں میں انہیں مہر جیسا رفیق قلم ملا۔ ہم نشینوں میں چراغ حسن حسرت، مرتضی احمد میکش، احمد شاہ بخاری، محمد دین تاثیر۔ شاگردوں میں احمد ندیم قاسمی اور اولاد میں عبدالسلام خورشید۔ تمام عمر قرطاس و قلم میں کٹی، سالہا سال لکھا اور سالہا سال پڑھا۔ اس اعتبار سے وہ ایک تہائی صدی کے ادب و سیاست کی چلتی پھرتی کہانی تھے۔ ان کی باتوں سے جی اکتاتا ہی نہیں تھا، کیا کیا باتیں ان کے سینہ میں نہیں تھیں؟ کتنی ہی باتیں ان کے قلم سے صفحہ کاغذ پر آ گئیں، کتنی ہی لوگوں کے حافظہ میں بے تحریر پڑی ہیں اور کتنی ہی ناگفتنی ہونے کے باعث محفلوں میں اڑتی پھرتی ہیں۔ اکثر گفتنی و ناگفتنی وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ جس موضوع پر بولتے موتی رولتے۔ ہا! میر درد نے کس وقت کہا تھا۔۔۔

یارب وہ ہستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں؟
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں؟

....

"اس بازار میں" میری ایک رسواسی کتاب ہے، یہ فحاشی کی تاریخ ہے۔ اس کا خیال مجھے ایک فیچر سے پیدا ہوا جو میں نے چٹان کے سالگرہ نمبر میں لکھا تھا۔ سالک صاحب نے زور دیا کہ میں اس فیچر کو مختلف ابواب میں تقسیم کرکے کتاب لکھ دوں۔ اس بازار میں پھرتے پھراتے مجھے ایک ایسے گھرانے میں جانا پڑا جس کی مالکن کبھی جوان تھی۔ ایک زمانہ میں علامہ اقبال اس کی آواز سے خوش ہوتے تھے، اس کا نام امیر تھا۔ امیر کا زمانہ لد چکا تھا۔ اس وقت ستر پچھتر برس کے پیٹے میں تھی، چہرے پر جھریوں کی چنٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ لٹے ہوئے عیش کی تصویر ہے۔ میں نے ادھر اُدھر کے ٹانکے ملا کر سوال کیا کہ وہ مجھے اقبال کے بارے میں کیا بتا سکتی ہے؟ لیکن طرح دے گئی۔ میں نے اصرار کیا، اس نے رسید تک نہ دی۔ میں نے پچکارنا چاہا وہ ٹال گئی۔ ہزار جتن کیے لیکن کسی طرح بھی ڈھب پر نہ آئی۔ جب میں نے سارے داؤں استعمال کر لیے تو خدا کا واسطہ ڈالا۔ لیکن اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ جب میں نے عذرو انکار کی وجہ پوچھی تو اس نے حقے کی نے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ شرفاً کے رازوں کی نمائش یا بیوپار نہیں کیا کرتے۔ آپ خواہ مخواہ ہوا کو مٹھی میں تھامنا چاہتے ہیں"

واپس آکر میں نے سالک صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ امیر کے ذکر سے ششدر رہ گئے پوچھا، ابھی تک زندہ ہے؟ عرض کیا جی ہاں۔ پھر ایک واقعہ سنایا کہ مولانا گرامی لاہور تشریف لائے تو مجھے دفتر سے اٹھا کر علامہ اقبال کے ہاں لے گئے علامہ اُن دنوں بازار حکیماں میں رہتے تھے۔ علی بخش سے پتہ چلا کہ علامہ بیمار ہیں، دھسہ لے کر لیٹے ہوئے تھے، ڈاڑھی بڑھی ہوئی چہرہ اُترا ہوا، آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ گرامی دیکھتے ہیں آبدیدہ ہوگئے۔ پوچھا خیریت ہے؟ معلوم ہوا کہ امیر کی ماں نے میل ملاقات بند کردی ہے۔ پچھلے تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی۔ گرامی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پنجابی میں کہا۔

اوچھڈ یار توں وی غضب کرنا ایں، او تینوں اپنی ہنڈی کس طرح دے دین۔

(چھوڑ دو یار تم بھی غضب کرتے ہو، بھلا وہ تمھیں اپنی ہنڈی کیوں کردے دے)۔ علامہ بے حد غمگین تھے۔ گرامی نے علی بخش سے کہا، گاڑی تیار کرو۔ مجھے ساتھ لیا اور اس بازار کو روانہ ہوگئے۔ امیر کے مکان پر پہنچے، دستک دی۔ امیر کی ماں نے گرامی کو دیکھا تو خوش دلی سے خیر مقدم کیا۔

آپ اور یہاں۔۔۔؟ اھلاً و سھلاً

گرامی نے امیر کی ماں سے گلہ کیا کہ تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے کی ٹھانی ہے۔ اُس نے کہا مولانا شاعروں کے پاس کیا ہے، چار قافیے اور دو ردیفیں۔ کیا میں اپنی لڑکی ہاتھ سے دے کر فاقے مر جاؤں؟ آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے، میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟

گرامی نے اُجلی ڈاڑھی کا واسطہ دیا، اور دو گھنٹہ کی شخصی ضمانت دے کر امیر کو ساتھ لے آئے۔ میں علی بخش کے ساتھ، گرامی امیر کے ساتھ گھوڑا دوڑ کی میں چلا آرہا تھا۔ علامہ کے ہاں پہنچے تو گرامی نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا،

اُٹھو جی، آ گئی امیر۔

سچ مچ، علامہ نے حیرت سے پوچھا۔

امیر سامنے کھڑی تھی، دفعتاً اُن کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ سالک صاحب نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا، زندگی میں اس قسم کی آرزوئیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ انسان کو ان راستوں سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ فرمایا جس زمانہ میں اقبال انارکلی میں رہتے تھے، ان دنوں لاہوری دروازہ اور پرانی انارکلی میں بھی کسبیوں کے مکان تھے۔ ایک دن میں علامہ کے ہمراہ انارکلی سے گذر رہا تھا کہ اچانک وہ ایک نکیائی کے دروازہ پر رک گئے۔ ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت، مونڈھے پر بیٹھی حقہ سلگا رہی تھی۔ اندر گئے حقہ کا کش لگایا، اٹھنی یا روپیہ اس کے ہاتھ میں دے کر آ گئے۔ میں بھونچکا رہ گیا، ڈاکٹر صاحب یہ کیا حرکت؟ فرمایا، سالک صاحب، اس عورت پر نگاہ پڑی تو اس کی شکل دیکھ کر لہر سی اٹھی کہ اس کے پاس کون آتا ہوگا؟ پھر مجھے اپنے الفاظ میں تکبر محسوس ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ آخر اس کے پہلو میں بھی دل ہوگا۔ یہی احساس مجھے اس کے پاس لے گیا کہ اپنے نفس کو سزا دے سکوں اور اس کی دل جوئی کروں۔ یہ عورت صرف پیٹ کی مار کے باعث یہاں بیٹھی ہے ورنہ اس میں جسم کے عیش کی ادنیٰ سی علامت بھی نہیں ہے؟

....

سالک صاحب نے علامہ اقبال کے ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا، عمر کی آخری تہائی میں وہ ہر چیز سے دستبردار ہو گئے تھے۔ ان کے قلب کا یہ حال تھا کہ آن واحد میں بے اختیار ہو کر رونے لگتے، حضورؐ کا نام آتے ہی ان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی، پہروں اشکبار رہتے۔ ایک دفعہ میں نے حدیث بیان کی کہ مسجد نبوی میں ایک بلی نے بچے دے رکھے تھے، صحابہؓ نے بلی کو مار کر بھگانا چاہا، حضورؐ نے منع کیا۔ صحابہؓ نے عرض کی، مسجد خراب کرتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اسے مارو نہیں، یہ ماں ہو گئی ہے۔

حدیث کا سننا تھا کہ علامہ بے اختیار ہو گئے، ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سالک صاحب کیا کہا؟ مارو نہیں ماں ہو گئی ہے، اللہ اللہ اُمومت کا یہ شرف؟ سالک صاحب کا بیان تھا کہ حضرت علامہ کوئی پون گھنٹہ اسی طرح روتے رہے، میں پریشان ہو گیا۔ ان کی طبیعت بحال ہوئی تو مجھے بھی چین آیا، ورنہ جب تک وہ اشکبار رہے میں ہلا رہا گویا مجھ سے کوئی شدید غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

....

۱۹۴۶ء میں سالک صاحب نے میری استدعا پر روزنامہ آزاد میں اپنی جیل یاترا پر ایک مضمون لکھا پھر یہی مضمون انہوں نے تفصیلات کے ساتھ ''سرگذشت'' میں تحریر کیا۔ وہ نومبر ۱۹۲۱ء میں زیر دفعہ ۱۵۳ الف گرفتار ہو کر ایک سال قید ہو گئے۔ لاہور سنٹرل جیل سے میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا جہاں پنجاب اور دہلی کے بہت سے پولیٹیکل قیدی رہ رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اور عبدالعزیز انصاری نے مولانا احمد سعید دہلوی سے ادب عربی، صرف ونحو عربی اور منطق کا سبق پڑھنا شروع کیا۔ مولانا لقاءاللہ عثمانی پانی پتی نماز میں ہم سب کے پیش امام تھے۔ سید حبیب مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھاتے اور مولانا داؤد سید صاحب کو عربی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کو انگریزی آئی نہ ان کو عربی۔ مولانا عبداللہ چوڑی والے، میر مطبخ تھے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی۔ جس میں اختر علی خاں گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری غزل گاتے۔ مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے۔ مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے۔ آہ ان دوستوں میں سے لقاءاللہ کے سوا ایک بھی حیات نہیں۔

آن قدح بشکست وآں ساقی نماند

سرگذشت کا زندانی حصہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ایک تذکرہ میں کئی تذکرے آ گئے ہیں۔ حسرت کے الفاظ میں قید کا یہ ایک سال ان کے سوانح حیات کی قیمتی متاع تھا۔

....

اس کے بعد کبھی قید نہ ہوئے۔ زمیندار کو بدمزگی سے چھوڑا۔ مہر صاحب کی رفاقت میں انقلاب نکالا۔ جو برطانوی حکومت کے ترک ہندوستان تک چلتا رہا۔ آزادی کے بعد بھی سال چھ مہینے نکلا۔ آخر آب وہوا کو موافق نہ پا کر بند کر دیا۔ یہ ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے کہ مجید ملک (پرنسپل انفرمیشن آفیسر) کی تحریک پر حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات ومطبوعات سے منسلک ہو کر کراچی چلے گئے۔ وہاں فرضی ناموں سے حکومت کی پالیسیوں کے حق میں مضامین لکھتے رہے۔ بعض سرکاری مطبوعات کے ترجمے

کیے۔ خواجہ ناظم الدین کی تقریریں لکھیں۔ ملک غلام محمد کا زمانہ آیا تو اسی خدمت پر مامور رہے۔ کوئی چار سال بعد وہاں سے لوٹے تو یہاں مختلف ادبی و علمی اداروں سے منسلک ہو گئے۔ منیر انکوائری رپورٹ کا اردو ترجمہ کیا۔ ایک روز اچانک بیمار ہو گئے۔ اس بیماری نے صحت کی عمارت ہلا دی۔ دواؤں کے سہارے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے لیکن اندر خانہ کمزور پڑ گئے۔ اکثر گھر ہی میں رہتے۔ وضعداری کا یہ حال تھا کہ تعلقات بنا کے توڑتے نہیں تھے۔ میری اہلیہ کو انھی دنوں دماغ کا عارضہ ہو گیا۔ خود ان کی پوتی کو بھی یہی عارضہ تھا۔ اس مرض کی اذیت کو سمجھتے تھے۔ میں اپنی جگہ سخت پریشان تھا۔ وہ اس زمانہ میں دوسرے تیسرے روز گھر سے نکلتے اور سیدھے میرے ہاں چلے آتے۔ میری بیوی کے پاس بیٹھ جاتے اور اس کی طبیعت کو بہلانے لگتے۔ اس سے کہتے میرے لیے نمکین چائے بناؤ۔ مطلب اس کو مصروف رکھنے سے تھا۔ وہ بڑے شوق سے چائے بناتی۔ گھنٹوں ٹک کر بیٹھے رہتے۔ مجھے کہتے جاؤ دفتر میں پھیرا ڈال آؤ، میں یہاں بیٹھا ہوں۔ میری اہلیہ کے دل میں انہوں نے والد کی سی جگہ بنالی تھی اور وہ بھی اس کو بیٹی ہی کی طرح دیکھتے بھالتے تھے۔ ان کی سیرت کا یہ بانکپن میرے دل پر آج تک نقش ہے۔ کیا وضعداری تھی کہ آج وہ باتیں ہی خواب وہ خیال ہو گئی ہیں۔ جس روز ان کا انتقال ہوا اس سے ایک دن پہلے کوئی نو بجے صبح میرے ہاں تشریف لائے۔ حسب معمول میری اہلیہ کو نمکین چائے بنانے کے لیے کہا۔ اس نے تیار کر کے پیش کی۔ تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا قلچہ، نمکین چائے، شلجم اور سفید چاول تو بس کشمیریوں ہی کے ہاتھوں لذیذ پکتے ہیں۔ چار بجے شام واپس چلے گئے۔ اگلے روز سنا کہ سالک صاحب فوت ہو گئے ہیں تو یقین نہیں آتا تھا۔ بھاگم بھاگ مسلم ٹاؤن پہنچا۔ جس مکان میں ظرافت کے پھول کھلتے تھے وہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ سالک صاحب واقعی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

وہ اکا دکا احباب سے مذاق بھی کر لیتے لیکن خاص قسم کی مجلسوں میں جانے اور عام طرز کی محفلیں رچانے کے عادی نہ تھے۔ ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ مثلاً وہ بذلہ سنج ضرور تھے مگر ریستورانوں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں آنے جانے سے متنفر رہے۔ اسے اپنی عمر کی متانت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ریستورانوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھ کر گپ لڑانا واہیات کھیل تھا۔ ایک دفعہ کافی ہاؤس کے پاس سے گذر رہے تھے۔ چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) نے دیکھا تو کرسی چھوڑ کر باہر آ گئے۔ زور دیا کہ اندر چلیں۔ کافی پئیں۔ ''حلقۂ رنداں'' کو سعادت بخشیں، لیکن مطلقاً نہ مانے۔

''اس میں عیب کیا ہے؟'' حسرت نے کہا

''مجھے عیب ہی نظر آتا ہے!''

''حسرت بھی تو ہر روز بیٹھتے ہیں۔'' میں نے عرض کیا۔

''ان میں ابھی لڑکپن ہے!''

وہ نوجوانوں کی عزت کرتے لیکن ان سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ جب کبھی انہیں پتہ چلتا کہ حسرت سے نوجوانوں کی بم چخ ہوگئی ہے اور وہ اختلاج کے مریض ہیں جس سے ان کی حساس طبیعت متاثر ہوئی ہے تو وہ انہیں ٹوکتے کہ ہاتھیوں کی اس ڈار یا کبوتروں کی اس ٹکڑی میں کیا رکھا ہے؟ گھر میں رہا کرو۔ لیکن حسرت صاحب کو کافی ہاؤس کا چسکہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس ریوڑ یا گلے میں ضرور آتے اور بلاناغہ آتے۔ جان لیوا مرض میں بھی آتے رہے۔ حالانکہ چپر غٹو اور اول جلول قسم کے نوجوانوں سے اُلجھ کر دل آزردہ ہوتے تھے۔ حسرت بڑے پائے کے مطائبات نگار تھے۔ بامحاورہ زبان لکھنے میں بے مثال تھے۔ ادب و شعر کا ذوق نہایت شستہ و رفتہ پایا تھا۔ ان کے سامنے غلط اُردو لکھنا یا غلط اُردو بولنا مشکل تھا۔ وہ برخود غلط لوگوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتے۔ برگزیدہ ادیب اور کہنہ مشق صحافی ہو کر بھی انہیں شاعرانہ عیبوں سے لگاؤ تھا اس کے برعکس سالک صاحب نے عمر بھر شراب چکھی نہ کوچۂ یار میں گئے۔ رنگ رلیاں منائیں نہ گلچھرے اڑائے۔ انہیں نسوانی موسیقی سے بھی کوئی خاص دلچسپی تھی نہ اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ خود شاعر تھے۔ جب انقلاب سے سبکدوش ہو گئے اور کراچی سے واپس آ گئے تو شعر کہنے کا شوق تازہ ہو گیا۔ مشاعروں میں جانے لگے۔ آواز رسیلی پائی تھی۔ ترنم سے پڑھتے۔ لوگ ان کا احترام کرتے لیکن یہ دور ان کے مشاعروں میں جانے کا نہیں تھا۔ مشاعروں پر کھلنڈرے شاعر اور تان سینی گلے چھائے ہوئے تھے جنہیں زبان کی نزاکتوں سے واجبی سا تعلق تھا۔ انہیں نثر و نظم دونوں میں زبان و بیان کی پابندیوں کا احساس رہتا بلکہ اس بارے میں اہل زبان سے بھی زیادہ سخت تھے۔ وہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی طرح ''ہم جائز سمجھتے ہیں'' کے مرض کا شکار نہیں تھے۔ بلکہ الفاظ اور محاورات کو اصل کی طرح استعمال کرتے۔ وہ ضرورت کے مطابق ان میں ترمیم کے بھی خلاف تھے۔ ان کے نزدیک یہ بدمذاقی تھی۔ ترقی پسند تحریک کی انہوں نے بڑی سرپرستی کی۔ اور اس کی وجہ غالباً احمد ندیم قاسمی تھے۔ لیکن نہ تو کبھی ان کے اجتہاد کو قبول کیا نہ زبان کے معاملہ میں ان لوگوں کی بے راہ روی کو پسند فرمایا۔ اور نہ ان کے اُن باپردہ الفاظ و تراکیب کی حوصلہ افزائی کی جن کی آڑ میں یہ لوگ خدا و مذہب کی تضحیک کرتے تھے۔

میں نے اپنی کسی نظم میں مشیت کو تماشائی لکھا۔ فرمایا یہ نہ لکھا کرو۔ مشیت اللہ کی رضا اور اس کے ارادہ کا نام ہے۔ ترقی پسندوں کو معلوم ہے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور یہاں اسلام کو اولیت حاصل ہے وہ کھل کے خدا کو گالی نہیں دے سکتے۔ انہوں نے استخفاف کے لیے مشیت کا لفظ انتخاب کرلیا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک زوردار خطبہ پڑھا، لیکن ان کے نظریات وتصورات کو اسلامی معاشرہ کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ البتہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، طبقاتی اونچ نیچ اور سرمایہ دارانہ استحصال کے سخت خلاف تھے۔ اس سلسلہ میں ترقی پسندوں کے احساس واظہار کی تعریف کرتے مگر ان کا خیال تھا کہ ان ادیبوں اور شاعروں میں پچانوے فی صد موت سے پہلے مرجائیں گے، باقی پانچ فیصد میں سے نصف وہ ہیں جن کے ادب میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ادب وفن کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کا نام ترقی پسندی ہے۔ وہ ان کی زبان اور ان کے اسلوب سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے البتہ خیالات کے اس حصہ کی تعریف کرتے جس میں طبقات کے خلاف جدوجہد کا حوصلہ پایا جاتا اور محنت کشوں کو ان کا حق دلوانے کی امنگ ہوتی۔ وہ نعرہ بازی کے سخت خلاف تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ نفرت ادب کو ہلاک کردیتی ہے۔ وہ نئی پود کی خودرائی سے بیزار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نفرت کا جواب نفرت نہیں اور نہ موجودہ نوجوان سرزنش یا تادیب سے سمجھنے کے ہیں۔ ان کے نزدیک تجربہ بہترین اُستاد ہے۔ فرماتے جس ادب میں زندہ رہنے کی خوبو ہی نہیں اور جو محض سیاسی نعروں سے پیدا ہوا ہے اس سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کو حالات کے سپرد کردینا چاہیے۔ جونہی یہ حالات ختم ہوں گے اس قسم کا ادب بھی ختم ہوجائے گا۔

انہیں یہ احساس بھی تھا کہ ادیبوں کی نئی پود کے خیالات منہ زور ہیں لیکن زبان کمزور ہے۔ چناں چہ فن کے تسامحات پر وہ اکثر روشن؟ ثار نوجوانوں کو ٹوک دیتے۔ ایک دفعہ تاثیر نے ان سے کہا سالک صاحب کیا ''ہم نے جانا ہے یا ہم نے کرنا ہے'' لکھنا درست ہے۔ فرمایا خلاف محاورہ اہل زبان ہے۔ ''مجھ کو جانا ہے۔ مجھ کو کرنا ہے''، درست ہے۔ تاثیر نے کہا میں نے اپنی تحریروں میں اس قسم کے فقرے لکھے ہیں۔ اہل زبان اعتراض کرتے ہیں۔ کیا جواب دوں؟ سالک صاحب نے کہا، غلطی کا جواب کیا ہوگا۔ صاف کہیے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ تاثیر راضی نہ ہوئے۔ اصرار کرنے لگے۔ کوئی ایسا جواب بتایئے جو بظاہر معقول ہو۔ سالک صاحب نے کہا وہ تو محض سخن طرازی یا کج بحثی ہوگی۔ تاثیر نہ نے، ضرور کوئی جواب ہونا چاہیے؟ انہوں نے کہا، تو آپ یہ کہیے کہ ''نے'' علامت فاعلی ہے اور ''کو''

علامت مفعولی۔ اگر جانا ہے کا فاعل میں ہے تو اس کے بعد ''نے'' ہی درست ہے ''کو'' کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟ تاثیر سن کر اچھل پڑے۔ بس ٹھیک ہوگیا۔ اب ان زبان والوں سے نپٹ لوں گا۔ سالک صاحب نے کہا، لیکن محاورے کے اعتراض کا جواب قواعد سے اور قواعد کے اعتراض کا جواب محاورے سے دینا اصول لسانیات کے خلاف ہے۔ تاثیر کہاں مانتے وہ خود ترقی پسندوں کے آدم تھے لیکن ان کی جنت سے نکالے جاچکے تھے۔

فی الجملہ سالک صاحب ایک زندہ دل، بذلہ سنج، کہنہ مشق، خوش گفتار، پاک سیرت، نیک سرشت، دوست نواز، صاحب طرز اور نکتہ طراز ادیب تھے۔ تقریباً نصف صدی تک قلم کا ساتھ دیا۔ زندگی بھر ہزاروں صفحات لکھ ڈالے۔ انقلاب کے بیس بائیس سال کے فائل ہی گواہ ہیں۔ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے۔ صبح سویرے لکھتے اور گاؤ تکیہ پر ٹیک لگا کر لکھتے۔ خط اتنا خوب صورت تھا کہ موتی پروتے۔ مولانا ابوالکلام نے ایک دفعہ ان کے خط کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا سالک صاحب۔ مہر صاحب کا خط بھی آپ ہی لکھ دیا کریں۔ مہر صاحب کا خط شکستہ تھا۔ مسودات عموماً پنسل سے لکھتے۔ سفارت خانوں کے خبر ناموں کی سلپیں بنا کر عمر بھر ان کی پشت پر افکار و حوادث لکھتے رہے۔ یاران کہن کا تمام مسودہ پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ فرماتے میرے لیے صبح سویرے ناشتہ کرنا مشکل ہے۔ افکار و حوادث یا شذرات لکھنا مشکل نہیں، وہ اتنا ہی سہل ہے جیسے چائے پی لی۔ سگریٹ سلگا لیا۔

سرگذشت کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا۔

آج سرگذشت ختم ہوتی ہے۔ ۱۵ اگست کو پاکستان قائم ہوگیا۔ اس وقت کے بعد کی سرگذشت لکھنا بے حد دشوار ہے۔ میں ابھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اور بساط سیاست پر شاطرین نے جو چالیں چلیں۔ اُن کو قلمبند کرسکوں اور شائد اس سرگذشت کو فاش انداز میں لکھنا مصلحت بھی نہیں۔ اگر چند سال حیات مستعار باقی ہے تو انشاءاللہ سرگذشت کا دوسرا حصہ بھی مرتب ہوگا۔ اور لکھنے والا ہی نہ رہا تو اللہ اللہ۔۔۔ کار دنیا کسے تمام نکرد۔

آخر ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو اس سرگذشت کا ''تمت بالخیر'' ہوگیا۔ اللھم اغفرلہ۔

سید ضمیر جعفری

سنگاپور کا میجر حسرت

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب اتحادی قابض فوجیں ملایا کے ساحل پر اُتریں تو مولانا چراغ حسن حسرتؔ اس کے ہراول دستوں میں شامل تھے۔ آپ دو سال سے کچھ اُدپر سنگاپور میں مقیم رہے۔

مولانا حسرتؔ جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے شعبہ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ تھے اور ہیڈ کوارٹر سے شائع ہونے والے ہندوستانی عسکری اخبارات کی ادارت ونگرانی کا فریضہ اُن کے سپرد تھا۔

ہم دونوں (مسعود وضمیر) ان کے نائب ومعاون کی حیثیت میں اس شعبے سے متعلق تھے۔ ہمیں اپنی اس خوش بختی پر بڑا فخر ہے کہ ہمیں اپنے زمانے کے ایک صاحب طرز انشا پرداز، ایک بڑے صحافی اور ایک بہت بڑے انسان کو بہت قریب اور بڑی تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جو لوگ اجنبی سرزمینوں میں فاتح لشکروں کی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں حسرتؔ صاحب سے کتنا اور کیسا تقرب حاصل رہا ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ زندگی کسی چہرے پر کوئی نقاب باقی نہیں رہنے دیتی۔

ہمارے رفقاء میں سے کیپٹن (اب لفٹیننٹ کرنل) جاوید خٹک۔ کیپٹن (اب کمانڈر) حسن عسکری جو ادبی دنیا میں ابنِ سعید کے نام سے مشہور ہیں۔ میجر احمد علی خاں جو آج کل برطانیہ میں پاکستان کے

معتمدِ تجارت ہیں۔ کیپٹن انعام قاضی، اور کیپٹن (اب لفٹیننٹ کرنل) رشید حیات پاکستان کے حصے میں آئے ہیں۔ یہ سب دوست وہاں 'قوم' کے نام سے یاد کیے جاتے تھے اور حسرتؔ اس 'قوم' کے 'مرشد' تھے۔ پھر آ گئے 'قوم' کے بھی اندر مسعودؔ اور ضمیرؔ کو مرشد کا خصوصی قرب حاصل تھا۔ مسعودؔ دفتر میں اُن کا نمبر ۲ تھا اور ضمیرؔ دفتر سے باہر اُن کا ایڈی کانگ!

اس مطالعے سے اسی دور کے حسرتؔ کا تذکرہ مقصود ہے۔ چند جھلکیاں، چند باتیں، چند یادیں!

ہمارے لکھنے کا طریق کار یہ رہا ہے کہ واقعات کی ترتیب میں۔۔۔ قربتوں اور فاصلوں کے مطابق، کچھ حصہ مسعودؔ نے لکھا ہے اور کچھ ضمیرؔ نے۔ مولانا جہاں ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں چلے گئے ہیں، ایک نے قلم روک کر مضمون بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مولانا کو دوسرے کے سپرد کر دیا ہے۔

مولانا حسرتؔ کی بے وقت موت ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ یہ ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت، ایک ادارے کی موت ہے۔ ہم نیاز مندوں کے لیے ان کی موت ایک گہرے ذاتی زخم کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں کسی کے ساتھ دو قدم چل کر بچھڑ جانے پر قلق ہوتا ہے۔ یہ تو اُس دوست کا بچھڑنا ہے جس کے ساتھ ہم کامل دو برس تک ایک دفتر ہی نہیں، ایک گھر میں بھی رہے۔۔۔ یہ تو اس مرشد کی رخصت کا دائمی گھاؤ ہے جس کے قدموں میں بیٹھ کر ہم نے قلم پکڑنا سیکھا ہے۔۔۔ یہ تو اس انجمن کے اُجڑ جانے کا ماتم ہے کہ جس کی روشنی ہی کے سبب آج ہم اپنی زندگی کو ایک غیر معمولی متاع سمجھتے ہیں۔ یہ غم تو اب جان کے ساتھ ہی جائے گا۔ لیکن اس مضمون میں تحریر کے انداز کو ہم نے عمداً ہلکا پھلکا رکھا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ روتے بسورتے لہجہ میں مولانا کی شخصیت سے انصاف کرنا تو کجا، ان کو چھو سکنا بھی ناممکن ہے۔ ہم نے مرشد کے تذکرے کے لیے وہی اسلوب چنا ہے جو خود اُن کا اسلوبِ حیات تھا۔ ہم حسرتؔ صاحب کی پسند و ناپسند سے واقف ہیں۔ ہم اپنے مرشد کو جانتے ہیں۔

(م۔ض)

لیجئے اب ضمیرؔ سے سنیے:

مرشد مجھ سے پہلے سنگاپور پہنچ چکے تھے۔ جاوید کے ہمراہ جس وقت میں ہالینڈ پارک کے ایک وسیع، دلکشا بنگلے کے اندر پہنچا تو مرشد۔۔۔ قوم کے دل میں بیٹھے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں ''شیرازہ'' کے زمانے سے اُن کا نیاز مند تھا۔ دیکھتے ہی کھانا چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ اپنے پہلو میں بٹھا

لیا اور پھر لنچ کی اسی ایک نشست میں بیٹھے بیٹھے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔

''خوب پہنچے ہو میرے بھائی۔ آج رات ظہیر کی سال گرہ کی دعوت ہے۔ مولانا آج ہمیں ایک گا کر پڑھنے والے شاعر کی سخت ضرورت تھی۔ سبحان اللہ لاہور کا بکھرا ہوا شیرازہ، کہاں آ کر جمع ہو رہا ہے۔۔۔ لو چانولوں پر یہ ٹن کی مچھلی بچھا کر کھاؤ۔ یہاں تو یہی کچھ مردار کھانے کو ملے گا میاں! وہ تمہاری یونینسٹ قسم کی روٹی یہاں کہاں؟''

اب حاضرین سے تعارف شروع ہوا:

''وہ جناب انعام قاضی ہیں۔ تم ان کا نام غالباً پہلی مرتبہ سُن رہے ہو مگر مشہور ادیب ہیں۔۔۔ وہ دھان پان صاحبزادے مولانا عسکری ہیں۔ جاوید کی رائے میں اپنے نامور والد میرزا محمد سعید دہلوی سے بھی بڑے ادیب ہیں۔۔۔ یہ رشید حیات ہیں، بس رشید حیات، محض و خالص۔ جاوید سے بھی مل چکے ہو۔ آپ چلم اور قلم سے ہو کر علم کے کوچے میں وارد ہوئے ہیں۔۔۔ اور حضرات یہ مولانا ضمیر جعفری ہیں۔ جہلم کے رہنے والے، جہاں کے لوگ خدا کے تصور کے لیے تھانے دار کو دیکھتے ہیں۔''

پھر اُس شام ظہیر کی سالگرہ منائی گئی۔ یہ ظہیر سے اُن کی بے اندازہ محبت کی پہلی جھلک تھی جو ہم نے دیکھی۔ مرشد نے جزیرے کے تقریباً سبھی انڈین افسروں کو مدعو کر رکھا تھا۔ دو چار خوش ذوق انگریز جوڑے بھی موجود تھے۔ محفل جمی۔۔۔ تو مرشد میزبان کے بجائے کچھ اس طرح مہمان سے بنے بیٹھے رہے جیسے انہیں اپنے سگرٹ کے علاوہ کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ ہو۔۔۔ مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد۔۔۔ مگر جب پھر بوتلوں کے کاگ اُڑنے لگے تو مرشد نے چہکنا شروع کیا اور اب جو منظر بدلا ہے تو پوری انجمن گویا تنہا حسرت کی ذات سے عبارت تھی۔ میجر احمد علی خاں کے الفاظ میں حسرت کا چراغ روشن ہو گیا۔ اُن کے لبوں سے شعر و ادب، تاریخ و تصوف، طنز و ظرافت، زندگی اور اُس کی چاندنی کا ایک سُبک آبشار جاری تھا۔۔۔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

یہ محفل، جو مرشد کی اصطلاح میں ''بزمِ ہاؤ ہُو'' کہلاتی تھی۔ اگلی صبح کے کوئی تین بجے تک قائم رہی۔ یوں کہنا چاہیے کہ مرشد اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ قائم رہے ورنہ تین چوتھائی محفل وہیں کرسیوں پر پاؤں پسار کر سو گئی تھی۔ مرشد تو وہیں کھڑے کھڑے ''صبوحی'' تک لگا دینے کا حوصلہ وارادہ رکھتے تھے مگر نہ معلوم شاید ذخیرہ ختم ہو گیا تھا یا شاید جس کسی میں ابھی تک دوسرے کو تھامنے پکڑنے کی سکت باقی تھی وہ اُن کو تھام پکڑ کر خواب گاہ میں لے گیا اور یہ محفل بالآخر اس طرح ختم ہوئی کہ اس کو جیتے تو سب

نے دیکھا تھا مگر برخاست ہوتے شاید ہی کسی نے دیکھا۔ نسبتاً ہوش مند لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر کل صبح انہیں لوگوں نے دفتر لگانا ہے تو یہ دفتر لگ چکا۔ مرشد کی نسبت سب کو قطعی یقین تھا کہ وہ کل کیا معنی، اب ایک پورے ہفتے کے لیے گویا معطل ہو گئے مگر پھر دوسری صبح کو جو پہلی آواز ہالینڈ پارک کے خوبصورت گنبدوں اور روشن غلام گردشوں میں گونجتی ہوئی سنائی دی وہ مرشد کی آواز تھی۔

''جاوید، عسکری، ضمیر۔۔۔قاضی صاحب۔''

''ارے او ساون کے بادلو!''

''ابے او خبیثو!''

اور بھاگم بھاگ ہم لوگ جب تیار ہو کر ناشتے کے میز پر پہنچے تو وہ پیچے کے آخری پرزے کو کانٹے کی نوک پر بٹھا کر خود دفتر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ جہاں سہ پہر تک اب انہیں مسعود کے قبضے میں رہنا تھا۔ لہٰذا یہ رُوداد مسعود ہی سے سنیے:

مجھے دفتر میں اُن کا نمبر ۳ ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ اس سے پہلے میں کلکتہ میں اُن کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ مرشد میرے لیے کوئی نئے 'باس' نہ تھے۔ سنگاپور پہنچا تو پہلے ہی روز مجھے پورے اعتماد میں لیتے ہوئے فرمایا:

''مولانا آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اب یہ کام سنبھالیں۔ میں بڈھا آدمی ہوں۔ مجھے اب آرام کرنے دیں۔ میں چاہتا ہوں کچھ پڑھنے کا وقت مل جائے، کچھ گھوم پھر لوں۔ آپ کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کروں گا۔''

اس تمام وقفہ میں سگرٹ منہ سے نہیں نکلی۔ دھواں آنکھوں میں جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا کہ دھواں آنکھوں میں جا نہیں رہا، آنکھوں سے آ رہا ہے۔ درمیان میں جھنجلا کر آنکھیں ملنے بھی لگتے۔ لیکن آنکھوں کی جلن اور سگرٹ کے دھوئیں میں کوئی رشتہ شاید وہ کبھی دریافت نہ کر سکے تھے۔ علل و معلول کی اکثر کارفرمائیوں سے مرشد عموماً بے تعلق و بے نیاز ہی رہے۔

''ہاں تو مولانا مسعود صاحب بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے۔۔۔لوبھئی چائے اور یہ سگرٹ۔۔۔جاوید ماچس۔۔۔سنگاپور کو آپ کلکتہ سے زیادہ تقویٰ شکن پائیں گے۔''

اتنے میں مجھے کپڑا جلنے کی بو سی آئی۔ میں نے کہا۔۔۔''مولانا کہیں کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟''۔۔۔بولے۔۔۔''آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جل رہا ہوگا۔ آپ بڑے ''خطرناک آدمی ہیں''

۔۔۔پھر ذرا چلا کر بولے۔۔۔''ارے قاضی صاحب ذرا ادھر تو تشریف لائیں۔ دیکھئے کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟ یہ کہیں سے بو سی کیا آ رہی ہے؟''۔۔۔اس ''کہیں سے بو'' کا راز یہ کھلا کہ جناب کی پتلون کا پائنچا چار پانچ انچ کے قریب راکھ ہو چکا تھا۔ فرمانے لگے۔۔۔''مولانا یہ سگرٹ بھی بڑی واہیات چیز ہے، سوچتا ہوں کہ اس لعنت کو چھوڑ ہی دوں''۔۔۔اور شام تک سگرٹ اور ماچس کے خالی بکسوں سے آدھی ٹوکری بھری پڑی تھی۔

مرشد کی باتیں کرتے ہوئے تسلسل یا اسلوب کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود انہوں نے زندگی کو اسلوب کی بندشوں میں کبھی قید نہ ہونے دیا۔ فوج کے سخت گیر ضوابط بھی انہیں کبھی پابند نہ کر سکے۔ ایک مرتبہ جب افسرِ اعلیٰ نے کسی بات پر باز پُرس کی تو جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

جرمنی ختم اور اُس کے ساتھ جاپانی بھی ختم
تیری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

کلکتے کی بات ہے ایک روز دفتر چلے آ رہے ہیں۔ اس شان سے کہ منہ میں سگرٹ ہے۔ فیلڈ سروس ٹوپی بغل میں دبی ہوئی ہے اور کندھوں پر ایک طرف تین سٹار لگے ہیں اور دوسری طرف دو۔

میرے وہاں پہنچنے پر مرشد نے مطالعہ کی اک ذرا سی فرصت اور سیر و سیاحت کی اک تھوڑی سی مہلت کے عوض اپنے تمام فرائض مجھے تفویض کر دینے کا فرمان تو جاری کر دیا مگر ہمیں معلوم تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مطالعہ کے لیے مرشد کو مہلت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جس طرح اور لوگ کتاب پڑھتے ہیں اس طرح ہم نے انہیں پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کی کیفیت تو کچھ ایسی تھی کہ کتاب اُٹھائی، اسے چھوا، ٹٹولا، سونگھا، چند ایک ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھے اور بس۔ اس کے بعد وہ کسی باطنی عمل سے کتاب کا نفسِ مضمون، کتاب کی رُوح، سب کی سب، اپنے ذہن میں منتقل کر لیتے۔ دوسرے روز آپ اس کتاب کے متعلق بات کریں تو اور اس کے کرداروں کا حسب نسب، کہانی کی اُٹھان، اس کی کمزوریاں اور خوبیاں، مصنف کا اسٹائل اور فلسفہ اور پھر دس اور کتابوں سے اُس کی جزئیات کا موازنہ، یہ سب یوں بیان کر جاتے جیسے یہ کتاب اُنھوں نے مکتب میں سبقاً پڑھی ہو۔

رہی سیر و سیاحت کی فرصت، تو یہ بھی ایک طرح کی آرزو ہی تھی، جسے عملی رنگ دینے کا ارادہ مرشد نے غالباً کبھی کیا ہی نہ تھا۔ سچ مچ کی سیر و سیاحت مرشد کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ پھر سیر کے لیے انہیں طول طویل راستے ناپنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ حسن اُن کے لیے ایک داخلی کیفیت تھی۔ حسن اُن کی

آنکھوں اور اُن کے دل میں تھا۔ خارجی اسباب کا سہارا اگر انہیں درکار تھا تو نہایت سُبک سا۔ میس کی ایک کھڑکی سے جھانکو تو چھالیہ کے کشیدہ قامت پیڑوں کے جھنڈ آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ دوسری طرف بالکنی کے باہر چینی چیری کا ایک تناور درخت باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ پشت کو اُٹھتی ہوئی پہاڑی کی پیشانی پر ایک عرب رئیس کا بنگلہ تھا جس کے زمردیں لان اُوپر سے لڑھکتے، پھسلتے ہمارے میس کے حاشیے پر آ کر کہیں رکتے تھے۔ ذرا ہٹ کر ناریل کے پیڑ ایک دوسرے پر جُھکے ہوئے تھے جن کا منظر چاندنی راتوں میں بڑا فسوں خیز ہوتا تھا۔ مرشد فرمایا کرتے۔ چانسری لین کے مناظر جس شخص کے ذوق کی تسکین نہیں کر سکتے اُس گدھے کو سارے سوئٹزرلینڈ میں گھمالائیے تو بھی اُس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مطالعہ وسیاحت کی فرصت کی خاطر دفتر کا کاروبار میرے حوالے کرنا مرشد کی ایک ادا تھی۔ لیکن اس ادا میں تصنع یا تکلف ہرگز نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُس وقت اپنی باتوں پر واقعی یقین کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں انہوں نے بالی کے سفر کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی کھینچ رکھا ہو۔ مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ اُس روز مرشد کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ دوسرے دن صبح کو ناشتے کے میز پر بھی موجود نہیں تھے۔ کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ کرتے پاجامے میں لیٹے ''سٹوری آف سان مائیکل'' میں مستغرق ہیں۔ ''سٹوری آف سان مائیکل'' مرشد کی تازہ ترین دریافت تھی۔ فرمایا۔۔۔ ''مولانا اس سے بہتر کتاب میں نے تو آج تک نہیں پڑھی''۔ لیکن بعد میں ہم اس طرح کے غلو کے عادی ہو گئے۔ مُرشد کا انداز ہی یہ تھا۔ اُن کے مطالعہ کی کتابیں منتخب تو ہوتی ہی تھیں، بس جو کتاب شروع کرتے۔ اُس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے۔ ''سٹوری آف سان مائیکل'' سے پہلے ٹالسٹائی کی ''وار اینڈ پیس'' دنیا کی بہترین کتاب تھی اور اُس سے پہلے ہکسلے کی ''ایلس اِن غازہ''۔

ہم نے پوچھا۔ ''آپ دفتر میں تو نہیں تشریف لے جائیں گے''۔۔۔ بولے۔۔۔ ''مولانا مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیں۔ میں چاہتا ہوں۔۔۔ مگر ہاں دیکھئے کوئی دس بجے کے قریب جیپ بھیج دیجئے گا۔ ذرا ریفلز لائبریری کا چکر لگا آؤں گا...... ممکن ہے تھوڑی دیر کو دفتر میں بھی آ نکلوں۔''

ہمارا دفتر سیسل اسٹریٹ میں ایک عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ سیسل اسٹریٹ کو سنگاپور کی فلیٹ اسٹریٹ کہہ لیجئے۔ اُس زمانے میں سنگاپور کے تمام انگریزی اور ملائی روزنامے وہیں سے نکلتے تھے۔ جس جگہ ہم بیٹھے تھے وہ جنگ سے پہلے ایک ڈچ تجارتی کمپنی کا دفتر تھا جو ملایا سے ربڑ اور مسالے برآمد، اور ڈنمارک سے بیئر درآمد کرتی تھی۔ دفتر کیا تھا ایک وسیع ہال تھا جو کسی زمانے میں پارٹیشنوں سے

مزین ہوگا مگر جاپانیوں کے چار سالہ تسلط میں ان تکلفات کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔ جاپانی جس عمارت میں ایک مرتبہ بسیرا کر گئے اُس کے دروازے، کھڑکیاں تک غائب ہو جاتیں۔ ساگوان کی بیش بہا الماریوں کو توڑ کر چاول اُبالنے کے لیے چولہا سلگا لینا اُن کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ الغرض ہمارا دفتر بالکل ننگ دھڑنگ قسم کا دفتر تھا۔ جس کے چوبی فرش پر بھاری بھرکم فوجی بوٹ ہر وقت ایک زلزلہ بپا کیے رکھتے تھے۔ ابھی دس بج کر کچھ منٹ ہی گئے تھے کہ اس زلزلے کی لرزا اور گرج میں ایک نئی شدت پیدا ہوگئی اور ہم سمجھ گئے کہ مرشد تشریف لے آئے۔ موٹی موٹی کتابوں کا ایک ''دو بغل بھر پلندہ'' ریک میں پھینکا، ٹوپی اُتاری، سگرٹ منہ میں اُڑسی اور ماچس کھنکھناتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ہم جانتے تھے کہ مُرشد اخبار سے جدائی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکیں گے۔ مرشد کی نظروں میں ہم سب جاہل تھے۔ کوئی ذرا کم، کوئی قدرے زیادہ۔ اخبار وہ بالکل ہمارے ہاتھوں میں کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ چنانچہ آتے ہی جائزہ شروع ہو جاتا:

''مولانا لائیے تو اِدھر، یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں۔۔۔ مولانا یہ کوئی سُرخی تو نہ ہوئی۔ ہمیں تو یہی بتایا گیا تھا کہ خبر کی سُرخی میں پہلی سطر جملہ فعلیہ خبریہ ہونا چاہیے۔۔۔ آپ کو شاید ان سے تعارف نہ ہو لیکن مولانا! مبتدا اور خبر، مضاف اور مضاف الیہ میں ایک بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ بھئی محرم علی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ آپ ہر صبح کاتبوں کے قلم ضرور دیکھ لیا کریں۔ کل کی سرخیاں تو ایک دوسرے کو کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔۔۔ حمید صاحب ''نون'' کا دائرہ بنانے کی مشق اگر آپ نے لگ کر چار پانچ برس کر لی تو آپ ''نون'' بنا لیا کریں گے۔ فی الحال تو آپ کا نون فیروز خاں نون کا ''نون'' معلوم ہوتا ہے''۔

تعریف کے معاملے میں مرشد شقاوت کی حد تک سخت تھے۔ کچھ تو اس لیے کہ دوسروں کو ناپتے جانچتے وقت شاید نادانستہ دوسروں کا موازنہ اپنے ساتھ کر جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ موازنہ اُن سے ہو تو تعریف کے قابل کون نکلے؟۔۔۔ پھر انہیں یہ خیال بھی تھا کہ علم وادب سے تعلق رکھنے والے آج کل کے نوجوانوں کی برخود غلطی پہلے ہی تشویش ناک صورت اختیار کر چکی ہے انہوں نے تعریف کر دی تو مبادا دماغ بھی خراب ہو جائے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسا دور آ گیا ہے کہ لوگ قواعد کے ابتدائی اصول جانے بغیر، عربی وفارسی کی تحصیل کے بغیر، اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیے بغیر، شعر کی تہذیب اور اُس کا مزاج سمجھے بغیر، مصنف اور شاعر بن بیٹھتے ہیں۔ 'مست قلندر' میں ایک افسانہ چھپ گیا، چلو افسانہ نگار بن

گئے۔ ''پھلجھڑی'' نے ایک غزل شائع کر دی، لیجئے شاعر ہو گئے۔ پھر تحسین باہمی کے حلقے قائم کر کے جہالت کے حصاروں میں قید ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک مرتبہ مجھے بھی مزاحیہ کالم لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ پہلے روز کالم مرشد کو دکھایا۔ کالم پر نگاہ جماتے سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے گئے۔ پڑھ چکے تو سگرٹ کے کش بیچوں بیچ ایک مبہم سی۔۔۔''ہونہہ'' ۔۔۔کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ منہ لٹکائے ہوئے میں واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ دوسرے روز پوچھتے ہیں ۔۔۔''مولانا وہ اپنا کالم آپ نے کیا کیا، آج کے اخبار میں تو نہیں ہے۔'' میں نے عرض کیا۔۔۔''پھاڑ کر پھینک دیا تھا''۔۔۔فرمایا۔۔۔''دے دیتے کیا ہرج تھا۔ اور لغویات بھی تو چھپتی رہتی ہیں''۔۔۔مرشد کی زبان سے یہ بھی گویا حوصلہ افزائی کے کلمات تھے۔ اس کے بعد کبھی کبھار میں کالم لکھ کر مرشد کے پاس لے جاتا اور اُن سے۔۔۔''ہونہہ''۔۔۔وصول ہو جاتی جو کالم کی اشاعت کی اجازت بھی ہوتی۔

ایک روز تو انہوں نے تعریف کی حد ہی کر دی۔ ارشاد ہوا۔۔۔''مولانا اگر آپ محنت کریں تو ممکن ہے ایک روز آپ کو کالم لکھنا آ جائے۔ آپ کو یہ بہت بڑا ایڈونٹیج ہے کہ آپ اَن پڑھ ہیں اس لیے آپ فلاں یا فلاں کے اسلوب نقل کرنے کے بجائے خود اپنی سیدھی سادی زبان میں بات کہہ جاتے ہیں۔ یہ تحریر کی بڑی خوبی ہوتی ہے۔ نگارش کی اپنی طرز اسی سے بنتی اور نکھرتی ہے۔''۔۔۔ان دو جملوں کے علاوہ مرشد کے منہ سے کبھی اور کوئی توصیفی کلمہ سننا نصیب نہ ہوا، اگرچہ پس پشت وہ اپنے شاگردوں کی تھوڑی بہت تعریف کر دیا کرتے تھے۔

مرشد کے ساتھ کام کرنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی کو اپنے اسلوب طنز کی تازگی کے ساتھ وہ مہینوں تر و تازہ رکھتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کسی روز وہ کام سے مطمئن ہو جائیں یا کھل کر شاباش دے جائیں۔ معیار کے معاملہ میں وہ قدم قدم پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا جالب اور نصیر حسین خیال کا حوالہ دیتے۔ ضمیر کی رائے تھی کہ اگر خود مولانا آزاد، مولانا جالب اور نواب خیال بھی اُن کے سٹاف میں ہوتے تو ان کا مرتب کیا ہوا اخبار مرشد کے معیار پر شاید ہی پورا اُترتا۔ مرشد کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک عجیب سی گھٹن طاری رہتی تھی مگر اُن کے جانے کے بعد ہی محسوس ہوا کہ اس گھٹن سے ہم نے کتنا کچھ سیکھا اور اُن کی نظر اپنے پیشے میں ہمارے قد و قامت کو کتنا اونچا لے گئی تھی۔ علم و فن پر اُن کا اپنا انداز طالب علمانہ تھا۔ اپنے آپ کو انہوں نے کبھی فارغ التحصیل نہیں سمجھا۔ وہ ہمیشہ، ہر وقت، علم کے اکتساب میں مصروف رہے۔ کہا کرتے۔''اخبار نویسی کرتے پچیس برس ہو گئے ہیں لیکن یہاں فوج میں آ

کر اور پبلک ریلیشنز کے اپنے ساتھی انگریز صحافیوں کے کام کو دیکھ کر صحافت کے کئی گُر اب سمجھ میں آئے ہیں"۔۔۔فرنیک اون کے آپ بڑے مداح تھے۔ فرنیک اون اُن دنوں برطانوی فوجوں کے اخبار "سی آ ک" کا ایڈیٹر یعنی انگریزوں کا چراغ حسن حسرت تھا۔ آج کل وہ غالباً برطانیہ کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ ڈیلی میل کا ایڈیٹر ہے۔

سنگاپور میں "دوالفکیر" کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی جس کے مالک ایک مدراسی مسلمان تھے۔ مدراس میں عبدالفقیر نام عام سننے میں آتا ہے۔ پتہ نہیں "دوالفکیر"۔۔۔عبدالفقیر ہی کا مخفف تھا یا ذوالفقار کی ملاباری شکل۔ مرشد اسی تجسس میں دو ایک مرتبہ اس دکان پر گئے اور پھر یہ معمول بن گیا کہ دفتر سے واپسی پر وہاں ضرور رُک جاتے۔ سنگاپور کی مرطوب آب و ہوا میں ساری دوپہر کام کرنے کے بعد ہمیں گھر جانے کی جلدی ہوتی مگر مرشد ہیں کہ دکان میں کھڑے ایک شیلف سے دوسرے شیلف اور دوسرے سے تیسرے کی طرف کھچے چلے جا رہے ہیں۔ کتابوں کی دکان کے اندر جا کر وہ باہر نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ایک ایک کتاب سے تانک جھانک ہو رہی ہے۔ اِدھر ہم دروازے پر کھڑے یا جیپ میں بیٹھے انہیں کوس رہے ہیں۔ بعض اوقات ہم انہیں اُتار کر خود چپکے سے فرار ہو جاتے اور جیپ واپس بھیج دیتے۔ مرشد کو اس پر بڑا دُکھ ہوتا۔ اس لیے نہیں کہ ہم نے اُن کا انتظار کیوں نہ کیا، اس لیے کہ اُن کے ساتھ اکٹھے رہنے اور کام کرنے کے باوجود ہم اتنے کور ذوق اور بے حس کیوں تھے کہ کتابیں قطار در قطار اور منزل بہ منزل رکھی ہیں مگر ہم میس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مرشد کا بس چلتا تو وہ میس کے بجائے "دو الفکیر" یا کتابوں کی کسی دوسری دُکان میں بستر لا ڈالتے۔

دفتر سے مرشد کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے۔ ویسے ارادہ انہوں نے کئی مرتبہ کیا۔ بعض اوقات محض اس خیال سے کہ یونٹ کا افسر کمانڈنگ ہونے کی وجہ سے اُن میں اور دوسروں میں آخر فرق ہی کیا ہوا؟ اُن سے آخر کون سوال کر سکے گا کہ آپ دفتر کیوں نہیں آئے؟ مگر پھر دفتر کے بغیر جی بھی نہ لگتا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد ٹیلی فون آجاتا کہ جیپ بھیج دو۔ دفتر آئے اور کوئی چیز لکھنے بیٹھ گئے۔ ایک دفعہ اُردو کے شاعروں کے تذکرے کا ایک سلسلہ اخبار میں شروع کر دیا اور کسی کتاب یا حوالہ کی مدد لیے بغیر بیسیوں شعراء بھگتا دیے۔ جن شاعروں کا ہم میں سے کسی کو نام بھی یاد نہ تھا، اُن کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ہی نہیں، بلکہ ان تاریخوں میں اختلافات کی بحث، اُن کے کلام کی خصوصیات اور چیدہ چیدہ اشعار یوں قلم بند کرتے جاتے جیسے کہیں سے نقل کر رہے ہوں۔

قلم اور زبان پر مرشد کا جتنا زور چلتا تھا زندگی کے دوسرے مسائل اتنے ہی اُن کے قابو سے باہر تھے۔ کسی ارادے کی تکمیل اُن سے نہیں ہو سکی۔ ویسے جناب کے ارادے بھی نا قابلِ عمل ہوتے۔ مثلاً وہی بالی کے سفر کا ارادہ لیجئے۔ جس کی طرف سرسری سا اشارہ اُوپر آ چکا ہے۔ اُس زمانے میں بالی کا سفر اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ پک نک پر راولپنڈی سے واہ تک چلے جانا ہے۔ ائیر فورس کے ہوائی جہاز چاروں طرف بھاگے پھرتے تھے۔ اور پبلک ریلیشنز کا نام ہر سفر کے لیے کھل جا سم سم کے معنی رکھتا تھا۔ لیکن مُرشد بھلا عوام الناس کی طرح سفر کیوں کرتے؟ مرشد کے بالی کے سفر کا تصور یہ تھا کہ ضمیر اُن کے ساتھ ہو۔ کچھ پیدل، کچھ ٹانگوں پر اور کچھ ٹٹوؤں پر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچیں۔ کھانے کا وقت جہاں آ جائے پڑاؤ کر کے وہیں چولہا روشن کیا جائے۔ ایک آدمی لکڑیاں چن رہا ہو، دوسرا دیگچی مانجھ رہا ہو اور پگڈنڈی کے کنارے مُرغی بھونی جا رہی ہو۔ اس طرح کا ایک اور شاعرانہ ارادہ اُن کا یہ تھا کہ سنگاپور سے دو چار میل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ وہ پٹے پر لے لیں اور باقی زندگی وہاں مطالعہ و تصنیف میں گذار دیں۔ گھنٹوں اس سکیم کا ذکر اذکار رہتا۔ ایک دفعہ میں نے نہایت ہی غیر شاعرانہ سوال کر دیا کہ اس غیر آباد جزیرے پر بسر اوقات کی کیا صورت ہوگی۔ فرمایا۔۔۔ ''بھئی یہ جزیرے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کے نمونے پر بنائے ہیں کہ فکرِ روزگار کا وہاں گذر تک نہیں ہے۔ اس مٹی میں آپ دھان کی مُٹھی اُٹھا کر پھینک دیں اور دوسرے مہینے فصل لپیٹ لیں۔ کھانے کے لیے مرغیاں پال لیے۔ پھر ناریل ہیں کہ آپ کے لیے اکل و شرب کے قاب سر پر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ صبح صبح ایک کشتی میں بیٹھ گئے اور کچھ تازہ بہ تازہ نَو بہ نَو مچھلی پکڑ لائے۔ مولانا انسان کو اور کیا چاہیے؟'' ۔۔۔ مرشد دراصل اپنی ذات میں ایک وضع اور ایک تہذیب کے سیمبل تھے۔ لوگ کہتے ہیں مولانا چراغ حسن حسرت کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، اُن کا جسد فانی ختم ہو گیا مگر اُن کا نام کبھی ختم نہ ہوگا۔ ممکن ہے یہ سب درست ہو لیکن ہمیں اس میں تسلی کا کوئی سامان نہیں ملتا۔ حسرت کا نام زندہ رہ سکتا ہے مگر ہم جانتے ہیں ہمارا مرشد اب یہاں نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی ادب و فن اور تہذیب و وضع داری کا ایک پورا دور تاریخ کے ایک موڑ کے اُدھر او جھل ہو گیا ہے۔ مکتب ہی نہ رہے تو اب کون ہوگا جو گھنٹوں اس تحقیق میں لگا رہے کہ جُوں جُوں کے بعد تُوں تُوں کہا جاتا ہے تو کیوں کہا جاتا ہے۔ آج کسی لکھنے والے کی تحریر میں محاورے یا گریمر کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ جناب میں تو اس کو اسی طرح درست سمجھتا ہوں۔ مرشد ذرا سے اشتباہ پر سند کے لیے پریشان ہو جاتے تھے۔۔۔ ''سالک صاحب فلاں محاورے کے متعلق کچھ اُلجھن سی لاحق ہو رہی ہے۔ کچھ یاد پڑتا

ہے کہ منشی دیا شنکر نسیم نے اس محاورے کو اس طرح باندھا ہے مگر اب وہ مقام ذہن سے اُتر گیا ہے۔ آپ کے ذہن میں تو کوئی سند ہوگی؟"۔۔۔لیکن میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا، آیئے پھر سنگاپور کی طرف!

دفتر میں مولانا کے چہرے پر مسلسل خشونت سی طاری رہتی تھی جس کی وجہ سے دفتر کے اوقات میں اُن سے کھل کر بات کرنے کی جرأت کوئی نہ کرتا۔ اس وقت وہ حسرت صاحب بلکہ بعض اوقات "سر" تک ہو جاتے تھے۔ لیکن دفتر سے اٹھتے ہی سب حجابات اُٹھ جاتے اور وہ حسرت صاحب سے اُتر کر 'مرشد' ہو جاتے۔ جیپ کی اگلی نشست میں جناب پھیل جاتے اور پچھلی نشست میں جاوید، انعام قاضی، ضمیر اور میں۔ اب فقرے پر فقرہ چست ہو رہا ہے، بات میں سے بات نکل رہی ہے۔ راستے میں اس بے تکلفی سے بولتے کہ سنگاپور کے ٹریفک کے تمام شور غل کے باوجود پٹڑی پر چلتے ہوئے رہگیر اُن کی بات سن سکتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی واقف کار نے کوئی ایسا انکشاف کر دیا جس پر غصہ، ندامت، تعجب یا کوئی اور مناسب ردِ عمل جو ہوتا وہ تو ہوتا ہی تھا، سب سے زیادہ کوفت اس بات پر ہوتی تھی کہ 'قوم' کا یہ قصہ باہر کیسے پہنچ گیا۔ بعد میں پتہ چلتا۔۔۔"ارے بھئی کل جب تمھاری جیپ گذر رہی تھی۔ میں براس بہ روڈ پر" کون واہ" میں کھڑا تصویریں دیکھ رہا تھا کہ حسرت صاحب کی آواز نے چونکا دیا اور پھر جو کچھ وہ فرما رہے تھے اس نے اور بھی۔۔۔" الغرض دفتر سے باہر قدم رکھتے ہی مُرشد کچھ اور ہو جاتے مگر داستان کا یہ حصہ ضمیر سے سنیے کہ وہ اس معاملہ میں "ماہر مرشدیات" ہے۔

دفتر میں میرا اُن کا واسطہ کچھ ویسے کم تھا کچھ میں اس واسطے کو اور بھی کم رکھتا تھا۔ اس 'واسطے' سے بس یہ سمجھئے کہ کچھ خوف ہی آتا تھا، مرشد جب آواز دیتے، دل دہل جاتا۔ الٰہی خیر! نہ معلوم کم بخت کونسا محاورہ اُلٹا جا پڑا ہے؟ کس روز مرّے کو تکلیف پہنچ گئی ہے؟ کہیں کوئی شتر گربہ تو نہیں پکڑا گیا؟ کسی جملے کی نشست تو برخاست نہیں ہوگئی؟ کوئی بندھنے والا خیال کھل تو نہیں گیا؟ خدا معلوم تذکیر و تانیث کا کونسا شاخسانہ اُٹھنے والا ہے؟ ہمیں مرشد کے سامنے اپنی جہالت کے اعتراف و اقرار میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ تاہم نوجوانوں کی پوری معنوی نسل کو اپنے سامنے تختہ دار پر کھچتے ہوئے دیکھنے سے ہم کتراتے ضرور تھے۔ ہمیں مرشد کی ڈانٹ سے زیادہ اُن کی مایوسی و آزردگی کا ڈر تھا۔ وہ گاندھی جی کی طرح دوسروں کو سزا دیتے ہوئے اپنے آپ کو سزا دینے لگتے تھے!

میں مرشد کی شاموں اور راتوں کا اردلی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دنوں کی بہ نسبت اپنی شبوں میں کہیں زیادہ زندہ و تابندہ نظر آتے تھے۔ دن کو تو وہ اکثر ایک نہایت واہیات سے خول میں، جس کو انہوں نے

اپنی شخصیت کے اوپر منڈھ رکھا تھا، سکڑ کر بیٹھے رہتے تھے۔ بعض اوقات اُن کا رویہ نہایت رُوکھی پھیکی سر دمہری سے جاملتا۔ ہم نے بار ہا یہ تماشا دیکھا کہ کوئی ملاقاتی پاس بیٹھا ہے مگر مرشد سگرٹ کا ٹن اُس کے سامنے رکھ کر خود خول میں چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ غریب پشیمان ہو کر اُٹھنے لگا تو مرشد جیسے چونک کر بولے۔۔۔''ہوں۔۔۔تشریف رکھئے مولانا، آپ سے تو ابھی بہت سی باتیں کرنا ہیں''۔۔۔وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو مرشد پھر غائب۔ دراصل اُن کے اپنے اندر اتنا کچھ تھا کہ باہر دیکھنے کی انہیں فرصت تھی نہ خواہش۔ البتہ شام کو جب آفتاب غروب ہوتا تو یہ آفتاب طلوع ہو جاتا۔ اُن کی عادت تھی کہ دفتر سے آنے کے بعد کوئی کتاب سینے پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے۔ سرِ شام بیدار ہوتے، غسل کرتے، لباس بدلتے۔ چھٹی کا دن ہوتا تو سرے سے اٹھتے ہی اُس وقت۔ شیو بھی شام ہی کو بناتے۔ اُن کے لیے جاگ کر سونا جتنا مشکل تھا، سو کر جاگنا اُس سے زیادہ مشکل تھا اور جاگ کر پھر کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہونا تو گویا قطرے کا گہر ہونا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہننے کا شوق ضرور تھا مگر اس شوق کو اتنی اہمیت بھی نہیں دے رکھی تھی کہ لباس خود پہننا بھی پڑے۔ سگرٹ، کتاب اور شراب کے علاوہ وہ کسی شے کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے۔ فوجی وردی کی نوک پلک کے بارے میں سخت لاپروا تھے۔ مگر چونکہ بڑا جرنیلی قد کاٹھ پایا تھا اس لیے جو چیز جس طرح پہن لیتے، سج جاتی۔ وہ تیار ہوتے نہیں تھے، تیار کرائے جاتے تھے۔ اُن کا بیٹ مین عنایت اللہ جس کو وہ علامہ کہتے تھے، بیگم حسرت پر تحسین و آفرین بھیجتے ہوئے اکثر کہا کرتا تھا۔۔۔''میں تو صاحب کو بچوں کی طرح پال رہا ہوں''۔

مرشد تیار ہو کر بیٹھتے تو پوری 'قوم' اُن کے کمرے میں جمع ہو جاتی۔ میس سے ملحق بڑی اعلیٰ نشست گاہ موجود تھی لیکن وہاں جا کر بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اگر مرشد کا بس ہوتا تو وہ کھانا بھی اُسی میز پر کھاتے جس پر سمرسٹ ماہم، جیمز جوئیس، عذرا پاؤنڈ اور بالزاک وغیرہ کے دوش بہ دوش حجامت کا سامان، عینک اور گھڑی، سگرٹ اور ماچس، قلم اور کاغذ، معدے کے انگریزی چورن، موزے اور چھوٹی موٹی درجنوں دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ ''محفلِ نورانیاں'' اسی میز کے گرد جمتی۔ مرشد اس وقت اپنے آپ کو خول سے نکال کر گویا میز پر رکھ دیتے۔ اُس وقت اُن کے چہرے کی شگفتگی اور گھنی گنجان مونچھوں میں سے پھوٹ کر کان کی لوؤں تک پھیلتی ہوئی ایک دل آویز مُسکراہٹ دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ شام ہوئی اور مرشد نے اپنا مخصوص نعرۂ مستانہ بلند کیا:

''ذرا خان صاحب کو آواز دینا۔''

یہ خان صاحب پوری یونٹ کے کوارٹر ماسٹر تھے جو عملاً مرشد ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بیچارے صبح سے اس آواز کے منتظر ہوتے اور آواز سنتے ہی میز کو کارگہِ شیشہ گراں بنا کر رکھ دیتے۔ مرشد کی ''محفل شبینہ'' کی پہلی مجلس ڈنر تک جاری رہتی اور ڈنر وہ گیارہ بجے سے پہلے شاذ ہی کھاتے۔

یہ 'محفلِ شبینہ۔۔۔''ذرا خان صاحب کو آواز دینا''۔۔۔ سے شروع ہو کر عموماً اُس مقام پر ختم ہوتی جہاں یا تو حلق سے کوئی آواز نکل ہی نہ سکتی یا لوگ اپنے آپ کو آوازیں دینے لگتے۔ مرشد کو اپنے دور کے کسی شاعر کا کوئی شعر شاید ہی یاد ہو مگر اساتذہ قدیم کے بلا مبالغہ ہزاروں اشعار سینے میں محفوظ تھے۔ بالعموم وہ داغؔ سے شروع ہوتے پھر جوں جوں کیف بڑھتا جاتا توں توں غالبؔ و بیدل سے ہوتے ہوئے، عرفی و نظیریؔ، سعدیؔ و حافظؔ کی طرف اُوپر ہی اُوپر چڑھتے جاتے۔ دوسروں کے شعر پڑھنے میں انہیں جتنی راحت ہوتی اپنے شعر سنانے میں اتنی ہی وحشت ہوتی۔ ہم اِصرار کرتے تو لاحول پڑھ کر ٹال دیتے۔ لیکن محفلِ شبینہ کے آخری رسیلے لمحات میں ہتھیار ڈال دیتے اور پھر ایک نہایت پُر سوز، کھوئے کھوئے، ڈوبتے اُبھرتے ترنم کے ساتھ، جس میں ماورائے سخن بھی ایک بات ہوتی تھی، ڈھائی تین تین شعروں کی دو چار غزلیں سنا دیتے۔ اُن کی مشہور غزل۔۔۔ آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں۔۔۔ ہمارا ''قومی ترانہ'' تھی جس کے بعد مُرشد حسنِ یار کی باتوں سے آگے نکل کر خود ''آستانِ یار'' کی طرف چل پڑتے۔

''ہاؤ و ہو'' کی یہ محفلیں، مرشد کے کلاسیکی مذاقِ ادب، اُن کی وسیع معلومات، دلنشیں ظرافت، شستہ و برجستہ بذلہ سنجی، اور برمحل اعلیٰ اشعار کے ترشح کے باعث ایک سدا بہار دبستانِ علم و دانش کا درجہ رکھتی تھیں۔ باتوں باتوں میں ہم وہ کچھ سیکھ جاتے جو برسوں کے باقاعدہ اکتساب سے بھی شاید ہی سیکھ سکتے۔ بحث کے معاملہ میں اُن کا معاملہ یہ تھا کہ۔۔۔ اِک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔۔۔ چنانچہ اُنھیں چھیڑنے کے لیے ہم کوئی غلط نظریہ کوئی متنازعہ فیہ محاورہ، کوئی بھونڈا اسلوبِ بیان، شیر شاہ سوری کا غلط سالِ جلوس، شبلی کے ماخذات، سیماب اکبر آبادی کا کوئی شعر، ۔۔۔ غرض یہ کہ کوئی سی بات مصرع طرح بنا کر چھوڑ دیتے اور مرشد مشرق و مغرب کی وسعتیں سمیٹ کر دیکھتے دیکھتے معلومات کا ایک قطب مینار کھڑا کر دیتے۔ کسی لفظ کی صحت کے درپے ہو گئے تو اُردو، فارسی اساتذہ کے یک مُشت پندرہ بیس اشعار گویا ایک دوسرے سے بندھے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ قدیم اساتذہ میں سے وہ خدا معلوم کہاں کہاں سے ایسے ایسے گمنام لیکن جید شعراٗ کو ڈھونڈھ نکالتے جن کو جاننا ادب کو جاننے کے لیے لازمی ہے مگر جانتا کوئی نہیں۔ اُردو شاعری میں وہ حسرتؔ موہانی اور اقبالؔ کے بعد کسی شاعر سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ جن شعراٗ کا

کلام نظر سے گذرتا تھا یا جن کو ذاتی طور پر جانتے تھے، مرشد نے اُن کو صرف دو درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سوجھ بوجھ کا شاعر اور بکواس۔۔۔ کسی لفظ کے حسب نسب کا مسئلہ درپیش ہے تو چراغ لے کر مصر و یونان کے اندھیروں میں اُتر جاتے اور عرب و عجم، افغانستان و کشمیر سے ہوتے ہوئے جب مراجعت فرماتے تو ترکی الاصل، عربی النسل، ایرانی نژاد اور خانہ زاد الفاظ کے الگ الگ جلوس ان کے ہمرکاب ہوتے۔۔۔ تاریخ پر عبور کا یہ عالم کہ غیاث الدین بلبن کے رکاب داروں کے نام معہ سنِ ولادت و وفات سُن لیجیے۔ سکندرِ اعظم مقدونیا سے چل کر جن جن راستوں سے ہوتا ہوا بیاس تک پہنچا تھا، مرشد ان راستوں کے ایک ایک پتھر سے واقف تھے۔۔۔ اسلام کے تہذیبی، معاشرتی اثرات پر اُن کی نظر اتنی گہری تھی کہ صدیوں کی دھوپ چھاؤں کے ایک ایک سائے کو علیحدہ علیحدہ کر کے دکھا دیتے۔ دوسری طرف پراچین، ہندو دیومالا میں بھی بڑی دور تک پہنچے ہوئے تھے۔ افسانوی دیوی دیوتاؤں کے باہمی رشتوں ناطوں، جھگڑوں آویزشوں سے پورے پورے باخبر، علم طب سے اتنا گہرا شغف کہ اگر وہ ادب کے بجائے طب میں جا پڑتے تو شاید زیادہ آسودہ رہتے۔ مزے کی بات یہ کہ فلسفہ ہو یا فلکیات بات اس قدر سلجھا کر بیان کرتے کہ مولانا صلاح الدین احمد کے الفاظ میں ''موضوع کو پانی کر کے چھوڑتے۔'' تاریخ اُن کا خاص مضمون تھا۔ مرشد جو کچھ بولتے تاریخ معلوم ہوتا، جو کچھ لکھتے تاریخ بن جاتا۔

مرشد موج میں ہوتے تو نکتہ طرازی و انجمن سازی کے لیے کوئی غلط بات کہنے کی بھی چنداں ضرورت نہ ہوتی۔ اس کیفیت میں وہ صحیح بات کے بھی پرزے اُڑا دیتے۔ بالخصوص جہاں ذاتی پسند یا رائے کی گنجائش ہوتی۔ مثلاً اگر آپ گاندھی جی کی عظمت بیان کر رہے ہیں تو مرشد بندوق کی نالی گاندھی جی کی طرف سیدھی کر دیتے۔ اگر آپ گاندھی جی کی مذمت کر رہے ہیں تو مرشد اپنے ترکش کے سارے تیر لے کر گاندھی جی کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ اصلیت، جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں، یہ تھی کہ ایک عظیم جینئس ہونے کی وجہ سے اُن کی اپنی اَنا کا جذبہ بڑا قوی تھا۔ وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہونے کو تیار نہ تھے۔ چھوٹوں کے سامنے وہ جس عاجزی سے بچھ جاتے تھے بڑوں کے سامنے اتنے ہی سرکش نظر آتے۔ لیکن پھر چند شخصیتیں ایسی بھی تھیں جن کے سامنے اُن کی گردن ہر وقت جھکی ہوئی ملی۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہ سُن سکتے۔

دوستوں کی محبت اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ، سب سے بڑی تسکین تھی مگر دوستی کرنے میں وہ تقدم یا تیزی کے قائل نہ تھے۔ مدت تک یہی نہ کھل سکتا کہ وہ دوست بننے پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں لیکن

اندر ہی اندر نہایت نامعلوم طور پر وہ دوسرے کے دل میں سما جاتے اور پھر دوستی میں اُن کی بے بسی یہاں تک پہنچ جاتی کہ دوست اگر دشمن بھی ہو جاتا تو وہ اُسے چھوڑ نہ سکتے۔ عالی ظرفی کا یہ حال تھا کہ وہ سالک صاحب کی سب سے زیادہ عزت ہی اس لیے کرتے تھے کہ سالک صاحب فن میں اُن کے سب سے بڑے حریف تھے۔ احمد شاہ بخاری، مجید ملک، مولانا صلاح الدین، صوفی تبسم، تاثیر، عابد، فیض، تاج کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت اور شیفتگی کے ساتھ کرتے اور ہندوستان بھر میں بہت کم لوگوں کو ان کے پلے کا آدمی سمجھتے۔ نیاز مندوں کی ادبی خامیوں پر اندر خانے خواہ اُن غریبوں کو کھا جاتے مگر بیرونی معرکوں میں مرشد کا طاقتور قلم اُن کی ڈھال بن جاتا۔ اپنے ساتھ بیدل، نظیری، ظہوری، فغالی وغیرہ کو بھی دوست کی کمک پر لے آتے۔ دوستوں سے وہ کمزوری کی حد تک محبت کرتے تھے۔ افراد واقدار کے بارے میں اُن کے جمے ہوئے نظریات وتعصبات اتنے بھاری پتھر تھے کہ کوئی دوسرا تو کیا، اِن چٹانوں کو وہ خود بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکتے تھے۔ سنگاپور میں وہ اپنے لاہور کے بعض ایسے جگری دوستوں کا تذکرہ اکثر بڑے فخر کے ساتھ کیا کرتے تھے جن میں سے ایک دودھ دہی کی دُکان کرتا تھا۔ ایک لوہے کے نلکے نلکیاں بیچتا تھا اور ایک حسرت صاحب سے دوستی کے علاوہ سرے سے کوئی کام ہی نہ کرتا تھا۔ وہ جب اُن کی بے غرض محبت، بے ریا خلوص، بے لوث وابستگی میں اپنے حسنِ بیان کا جادو جگاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ جیسے ناولوں کے ہیرو تھے جو کتابوں سے نکل کر لاہور کے گلی کوچوں میں چلے آئے تھے۔ بعض اوقات مرشد عشرت وآسودگی کے اس ماحول میں، جو وہاں انہیں میسر تھا، ان دوستوں کی یاد میں تڑپ اٹھتے، مغموم ہو جاتے اور ملازمت ترک کر دینے کے منصوبے سوچنے لگتے۔ اُن کے ایک عزیز دوست ریاض شمیم (اب لفٹیننٹ کرنل) جب اتفاقاً تبدیل ہو کر سنگاپور آ گئے تو مرشد اس قدر خوش ہوئے کہ اس طرح بے تحاشا خوش ہوتے ہم نے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہفتوں بھر ملنے والے سے ریاض شمیم ہی کا تذکرہ چلتا رہا۔

''مولانا، سُنا آپ نے۔ ریاض شمیم بھی یہیں آ گئے۔''

''میں دہلی میں تھا تو وہ دانا سے بدل کر دہلی آ گیا، پھر کلکتے اور اب میرے پیچھے پیچھے یہاں بھی۔''

''آپ ریاض شمیم سے ملے ہیں؟۔۔۔ ضرور ملئے گا۔۔۔ حسین بھی ہے، ذہین بھی ہے۔''

اُن کا سینہ یقیناً آرزوؤں اور ارادوں کا تلاطم زار ہو گا مگر وہ اپنی آرزوؤں، محرومیوں کی کتھا سے دوسروں کو کبھی مکدر نہ کرتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر روپ کو ایک انعام، ایک فیضان سمجھتے تھے۔ بہر حال جن دو ایک آرزوؤں کی بہ آوازِ بلند پرورش کیا کرتے رہتے تھے اُن میں سے ایک سلسلہ وار آرزو یہ تھی کہ دریا

کے کنارے ایک معقول سا گھر ہو، ڈھنگ کی لائبریری ہو، جس میں بیٹھ کر وہ سمرنا سے بغداد، بغداد سے سمرنا تک کی تاریخ لکھتے رہیں۔ اور چند یار جانی ہوں جن کے ساتھ شام کو ہاؤ و ہو' رہے۔ غالباً یہ تنہا آرزو ہے جس کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے عملی اقدام بھی کیا تھا۔ پونچھ میں دریا کے کنارے ایک مکان بنوالیا تھا، کتابوں کا خاصہ ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ مگر افسوس کہ حالات اور زندگی نے انہیں وہ کام نہ کرنے دیا جو صرف وہی کر سکتے تھے۔

لاہور شہر اور اُس کی زندگی سے مرشد کو عشق تھا۔۔۔ سنگاپور کہ جنوب مشرقی ایشیا کا پیرس سمجھا جاتا ہے، بڑا ہی جمیل و تاب ناک شہر ہے۔ جنگ کے بعد فتح کی مسرتوں نے اُن دنوں اُس کو کچھ اور زیادہ پیرس بنا رکھا تھا۔ شراب وافر تھی، وقت اپنا تھا۔ غالب نے جو بات آم کے بارے میں کہی ہے وہی بات اس خطے کے زہرہ شمائلوں پر صادق آتی تھی کہ عام بھی تھے اور شیریں بھی۔ آباد میخانے، شاداب رقص گاہیں، خوابگوں ساحل، گاتے ہوئے کیبرے، جگمگاتے ہوئے کلب، معمور ریستوران، ہیپی ورلڈ گریٹ ورلڈ کے طرب خانے، آزادی، فرصت، فراغت، مرشد کو اور کیا چاہیے تھا؟ انہیں اس شہر سے یک گونہ لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ سنگاپور نے انہیں زندگی کے دو ایسے بہترین اور عہد آفرین سال دیے تھے کہ ہر برس کے تھے دن پچاس ہزار۔ مگر اس کے باوجود سوادِ رومۃ الکبریٰ میں انہیں اپنی دلی یعنی لاہور کی یاد ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ میں ہر وقت سائے کی طرح اُن کے ساتھ لگا رہا ہوں۔ مجھے ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں جب وہ لاہور کی یاد سے غافل ہوئے ہوں۔

''مولانا یہ شہر بکواس ہے۔''

''مولانا اس شہر کی اپنی کوئی شخصیت نہیں۔''

''مولانا سنگاپور کو آپ اُٹھا کر فرانس میں بھی رکھ سکتے ہیں۔''

اور لاہور کے فضائل میں:

''مولانا لاہور بجلی کا بٹن دبانے سے نہیں بن گیا۔''

''مولانا لاہور ایک تہذیب، ایک وضع کا نام ہے۔''

''مولانا، لاہور، لاہور ہے۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دعوت میں مرشد ایک میجر سیٹھی سے اتنی سی بات پر سچ مچ لڑ پڑے تھے کہ سیٹھی کے والد لاہور کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ جا بسے تھے۔

مرشد کی رندمشربی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ نہ اتنی معمولی چیز ہے کہ میرے چھپائے چھپ سکے۔ وہ خرابی کے پورے معنوں میں رندِ خرابات تھے۔ انہیں سگرٹ، کتاب، شراب سے الگ کرکے دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ انہیں اس طرح دیکھنا غلط بھی ہوگا۔ پینے کے معاملے میں وہ شاعری کے روایتی بلانوش کی طرح دریا سمیٹ کر پی جاتے تھے۔ جتنی پیتے جاتے حواس اتنے ہی روشن ہوتے جاتے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ اُن کے بہکنے کا آسانی سے پتہ بھی تو نہیں چل سکتا تھا۔ آنکھیں عموماً ویسے ہی سرخ و مست رہتی تھیں۔ پائے وہ یوں کب جاتے تھے کہ کھوئے جانے کا سراغ مل سکے۔ اگر کوئی ٹوکتا کہ مولانا آپ شاید بہک گئے ہیں تو جواب ملتا۔۔۔ مولانا آپ بہک گئے ہیں۔ میرا تو سردامن بھی ابھی تر نہیں ہوا۔ پھر ہوش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے تین چار ساغر پے بہ پے کا خالی کر جاتے۔ اُن کا بہکنا اگر کچھ تھا بھی تو ایک نہایت معصوم سا، بڑا علمی قسم کا بہکنا تھا۔ طنز نوکیلا ہو جاتا، لطیفے بھرپور ہو جاتے، اشعار کی روانی طغیانی پر آجاتی۔ معصیت و بخشش کے مضامین زور باندھ دیتے۔ جن اشعار کو وہ پہلے پینے کا عنوان بناتے تھے انہیں اشعار کو بعد میں رونے کا سامان بنالیتے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لیے یہ علامت مقرر کر چھوڑی تھی کہ مرشد جس وقت لاہور یا سالک صاحب کے موضوع پر بلاوجہ ہی دوسروں سے اُلجھنے لگیں تو یہ سمجھئے کہ وہ بہک گئے۔ اس مرحلہ پر وہ خان صاحب کو ہزار آوازیں دیتے خان صاحب قریب نہ پھٹکتے۔

مرشد ہر شام کو جس فراوانی سے پیتے، جس باقاعدگی سے رات کو ''شگفتنِ گلہائے ناز'' کی سیر کو نکلتے اور پھر جس یکسوئی کے ساتھ اِن نظاروں میں اُلجھ کر رہ جاتے تھے، اس کے بعد ان سے یہ توقع رکھنا کہ انہیں اپنے گھربار، بیوی بچے کا بھی کچھ خیال ہوگا، ایک زیادتی کی بات تھی۔ بظاہر اُن کی وارفتگی سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں

لیکن یہ سب قیاس ہی قیاس تھا۔ مرشد کی شخصیت کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہی ہے کہ وہ اندر ہی اندر ایک نہایت جمے ہوئے گھریلو قسم کے انسان تھے۔ بڑے شفیق باپ، نہایت رقیق القلب شوہر، اپنی ساری ماورائیت کے باوصف اُن کا دل ہر وقت لاہور یا پونچھ میں اپنے بیوی بچے کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا۔۔۔ گھر سے خط آنے میں دو روز کی تاخیر ہو جاتی تو پریشان ہو جاتے۔ جوابی تاروں کا سلسلہ باندھ دیتے۔

بازار کی خرید و فروخت سے انہیں سخت وحشت ہوتی تھی۔ اُن کی ضرورت کی اکثر چیزیں ہمیں لوگ

خریدا کرتے۔ مگر جب کبھی خود بازار میں نکلتے تو ظہیر و زینب کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ خرید لیتے۔ ظہیر کو اتنے لمبے لمبے اور پیارے پیارے خط لکھتے کہ اگر اتنا وقت مستقل تصنیف کی طرف دیا ہوتا تو وہ ''بغداد سے سمرنا'' تک والی تاریخ لکھ ڈالتے۔۔۔ ایک مرتبہ آپ وہاں ذرا ایک۔۔۔ باقاعدہ عشق میں مبتلا ہو کر عقدِ ثانی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مہینوں تک وردو ہوتی رہی۔ سینکڑوں ڈالر کے تحائف لڑکی والوں کی نذر کر دیے۔ مگر جب عقد کی ساعت قریب آئی تو ظہیر یاد آ گیا۔۔۔ زینب یاد آ گئی۔۔۔ پونچھ یاد آ گیا ۔۔۔ اور آخرش اپنے ہونے والے معزز خسر کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ مولانا مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھ پر لعنت بھیجو۔۔۔ مجھے بھول جاؤ!

مرشد کی گشتِ شبینہ کا انداز بھی کچھ اپنا ہی تھا۔ مغربی موسیقی سے انہیں ہول آتا تھا۔ فلم دیکھنے کو وہ تضیعِ اوقات سمجھتے۔ البتہ چینی، ملائی، انڈونیشی اوپروں کو شوق سے دیکھتے۔ لیکن کسی ایک مقام پر دیر تک بیٹھے رہنا اُن کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ کسی ابتدائی گیت پر یا منظر پر خوش بھی ہو لیتے، سر بھی ہلا دیا، ساتھ ساتھ کلچر کی بحث بھی اٹھاتے رہے مگر پھر دس پندرہ منٹ کے بعد اکتا بھی گئے۔

''مولانا یہ تو بکواس ہے۔۔۔ آیئے کہیں اور چلتے ہیں۔''

اس کے بعد کہیں اور۔۔۔ پھر کہیں اور۔۔۔ اور جب تک شہر کا آخری اوپرا بند نہ ہو جاتا۔ ''کہیں اور'' کا سلسلہ بند نہ ہوتا۔ ریستورانوں میں بیٹھنے کا بھی یہی ہنجار تھا۔ ایک سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں۔ کہیں دو منٹ کو بیٹھ جاتے، کہیں بس جھانک کر لوٹ آتے۔ کہیں لوگ بہت زیادہ ہوتے کہیں بہت کم ہوتے۔ ہر رات قریباً سارا شہر گھوم کر لوٹتے۔ وہ تھوڑی سی مہلت میں بہت کچھ دیکھ لینا چاہتے تھے، کیسی بھی جگہ ہو، ایک مقام سے بہت جلد اُن کی طبیعت بھر جاتی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے بھی شاید اسی لیے وہ بہت جلد اکتا گئے۔

سیر و سفر میں کبھی کبھار وہ بے مقصد و بے اختیار سے ہو کر۔۔۔ جیسے ندی میں کوئی سنگِ رواں آوارہ۔۔۔ گھومنے کے بھی بڑے حامی و مبلغ تھے۔

''مولانا ان نپی تلی شاہراہوں میں دھرا ہی کیا ہے۔''

''مولانا زندگی بڑی بیکراں چیز ہے۔''

''مولانا زندگی کو آگے پیچھے، شمال جنوب ہر طرف سے دیکھنا چاہیے۔''

''مولانا آیئے آج ہم اپنے آپ کو شہر پر چھوڑ دیں۔''

اور اپنے آپ کو شہر پر چھوڑنے کے معنی یہ ہوتے کہ وہ حسرت صاحب جو صبح کی سیر میں بھی پیدل نہ چلتے تھے، گھنٹوں شہر کے دالان در دالان قسم کے عقبی کوچوں میں مارے مارے پھرتے۔ ایک مرتبہ اپنے آپ کو جزیرے پر ''چھوڑتے چھوڑتے'' ہم ایک ایسے ساحلی کمپونگ یعنی گاؤں میں جا نکلے جہاں تک پہنچنے سے پہلے ایک وسیع وطویل دلدل کے اوپر تنگ تختوں کے ایک جھولتے لرزتے ''پُل صراط'' پر سے گذرنا پڑتا تھا۔ جن لوگوں نے مرشد کو دیکھا ہے وہ اُن کی مصیبت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مگر زندگی کو آگے پیچھے سے دیکھنے کے ولولے میں وہ اس ''پُل صراط'' پر سے بھی گذر گئے!

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ انہیں دنوں مرشد کے دوست مشہور ادیب پروفیسر احمد علی ہندوستان سے چین جارہے تھے۔ اُن کا جہاز شب کے چند گھنٹوں کے لیے سنگاپور میں رُک رہا تھا۔ مرشد ایک مدت سے اُن کی راہ تک رہے تھے اور اُن کے چند گھنٹوں کے قیام کو پُر لطف بنانے کے لیے کوئی پورے تین شب و روز کی مصروفیت طے کر چھوڑی تھی۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ جس شام احمد علی وہاں پہنچے ہیں، مرشد کو سوکر جاگنے، جاگ کر اُٹھنے، اٹھ کر تیار ہونے اور پھر دو تین ساغر برائے ملاقات پینے میں اتنی دیر ہوگئی کہ جب ہم لوگ جہاز پر پہنچے تو پروفیسر صاحب شہر کی گشت پر نکل چکے تھے۔ اب انہیں ڈھونڈھنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ جاوید نے کہا کہ اتنے بڑے اجنبی، پُر اسرار شہر میں اندھا دُھند تلاش سے کون مل سکتا ہے۔ لیکن مُرشد بہت پُر امید تھے۔ فرمایا۔۔۔ ''کیوں نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے احمد علی کو کہاں ہونا چاہیے۔ میرے بھائی میں احمد علی کو جانتا ہوں۔''۔۔۔ تلاش شروع ہوئی تو احمد علی کو جہاں جہاں ہونا چاہیے تھا، ایک ایک مقام چھان مارا مگر وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب مرشد یہ کہہ کر کہ ذرا تازہ دم ہو کر ابھی پھر نکلتے ہیں، ایک چینی ریسٹورنٹ میں گھس گئے اور وہاں جام و مینا سے نہ معلوم کیا سرگوشیاں ہوئیں کہ خیالات کا دھارا احمد علی کو پا سکنے کی رجائیت کی طرف سے یک بارگی احمد علی کو نہ پا سکنے کی قنوطیت کی طرف مُڑ گیا۔ بولے:

''مولانا یہ احمد علی تو ملتا دکھائی نہیں دیتا۔''

''کیوں؟''۔۔۔ ہم نے پوچھا۔

''مولانا چینیوں کے اس شہر میں احمد علی کا ملنا ناممکن ہے۔ بات یہ ہے کہ سامنے کے رخ سے احمد علی بھی ساٹھ فی صدی چینی معلوم ہوتا ہے اور چینیوں کے انبوہ میں کسی چینی سے آپ خط و کتابت تو کر سکتے

ہیں اُسے شناخت نہیں کر سکتے۔۔۔اب اس کو جہاز پر ہی پکڑیں گے"۔

پھر وہیں بیٹھے بیٹھے مرشد نے جو احمد علی کی باتیں شروع کی ہیں کہ وہ کتنا پیارا آدمی ہے، کتنا نڈر ادیب ہے، کتنا قیمتی دوست ہے تو درمیان میں ہماری وقفہ بہ وقفہ یاد دہانیوں کے بعد جب ریستوران سے اُٹھ کر آخر جہاز پر پہنچے تو جہاز ہانگ کانگ کو روانہ ہو چکا تھا۔ بعد میں خط و کتابت سے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب نے بھی اُس شب اپنے آپ کو سنگاپور پر چھوڑ رکھا تھا۔

مرشد کو کھانے سے زیادہ پینے کے قائل تھے۔ تاہم ادب کی طرح کھانے کا بھی بڑا ہی کلاسیکی مذاق رکھتے تھے۔ ذائقہ تو بعد کی بات تھی، کھانے کی صورت بُری ہوتی تو اُس پر بھڑک اُٹھتے۔ طبیعت منغض ہو جاتی، اشتہا مر جاتی۔ کھانا کھانے کے بجائے کھانا نہ کھانے کے حق میں تقریر کرتے۔ نوابانِ اودھ۔ سلاطینِ کشمیر اور قطب شاہی علی قلی خانوں کے مطبخوں، دسترخوانوں کے متعلق وہ جو وسیع ذاتی معلومات رکھتے تھے ان معلومات نے مرشد کو اس ضمن میں کچھ اور بھی مشکل پسند بنا دیا تھا۔ ذائقے اور تنوع کے لحاظ سے کشمیری کھانے کو کھانوں کا بادشاہ مانتے تھے۔ شب دیگ، گوشتابہ، یکھنی، آفتابہ وغیرہ کشمیری کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جو ہمیں ہر کھانے پر سننا پڑتی۔ بارہا مرشد نے شب دیگ خود اپنے ہاتھ سے دم کرنے کا پروگرام بنایا لیکن دیگ میسر آ سکی نہ شب۔ ایک مرتبہ ایک چینی لکھ پتی کی دعوت پر جب کوئی پچاس کورسوں کے ڈنر سے سابقہ پڑا جس میں چینی باورچیوں نے چڑیا کی ایک چونچ میں ترش، نمکین، شیریں مچھلی تل کر سامنے رکھ دی تھی تو مرشد چینیوں کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے تھے مگر قیادت کا جھنڈا پھر بھی کشمیر ہی میں لہراتا رہا۔

دو سال کے بعد مرشد ۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ہم سے رخصت ہوئے۔ احباب کا ایک ہجوم الوداع کہنے کو ساحل پر موجود تھا۔ جس میں فوجی افسر، سردار، سپاہی سبھی شامل تھے۔ مقامی ملاقاتیوں کا بھی ایک جمِ غفیر پہنچا ہوا تھا۔ ملائی معززین، عرب سوداگر، چینی آرٹسٹ اور ہیپی ورلڈ اور گریٹ ورلڈ کے خدمت گار ایک اجنبی کو رخصت کر رہے تھے۔ ان میں بہت تھوڑے تھے جو ادیب چراغ حسن حسرت کی عظمت سے واقف تھے۔ ان لوگوں کو انسان چراغ حسن حسرت کی محبت جزیرے کے کونے کونے سے کھینچ لائی تھی۔ ہم سے ہمارا مرشد جدا ہو رہا تھا۔ سپاہی ایک ایسے افسر کو رخصت کر رہے تھے جو افسروں کی نوع ہی سے مختلف تھا۔ مقامی احباب اس شخص کو الوداع کہہ رہے تھے جس سے مل کر وہ ایشیا کے ایک عظیم ملک کی روح

میں جھانک سکے تھے۔ پپی ورلڈ کے خدمت گار اُس محسن سے محروم ہو رہے تھے جو چائے پے بغیر بھی بڑی باقاعدگی، بڑی فیاضی سے اُن کو ٹِپ دیتا تھا۔ اور جب عظیم ''ڈویژن شائیر'' لنگر اُٹھا کر آبنائے ملاکا کے کھلے دہانے کی طرف رینگنے لگا تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے وہ دو سال ہماری پوری زندگی پر پھیل گئے ہوں۔ جذبات کے ایک مشترکہ جھٹکے سے ہر دل بوجھل، ہر آنکھ نمناک ہو گئی مگر جو شخص بچوں کی طرح بلبلا کر رو پڑا وہ مرشد کا اردلی علامہ عنایت اللہ تھا جو مرشد کو بچوں کی طرح پالتا رہا تھا۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دِلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

اخلاق احمد دہلوی

سَر اُٹھایا تھا کہ "سنگ" یاد آیا

۲۹/ دسمبر ۱۹۵۱ء! ہفتے کی رات کو جب ریڈیو پر یہ خبر سُنی کہ اُردو کے مشہور شاعر حضرت نہالؔ سیوہاروی کا کراچی میں انتقال ہو گیا تو جان نکل گئی۔ ابراہیم سلیم صاحب اور میر لطیف الرحمٰن صاحب جنہیں مارے مروت کے چچا لطیف کہا جاتا ہے۔ میری حالت دیکھ کر گھبرائے تو میں نے کہا کہ مجھے افسوس اس کا کم ہے کہ:

اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

بلکہ دھچکا یہ لگا ہے کہ نہال کی عمر پچاس برس کی بتائی گئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس کے درمیان ہونی چاہیے تھی۔ نہال کے ہر ہر شعر کے ہر لفظ سے جواں ہمتی تو رہی ایک طرف، جواں سالی برستی ہے۔" چچا لطیف" نے کہا تو پھر نہال صاحب کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کی تازگی کے باعث کسی کو اپنی پختہ سالی کا احساس نہ ہونے دیا۔

میں پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور جب سر اُٹھایا تو وہ پتھر یاد آیا جہاں ہر شب کتب خانہ علم وادب کی محفل برخاست کرنے کے بعد کسی مے کدے یا قہوہ خانے میں مختلف موضوعات پر مباحثے یا کبھی کبھی مزا منہ کا بدلنے کے لیے" مفاشے" کر کے دِلّی کے چند" یارانِ علم وادب" یادگار باغ کے دروازے کے باہر پتھر پر

آ کر پھڑ جماتے اور جو بحثیں تشنہ رہ جاتیں انہیں اپنی دانست میں گویا پایہ تکمیل تک پہنچاتے اور اس وقت تک اس پتھر سے اُٹھنے کا نام نہ لیتے جب تک سپاہی آ کر آوارہ گردی میں چالان کرنے کی دھمکی نہ دیتا۔ تابش صاحب کا خیال تھا کہ کوئی ''پیر میکدہ'' یا ''میر قہوہ خانہ'' وقت ختم ہو جانے کا عذر پیش نہ کرے اور پولیس کا سپاہی کہیں کسی حالت میں ہمیں کبھی نہ ٹوکے اگر یہ نہال صاحب ذرا آدمیت کی جون میں رہیں۔ تابش اپنی ہی طرح انہیں باقاعدہ بنانے کی کوشش میں رہتے لیکن ان دونوں شاعروں میں وضع قطع کے اعتبار سے بقول ظفر قریشی کے ''بعد القطبین'' تھا۔ ایک طرف تابش کا یہ حال تھا کہ اگر ایک جوتا آج خریدا ہے تو دس برس بعد وہی جوتا آپ کو آج سے زیادہ نیا معلوم ہوگا۔ شیروانی جیسی درزی نے سی کر دے دی کیا مجال جو اس میں کہیں کوئی سلوٹ کبھی نظر آ جائے۔ داغ دھبے کا تو ذکر ہی کیا۔ جو درزی ان کے کپڑے سیتے ہیں چاہے ان کے چہرے کی جھریوں میں کچھ بھی اضافہ کیوں نہ ہو جائے لیکن تابش دہلوی کے کپڑے سالہا سال بعد آپ کو ٹانکے کے ٹوٹے محسوس ہوں گے۔ پر نہال صاحب اس کے اُلٹ رہتے۔ گھر سے ہمیشہ صاف سُتھرا لباس پہن کر نکلتے لیکن جہاں پہنچتے دیکھنے والوں کو یوں نظر آتا جیسے یہ ہر گلی اور ہر بازار کو کوچہ جاناں سمجھ کر سر کے بل گزرے ہیں۔ گرد و غبار میں اَٹے ہوئے۔ ہاتھ میں تین چار دمڑ چیل قسم کے قلم بٹیروں کی طرح دبائے جن کی نبوں کی نوکیں اس قدر techni colour رہتیں کہ یہ سمجھنا دُشوار ہوتا کہ نہال صاحب آخر کس کس وقت کس کس رنگ کی روشنائی استعمال کرتے ہیں اور پھر جب کسی سے ان کا تعارف کرایا جاتا تو ہمیشہ بند کی بند مُٹھی مع ان قلموں کے تعارف کرانے والے ہی کے ہاتھ میں دے دیتے۔ تعارف حاصل کرنے والا اس ''بوقلمونی'' پر دنگ رہ جاتا اور ہر چند تعارف کرانے والے کی کوشش یہ ہوتی کہ یہ کسی طرح اسی آدمی سے ہاتھ ملائیں جس سے تعارف کرایا جا رہا ہے۔ لیکن نہال صاحب اسے کچھ وضع داری سے بعید سمجھتے کہ جان پہچان کے آدمی کو چھوڑ کر کسی نئے آدمی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیں اور پھر روزمرہ کے ملنے جلنے والوں سے نئے سرے سے تعارف حاصل کر کے بقول شاہد صاحب کے ''اُلٹی ہنسی'' کچھ اس طرح ہنستے کہ نیا آدمی جس سے دراصل ان کا تعارف کرانا مقصود ہوتا۔
''پسینہ پونچھتا اپنی جبیں سے۔''

شاہد صاحب کا خیال تھا کہ عام انسان جب قہقہہ لگاتے ہیں تو ان کی ہنسی حلق سے باہر کی طرف نکلتی ہے لیکن اس خاص انسان کی ہنسی واپس حلق ہی میں اُتر جاتی ہے اس لیے اس ہنسی کا نام اُنھوں نے ''اُلٹی ہنسی'' رکھا تھا۔ امیر حیدر صاحب کا خیال تھا کہ یہ داخلی ہنسی ہے اور ان کے نزدیک ہنسی کا یہ نوحہ محمد حسن

عسکری صاحب کے الفاظ میں داخلی خارجیت یا خارجی داخلیت کا کرشمہ تھا۔

نہال کے جان پر کھیل جانے کی خبر سن کر سب سے زیادہ صدمہ تو ظاہر ہے جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کو ہوگا اور کوئی شعر و سخن کی محفل کہیں بھی اب ایسی منعقد نہ ہو سکے گی۔ جہاں عبدالخالق نہال سیوہاروی کی کمی محسوس نہ کی جائے لیکن دِلّی کے وہ ''یارانِ علم و ادب'' ''جو یادگار'' کے باہر باغ کے دروازے کے پتھر پر بیٹھ کر نہال کی غزلیں سنتے تھے، جس طرح ان کی عدم موجودگی پر متاسف ہونگے وہ بیان سے باہر ہے۔

نہال صاحب کے بارے میں اکثر اسی سنگِ سُرخ پر بیٹھ کر جو دِلی کے ایڈورڈ پارک یا یادگار باغ کے دروازے کے باہر نصب ہے، یہ بحث ہوئی کہ ان کا شمار نباتات میں کیا جائے، جمادات میں یا حیوانات میں۔۔۔لیکن ان کی شاعری میں کبھی کسی کو کوئی کلام نہ ہوا۔ گو تخلص ان کا ہمیشہ معرضِ بحث میں آیا اور میجر محمد میاں جاذب قریشی دہلوی بی۔اے (آنرز) ایل۔ایل۔بی تک نے ان کو تخلص بدلنے کی تلقین کی۔ جن کے جاذب تخلص رکھنے پر خود اپنی جگہ بعض ''یارانِ علم وادب'' کچھ مطمئن نہ تھے لیکن نہال کے ہر ہر شعر پر ہمیشہ ہر سخن فہم کو داد ہی دینی پڑی۔ اور شاعرِ ''شباب وانقلاب'' نہال ہر محفل میں اپنی نغز گوئی کا سکہ جما کر اُٹھتے۔ حضرت جگر مراد آبادی کو جہاں اس کا افسوس ہے کہ مجاز کو جوش نے بگاڑا۔ وہاں اس کی خوشی بھی ہے کہ نہال کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

اسی مہینے میں شان الحق صاحب حقی دہلوی کسی کام سے کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ ایک مخصوص محفل میں جو ایک طرح سے ن۔م۔ راشد صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ نہالؔ صاحب اور حضرتِ ادیبؔ سہارنپوری کا ذکر باتوں باتوں میں آ گیا۔ ''شان'' صاحب نے کہا کہ نہالؔ صاحب کی شاعری تو حسب معمول شباب پر ہے لیکن وہ خود کچھ مُرجھا چلے ہیں۔ میں نے کہا خیر اس کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاہد صاحب اس سلسلے میں دِلی ہی میں ایک مرتبہ ''ساقی'' کے دفتر میں اطمینان دلا چکے تھے کہ نہالؔ میں کوئی چیز اب مرنے کی باقی رہی ہی نہیں۔ جو چیزیں انسان میں مرنے کی ہوتی ہیں وہ سب ان میں پہلے ہی مر چکی ہیں اب یہ محض ایک روح ہیں اور روح بعض لوگوں کے نزدیک ہوتی ہے اور لازوال ہوتی ہے لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ خبر بھی ابھی سننے کو رکھی ہے۔

اے دریغا وہ رندِ شاہد باز!

ہوگئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
خواب دیکھا کیے نادیدہ گلستانوں کے

جس غزل کا یہ شعر ہے، ساری غزل کچھ اسی ''موڈ'' میں ایک مرتبہ دِلی میں صادق الخیری صاحب کے مکان پر ایک محفل میں جب نہال صاحب نے سنائی تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں یہ حضرت پٹڑی تو نہیں بدل رہے ہیں۔ میں نے کہا نہال صاحب یہ آپ کے کرنے کی باتیں نہیں آپ تو۔۔۔ جواں، ہردم دواں، پیہم رواں قسم کی زندگی کے قائل ہیں۔ اپنے رنگ پر قائم رہنے اور جوش کے کہنے کے مطابق اس ''باقیاتِ فانی'' آنجہانی یعنی تابش کی صحبت کا اثر نہ قبولیے۔ کہنے لگے صاحب ہم کوئی بدلنے والے ہیں۔ ہم نہیں بدل سکتے۔ ہم تو زمانے کو بدلنے آئے ہیں۔ ہم:

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

کے علمبردار ہیں اور پھر ماسٹر ممتاز حسین بی۔ اے (آنرز) بی۔ ٹی دہلوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ رباعی سُنائی:

پیدا ہوئے دو فلاسفر دُنیا میں
میں اور فلاطوں بہ یقین در سوگند
اس کو کیا چرخ پیر نے خم میں قید
مجھ کو کیا دفتر کی حوالات میں بند

لیکن۔۔۔ لیکن آج مجھے سب سے زیادہ نہال کی وہی غزل یاد آ رہی ہے، جس کا ایک شعر میں نے ابھی ابھی نقل کیا کہ:

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
خواب دیکھا کئے نادیدہ گلستانوں کے

نہال نے یہ خواب تنہا نہیں دیکھے، بلکہ سب کو دکھا کر دیکھے۔ اس نے ہمیشہ صحرا نشینوں کو نخلستانوں اور مرغزاروں ہی کے تذکروں میں بہلائے رکھا اور کبھی اپنے قدردانوں کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ کسی بے آب و گیاہ جنگل میں ہے۔ وہ جس محفل میں اپنی ٹانگوں میں تین یا چار یا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ بل دے کر کرسی نشیں ہوتا تو عرش و کرسی سے بلند ہی پرواز کرتا اور اس بلند پروازی میں سب کو اپنا شریک بنالیتا۔

صورت پر چاہے ''فراق'' ہی لکھا رہتا لیکن باتیں بالعموم وہ وصل ہی کی کرتا۔ تابش صاحب کبھی انہیں ''شاعر اعظم'' کی گالی دیتے (یہ گالی تابش نے یوں وضع کی تھی کہ اس ترکیب کے پس منظر میں مرحوم

رفیع احمد خاں لکھنوی کی ایک غزل ہے جو حضرت اصغر گونڈوی پر انہوں نے اپنے مخصوص رنگ میں بے تکلفی میں کہی تھی) تو نہال صاحب مارے خوشی کے نہال نہال ہو ہو جاتے اور تابش دہلوی کو گلے سے لگا لیتے اور اُس وقت تک گلے سے لگائے رکھتے جب تک دو تین آدمی مل کر انہیں چھڑا نہ لیتے۔ نہال صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب کسی سے گلے ملتے تو اس کے بعد یہ بھول جاتے کہ اس سے الگ بھی ہونا ہے۔ اس غفلت کا نتیجہ یہ تھا کہ جس کے ایک دفعہ گلے لگے بس گلے کا ہار ہو گئے۔ فریق ثانی کے لیے اس ہڈیوں کی مالا کا اُتارنا ہمیشہ ایک مرحلہ بن کر رہ جاتا اور بھولنے میں کچھ ایسی ''شترگربہ'' بعض اوقات بپا کرتے کہ سب پریشان ہو جاتے۔ مثلاً گلے کسی بات پر ملنا چاہتے ہیں فضلِ حق قریشی صاحب سے اور باہیں ڈال دیں صلاح الدین قریشی صاحب کی گردن میں، یا الحاج حافظ سید وصی اشرف کی کمر میں، اور پھر وہ پنجے جھاڑ کر گویا عیدی ملتے کہ باید و شاید۔ ہر شخص کے لیے اتنا بے پایاں خلوص کسی میں کب ہوتا ہے۔

مرحوم نواب سراج الدین سائل دہلوی کے شاگرد نہال کو کبھی ان کے احباب میں سے کسی نے رنجیدہ نہ پایا۔ ہر دوست کو دیکھ کر کھل اٹھتے، اور اس وقت تک کھلکھلاتے رہتے جب تک کوئی پیٹھ ٹھونک کر ان کی ہنسی کا رُخ حلق سے باہر کی طرف نہ پھیر دیتا۔ ہنسی کا دورہ ان پر کچھ کھانسی کی طرح پڑتا اور جس طرح اچھو لگ جانے پر مائیں بچوں کی پیٹھ ٹھونکتی ہیں کہ کہیں بچے کا سانس رُکا نہ رہ جائے۔ بالکل اسی قسم کی حرکت نہال صاحب کے بعض احباب کو بھی کبھی کرنی پڑتی۔ راستہ چلتے وقت اگر تنہا ہوتے تو ہمیشہ سنجیدہ صورت نظر آتے۔ فکرِ سخن میں مستغرق۔ فکرمندی یا حزن و ملال کے آثار اس وقت بھی ان کے چہرے پر نظر نہ آتے۔ راستہ کبھی سیدھا نہ چلتے۔ دیکھنے والوں کو ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ یہ سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لیے پر تول رہے ہیں حالانکہ ان کا مقصد کنارے کنارے سیدھی راہ چلنا ہی ہوتا۔ تانگے، موٹریں، گاڑیاں، بگھیاں وغیرہ ساری عمر ہر سڑک پر خود ان سے بچتی رہیں۔ نہال صاحب نے بھی حادثے سے بچنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ گرمیوں میں شیروانی کی آستینیں کہنیوں بلکہ بعض اوقات کھوؤں سے اُوپر تک چڑھائے رکھتے اور سردیوں میں یہ بھول جاتے کہ اب گرمیاں نہیں ہیں۔ شعر اکثر وہ چلتے پھرتے ہی کہہ لیا کرتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی رسالے وغیرہ کے اڈیٹر نے انہیں دفتر میں ٹیلیفون کیا۔۔۔ ٹیلیفون پر غزل کا تقاضا سُنا اور دفتر کا سب کام جوں کا توں چھوڑ چھاڑ، جس اڈیٹر نے ٹیلیفون کیا ہوتا اس کی سمت ''چُھٹ'' جاتے۔۔۔ اور ہمیشہ ایسے بے مہار ''چھٹتے'' کہ جس جس سڑک پر سے گزرتے وہاں کے ''ٹریفک'' کا نظام درہم برہم کر جاتے۔ موٹروں کے ہارن، قریب سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی

آوازیں، گاڑیوں بگھیوں کی گڑگڑاہٹ، غرضیکہ ہر شور و غوغے سے بے نیاز بگ ٹٹ بس اس اڈیٹر کے پاس سر پہیہ اور پیر گاڑی ہو کر پہنچنے کی فکر میں رہتے جس نے غزل کا تقاضا کیا ہوتا۔ راستے میں جب غزل مکمل ہو جاتی تو کہیں ٹھیکی لینے کو رُک جاتے۔ کہیں بھی جگہ کی قید کے قائل نہ تھے۔ مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو۔۔۔ یہ بیٹھ کر غزل کسی دفتر ہی کے کاغذ پر رقم کرتے اور اگر کوئی جاننے والا ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا تو اپنی غزل اڈیٹر کو پہنچا کر ہی دم لیتے۔ ہاں اگر کوئی ذرا سی جان پہچان کا آدمی بھی نظر آ جاتا تو پھر ان سے کسی وعدے کا پاس ممکن نہ تھا۔ جب تک وہ جاننے والا خود ہی ان کا پیچھا نہ چھوڑ دیتا، یہ اس سے جدا ہونے کا نام نہ لیتے۔ کبھی اگر کسی رسالے وغیرہ کا مدیر یا کسی مشاعرے کا کوئی مہتمم کہیں ان سے یہ شکایت کر بیٹھتا کہ دیکھیے نہال صاحب حسب وعدہ آپ نے غزل نہ بھیجی یا آپ مشاعرے میں تشریف نہ لائے تو یہ جواب میں بالکل میرزا ادیبؔ کے ''صحرانورد کے خطوط'' کے پہلے ایڈیشن کا سرورق بن جاتے۔ معذرت پیش کرنے کا ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ تابش جب اُنہیں الٹے جوتے پہنے ہوئے دیکھ کر جز بز ہوتے تو شاہد صاحب ہمیشہ ان کی یہ کہہ کر حمایت کرتے کہ جوتے انہوں نے سیدھے ہی پہنے ہیں، پیر اُلٹے لگ گئے ہیں۔ نہال شاہد صاحب کی اس حمایت پر اپنے سر کے بال پیچھے کی طرف زور سے گھسیٹتے اور آسمانوں کو گھورتے۔

جس دفتر میں یہ ملازم تھے وہاں اچھے خاصے اوسط درجے کے افسروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ لیکن ان کا ماتحت عملہ ہمیشہ ان کے لاابالی پن سے فائدہ اٹھاتا اور ان کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے اپنا کام بھی انہیں سے لیتے۔ اس وجہ سے اکثر رات گئے تک دفتر کی خودساختہ حوالات میں بند رہتے اور پھر بہت سی فائلوں کا پلندہ بغل میں مار کر کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کرنے پہنچ جاتے اور کبھی گھر کا رُخ کرتے۔ ان کے لیے شاید گھر اور دفتر میں کوئی فرق نہ تھا۔ کاموں کے دفتر اور دفتر کے کاموں سے انہیں عمر بھر نجات نہ مل سکی اور اس پر دفتر کی دفتر غزلیں کہیں۔۔۔!

نہال صاحب کا بڑا لڑکا جس نے بی اے کر لیا تھا اور جو نہال صاحب کو اپنی سب اولادوں میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ جب دق میں مبتلا ہو کر باوجود نہال صاحب کی حسب استطاعت کوششوں کے جانبر نہ ہو سکا تو انہوں نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور کسی سے اس حادثہ جانکاہ ذکر تک نہ کیا جب تک کہ از خود ان کے احباب کو اس کا علم نہ ہو گیا۔ سب کو معلوم ہونے کے بعد بھی کسی سے اپنی اس جان کنی کا ذکر خود نہ کرتے اور اگر کوئی ان کے سامنے ان کے لڑکے کی ذہانت اور طباعی کا ذکر نکالتا تو یہ کہہ کر بات ختم

کر دیتے کہ۔۔۔ہاں صاحب اب کیا کیا جائے۔کوئی کیا کر سکتا ہے! جو ہونا تھا ہو گیا۔۔۔!!

جو ہونا تھا یا نہیں ہونا تھا، وہ تو ہو گیا۔اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی تلقین تو سب ہی کریں گے لیکن کوئی ایسی ٹھوس بات ہونی چاہیے جس سے واقعی پسماندگان کے کچھ آنسو پونچھیں،اور مجھے رہ رہ کر وہی ''یادگار'' پتھر یاد آ رہا ہے جہاں ''یارانِ علم وادب'' نے بیٹھ کر وہ وہ فیصلے کیے ہیں کہ بعض لوگ صوفوں اور قالینوں پر کیا کریں گے۔۔۔خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں۔۔۔!!

انیس قدوائی

چودھری محمد علی ردولوی

سُرخ وسفید رنگ، خوب گھنی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں، ململ کا کرتا، اس پر انگرکھا، بڑی مُہری کا لٹھے کا پاجامہ، کبھی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ۔ ایک شاندار ملازم ساتھ، لڈوؤں کی ہانڈی، شراب کی بوتلیں اور سوڈے کا کیس تھامے ہوئے۔ بڑے بے تکلفانہ انداز میں پھاٹک سے داخل ہوتے۔ ان کی غیر معمولی شوخی وظرافت اور کھلے ہوئے ہاتھ کی بدولت بچوں، بوڑھوں اور نوکروں سبھی کو ان کی آمد کی خوشی ہوتی۔ بزرگوں تک کو تحفہ تحائف سے نوازتے، نوکروں پر انعام واکرام کی بارش ہوتی، اور بچے مٹھائی کی ہانڈیاں فوراً اچک لیتے۔

میرے والد سے ان کی دوستی کی ابتدا اُن دنوں ہوئی تھی جب وہ نئے نئے علی گڑھ سے وکالت پاس کر کے بارہ بنکی آئے تھے اور پریکٹس شروع کی تھی۔ محمد علی چچا کا علاقہ کورٹ تھا اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح علاقہ واگذار ہو جائے۔ برٹش گورنمنٹ ہر راجا یا تعلق دار کے نابالغ لڑکے کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس کا علاقہ کورٹ آف واڈس کے سپرد کر دیتی تھی۔ اگر بیٹا ناخلف نکلا تو ضبطی کا بہانہ مل جاتا تھا۔ ورنہ اکثر جوان ہوتے ہی لوگ اپنی جائداد چھڑانے کی کوشش کرتے تھے اور زیادہ تر کامیاب بھی ہوتے تھے۔ محمد علی چچا بھی کامیاب ہو گئے۔ ریاست چھٹی تو وہ بھی تمام بندھنوں سے رہا ہو گئے۔ کالون اسکول

(جواب کالج ہے) راجاؤں اور تعلق داروں کے بچوں کے لیے مخصوص تھا، وہیں تعلیم پائی تھی۔ والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ایک بڑی بہن تھی جس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس لیے گھر میں سارا لاڈ پیار، شان، رنگ رلیاں ان کی تھیں۔

سنتی ہوں، ردولی کی دو حسین ترین بیگمات میں سے ایک ان کی والدہ تھیں۔ حالاں کہ میں نے جب دیکھا ضعیف ہو چکی تھیں اور حلیہ بدل چکا تھا۔ بس آثار کہہ رہے تھے کہ عمارت عظیم رہی ہوگی۔ بڑے کلّے ٹھلّے کی بیوی تھیں۔ انیسویں صدی کے دل پھینک تعلق دار کی ان گنت محبوباؤں کے ہوتے ہوئے بھی بیگم کا رعب و دبدبہ اور عزت و احترام مثالی تھا۔

ایک واقعہ ان ہی لوگوں کی زبانی سنا ہوا یاد ہے کہ تعلق دار مرحوم کا قاعدہ تھا کہ بیگم کو خوش کرنے اور راضی بہ رضا رکھنے کے لیے اکثر نفیس زیورات اور ملبوسات تحفے میں دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر اگر بائی صاحبان کے لیے کوئی زیور خریدتے تو بالکل اسی طرح کا بیگم کے لیے بھیجا جاتا۔ یوں چاندی سونے کی بارش کر کے بیوی کے غیظ و غضب کو ٹالا کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک موقع پر اربابِ نشاط میں سے کسی نے خواہش کی کہ میرا آپ کی طرح اچکن پہننے کو جی چاہ رہا ہے۔ فوراً لکھنؤ کے کاریگروں سے زردوزی سے مرصع اچکن سلوائی مگر ایک نہیں دو عدد۔ ایک فرمائش کرنے والی کو عنایت ہوئی دوسری خود لے کر خوش خوش بیوی کے پاس پہنچے۔ بیگم نے کھولی، دیکھا اور اپنا سر پیٹ لیا۔

''میں کہتی ہوں، تمھاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ اللہ کی شان اب مجھے موئی نکاہیوں اور ناچنے والیوں کا سا لباس پہناؤ گے۔ ایسا دیدہ ہوائی ہے کہ شریف زادیوں اور کمینوں کا فرق بھی مٹ گیا۔ ایسے پہننے والیوں پر اللہ کی مار، بس اور کیا کہوں لو دیکھو۔''

اور یہ کہہ کر جھٹ کپڑوں کو دیا سلائی دکھا دی۔ اچکن جل کر خاک ہو گئی اور میاں بے چارے ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔

ہاں تو صاحب وہی مرتضائی بیگم ہمارے محمد علی چچا کی والدہ تھیں۔ بہت سخت مذہبی تھیں، اس لیے محمد علی چچا کی نئی بیوی کے آتے ہی انہوں نے برابر کے مکان میں رہائش اختیار کر لی اور انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ دن میں دو چار بار آ کر بیٹے بہو کو ڈانٹ ڈپٹ جاتیں۔ باقی اپنے حصے میں نذر و نیاز، مجلس، تعزیہ داری، ماتم سب کرتی رہتیں، کیوں کہ محمد علی چچا نے آخر عمر میں تعزیہ داری بند کر دی تھی۔

محمد علی چچا کے مصاحبین میں حکیم نعمت رسول (جواُن کی بیوی کے حقیقی چچازاد بھائی بھی تھے)، منیجر نوشاد علی صاحب اور خاصے کی چیز میاں منھو ملازم تھے۔ اور چچا کا حکم تھا کہ پرانے نوکروں کو دادا، چچا، ماموں کہہ کر بلایا جائے، تاکہ ان کو یہ محسوس ہو کہ وہ بھی خاندان کے ایک فرد ہیں۔

میرے والد (ولایت علی صاحب) کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں میں سب سے زیادہ محبت و خلوص ہمیں ان ہی سے ملا۔ خود کہا کرتے تھے کہ دو آدمیوں نے میری زندگی تلخ کر دی۔ ایک ولایت، دوسرے بیوی، والد کے انتقال کے بعد بھی وہ ہم سے ملنے مسولی آیا کرتے تھے اور میرے چھوٹے بھائی ردولی بھی پہنچتے تھے۔

پھر جب لکھنؤ میں ہمارا قیام ہوا تو اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہزاروں قصے ان کے پاس تھے، اور سننے والوں کا کثیر مجمع۔ سارے لڑکے لڑکیاں ان کو گھیر لیتے اور اس وقت کوئی دیکھتا ان کی 'گل افشانی گفتار'۔ لکھنوی اور قصباتی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ فارسی اور انگریزی میں بھی برق تھے۔ 'امامن مہری' کے فلسفیانہ خیالات لکھ کر ساری عورتوں پر بیگماتی زبان کے ماہر ہونے کا سکہ انہوں نے بٹھا دیا تھا۔ رئیس زادے ہوتے ہوئے بھی عوام میں گھل مل کر اودھی زبان کے لطیفے، مثالیں اور کہانیاں بھی ازبر کرلی تھیں۔

کپڑے، زیورات، تمیز تہذیب اور معاشرتی رکھ رکھاؤ ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ مجھے یاد ہے جب انہوں نے 'صلاح کار' لکھی ہے تو ہم لوگ خوب ہنستے تھے کہ خدا کی شان! نوجوانوں کے صلاح کار محمد علی چچا بن گئے، جن کے دل پھینک اور دل نواز ہونے کے چرچے سارے ضلع میں پھیلے ہوئے تھے۔

انگریزی تہذیب سے مرعوب تھے اور اپنی تہذیب کے عاشق۔ اسلامی اور ہندوستانی کلچر نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ خاص طور سے مسلمان عورتوں کو وہ چاہتے تھے کہ اس راہ سے قدم نہ ہٹائیں۔ ویسے تعلیم نسواں کے ان دنوں بہت بڑے چمپین تھے۔ ایک روز کہنے لگے، بھئی بیوی کو تو ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ اپنے شوہر کی خوش ذوقی و سخن شناسی کی قدرداں ہو اور اسے سمجھ سکتی ہو۔ تمھیں معلوم ہے؟ فلاں صاحب کا کیا لطیفہ ہوا۔ اتنا بڑا شاعر سارا وقت فکرِ سخن میں کھویا رہنے والا۔ اس نے بیوی سے نکھٹو کا خطاب پایا۔ ایک دن ان کے دماغ میں ایک مصرعہ آیا۔ مصرع بڑا زوردار تھا۔ دن گزر گیا، رات آ گئی، چراغ پاس رکھے اور قلم ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں مگر دوسرے مصرع کا تک ہی نہیں بیٹھ رہا تھا۔ ایک بارگی روشنی نمودار ہوئی اور دوسرا مصرع برجستہ نکل پڑا زور سے پکار اٹھے وہ مارا۔ کیا لاجواب شعر ہوا ہے۔

بیوی سو چکی تھی۔ آواز سُن کر چونک پڑی اے ہے کیا ہوا۔ کیوں چلائے۔ عاجزی سے کہا۔ بیگم بس سُن لو۔ کیا معرکے کا مطلع ہوا ہے۔ شعر کچھ اس قسم کا تھا (اگر چہ انہوں نے سُنایا تھا یاد نہیں رہا) باغ تھا، بہار تھی شبنم نے رات کو موتی لٹائے تھے اور وہ سروِ ناز نظارۂ صبح میں محو تھی۔ تشنہ لبانِ دیدار ہم جلوتے وغیرہ وغیرہ۔

بیوی نے شعر سُن کر کروٹ بدل لی ''میں کہتی ہوں تم جھوٹ کتنا بولتے ہو۔'' یہ داد ملی۔ بے چارے کا منہ اتنا سارہ گیا۔

ایک دن اپنی نئی نئی شادی کا اور بیوی پر فریفتگی کا قصہ بیان کرنے لگے کہ میری بیوی کے پیٹ میں زور کا درد اُٹھا۔ میں دواؤں پر دوائیں دے رہا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اتنے میں قصبے کی ایک بیوی ملنے کو آ گئیں۔ وہ کراہ رہی تھیں اور میں بے تاب ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے انہوں نے ایک چیخ ماری اور میں دیوانہ وار یہ کہتا ہوا ان پر جھک پڑا، ''جانِ من میں کیا کروں کیسے تمھاری تکلیف دُور کروں۔''

مہمان بیوی نے جو یہ ساں دیکھا تو دوپٹے سے اپنا آدھا چہرہ ڈھک لیا۔ اور بولیں ''بھیا مجھے کوئی ڈولی ٹکا دو میں اپنے گھر جاؤں، اب یہاں جانِ من وانِ من ہونے لگا ہے۔''

مولانا کرامت حسین نے اسکول کھولا تو پہلی لڑکیاں محمد علی چچا کی داخل ہوئیں۔ میرے والد کو شاید وہ راضی نہ کر سکے اس لیے میری حسرت پوری نہ ہو سکی۔

دو ہی سال کے اندر ماں نے آفت مچا دی اور دونوں بڑی لڑکیاں واپس بلائی گئیں۔ تب ان کی تعلیم کے لیے ایک حسین نوجوان انگریزی لیڈی کا تقرر ہوا، جو انہیں لکھنا، پڑھنا اور بولنا سکھاتی تھی۔

لڑکیاں تو برائے نام تعلیم حاصل کر سکیں مگر چچا کے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ چچی کو اندیشہ پیدا ہو گیا اور والدہ تو شمشیر برہنہ ہو گئیں۔ ناچار ٹیچر صاحبہ کو رخصت کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنے اور بچی کے گذارے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ آخر کار وکلاء نے درمیان میں پڑ کر خطیر رقم ماں بچی کی کفالت کے لیے دے کر چھٹکارا دلوا دیا۔

بیوی بڑی خدا ترس، مرنجاں مرنج اور مذہبی تھیں۔ حج کو جانے لگیں تو چچا بمبئی تک چھوڑنے گئے۔ جدائی کے وقت بیوی کے آنسو نکل پڑے۔ پھر کیا تھا۔ دوڑ دھوپ کر کے جہاز پر جگہ حاصل کی اور خود بھی حج کو روانہ ہو گئے۔ یہ خبر سُن کر سب حیران رہ گئے۔

واپس آئے تو ہم نے کہا۔ چچا آپ اور حج۔ یہ معجزہ کیسے ہوگیا۔ کہنے لگے یہ بیوی تھی جو مجھے اس دربار میں لے گئی مگر مدینے پہنچ کر بہت ہی دل خوش ہوا۔ بے حد لطف آیا۔

حج سے آنے کے بعد نماز بھی پڑھنے لگے۔ انہوں نے ایک کتاب 'میرا مذہب' بھی لکھی اور اسے پڑھ کر مجھ سے خاصا الجھا دار ہا۔ میں نے کہا، مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ آپ شیعہ فقہ پسند ہیں، کیوں کہ میں دونوں فقہ سے نابلد ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ شیعہ فقہ میں آپ کو صرف متعہ اور تقیہ ہی کیوں پسند آیا۔ اگر تقیہ شریعت کی چیز تھی اور جائز تھی تو حضرت علیؓ نے، حضرت امام حسنؓ و امام حسینؓ نے اور حضرت زینبؓ نے کیوں تقیہ نہیں کیا؟

کہنے لگے۔ امام تقیہ نہیں کر سکتا۔ یہ تو عوام اور کمزوروں کے لیے جائز ہے۔ بہت دیر اس پر بحث رہی، مگر نہ وہ مجھے قائل کر سکے نہ میں انہیں۔

شادی بھی سُنّی بیوی سے ہوئی۔ اور ایسی کٹر کہ سب صعوبتیں سہہ لیں مگر ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ آخر کار چچا نے خاندان والوں سے ان کا پیچھا چھڑایا اور سب کو اس پر راضی کر لیا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

دوسرا نکاح بھی سُنّی عورت ہی سے کیا۔ شیعہ اور سُنّی فقہ سب پڑھ ڈالیں، قرآن اور حدیث کا وِرد رکھا۔ ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے تمام شعراء اور ادیبوں سے تعلقات بڑھائے۔ اچھا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا۔ ہر موضوع پر اور ہر زبان میں پڑھتے تھے۔ اس لیے بہت وسیع معلومات تھیں۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک کانگریس سے بھی بہت دلچسپی رہی۔ جواہر لال جی سے دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک پہیے دار چرخا بھی ایجاد کیا تھا۔ مجھے بھی تحفہ دیا تھا اور اس کا نام "چمرو چرخا" رکھا تھا۔ چمرو ان کے نام کا جز و تھا جسے فخریہ استعمال کرتے تھے۔ ان کی ماں کے بچے نہیں جیتے تھے۔ ایک کثیر الاولاد چمار کے ہاتھ انہیں ٹکے میں بیچ دیا تھا۔ اس لیے 'چمرو' ان کا تخلص بن کر رہ گیا تھا۔ اس چمار کے خاندان پر ہمیشہ نظر عنایت رہی۔

محمد علی چچا، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، بیوی کے عاشقِ زار ہوتے ہوئے بھی بلا کے حسن پرست تھے۔ خوبصورت کپڑا، حتیٰ کہ کراکری اور فرنیچر تک دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اپنے بچوں سے شدید محبت تھی اور دوستوں کے بچوں سے بھی گہرا لگاؤ۔

اکثر ان کی حسن پرستی کے قصے زبان زدِ عوام ہوتے۔ چچا سے پوچھو تو کبھی انکار نہ کرتے۔ جب یو۔

پی کونسل میں زنانِ بازاری کے اخراج اوران کولائسنس عصمت فروش نہ دینے کا سوال آیا تو محمد علی چچا نے مخالفت میں بڑی زوردار تقریر کی اور کہا کہ ہمیشہ سے رؤسا کے بچے علمِ مجلس سیکھنے کے لیے طوائفوں کے یہاں جاتے رہتے ہیں۔

اور ہم لوگ یہ پڑھ کران سے جھگڑ پڑے۔ بہت دیر گرما گرمی رہی، ہنس ہنس کرانہوں نے بہت سے لطیفے سنائے۔ مگر یہ ایک بات بڑے پتے کی کہہ گئے کہ اگر یہ اڈے ختم کردیے گئے، جہاں سوسائٹی کا فاسد عنصر نکال کر ڈالا جاتا ہے تو ہر گھر میں ایسے اڈے کھل جائیں گے اور شریف زادیوں کی اصلاح ختم ہوجائے گی۔

لطف یہ ہے کہ اپنی بیوی، بیٹیوں اور تمام رشتہ داروں، عورتوں کے لیے وہ اخلاق، شرافت، شوہروں سے وفاداری وغیرہ لازمی سمجھتے تھے۔ مگر پرانے جاگیردارانہ نظام میں پرورش پانے کا اتنا گہرا اثر تھا کہ مردوں کے لیے نظر بازی وشاہد پرستی میں کوئی برائی نہیں سمجھتے تھے۔ محمد علی چچا عجیب معجونِ مرکب تھے۔ میرے والد کے تقدس ومعصومیت کے قائل تھے، مگر کسی مجتہد یا مولوی کی برتری وبزرگی پر برافروختہ ہوجاتے تھے۔

وہ بہ یک وقت صوفی منش بھی تھے اور رنگین مزاج بھی۔ ان کی ذات میں تلون، سخاوت، خوش مزاجی اور مغلوب الغضبی کا حیرت انگیز امتزاج تھا۔ رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے محبت رکھتے ہوئے بھی نکاح خود بیٹھ کر پڑھ لیتے اور اس کو جائز سمجھتے اور بلامتعہ کیے کسی عورت سے ملنا گناہ سمجھتے تھے۔

ہم لوگ ایک آدھ بار رات کو بھی ردولی پہنچے۔ مگر پوری پوری خاطر مدارات سے مستفیض ہوکر رات کے بارہ ایک بجے واپس لوٹے۔ اس وقت ان کی خوشی قابلِ دید ہوتی تھی۔ چاہتے تھے کہ کیا کچھ ہمیں کھلادیں اور کتنی خاطر کریں۔

بلا کے ذہین، غیر معمولی خوش مزاج، کھلا ہوا دل، کھلا ہوا ہاتھ، وسیع مطالعہ اور زندگی کا بھرپور تجربہ، کیوں کہ انہوں نے جی بھر کر زندگی سے لطف اٹھایا تھا، بلا کسی دغدغے کھٹکے کے زندگی کی بہاروں میں ہر پھول سے رس نچوڑا تھا۔

اور پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ وقت نے چہرے پر اپنے نشان ثبت کردینے شروع کردیے۔ سیاہی سفیدی سے، سرخی تابنے سے اور اعضا کی توانی فالج کی مار سے بدلی۔

پہلی بیوی کے انتقال کو عرصہ ہوگیا تھا۔ مگر ایک دن سج بن کر باہر نکلے تو ایک کاشت کار نے ٹوکا۔

چودھری صاحب کیا بیاہ کرنے والے ہوا اور پھر بیچ مچ انہوں نے ایک جوان عورت سے نکاح کرلیا۔

ایک بار لکھنؤ آئے تو کہنے لگے۔ بھئی میں تو بڈھا ہوں اور یہ ہیں بالکل جوان۔ اس لیے وجو (میرے بھائی) دیکھو اگر میں نہ رہوں، تو تم ان کی سرپرستی کرنا۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ہائے چچا چوٹی کتیا اور جلیبیوں کی رکھوالی۔ محمد علی چچا بہت محظوظ ہوئے۔ جاکر سب لڑکیوں کو بتایا کہ آج انیس نے یہ جملہ کہا ہے۔ مگر قیصر (ان کی نئی بیوی) رودیں۔ انہوں نے بہت شکایت کی کہ تم نے میرے لیے ایسا کیوں کہا۔

آخر زمانے میں مسوری میں کافی دن ساتھ رہا۔ نچلی منزل ان کے پاس تھی۔ اوپر کی میرے پاس۔ انہی دنوں ایک صاحب مع برقع پوش خاتون کے چچا کے پاس آئے اور طالب مدد ہوئے کہ مسوری میں جیب کٹ گئی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ نہ پیسہ پاس ہے نہ رہنے کا ٹھکانا اور زنانہ ساتھ ہے۔ چچا بے ساختہ بولے "اور زنانہ بھی اپنا نہیں پرایا ہے"۔ اتنا سنا تھا کہ ان کا چہرہ فق ہوگیا۔ چچا نے کچھ رقم ہاتھ پر رکھ دی اور وہ فوراً چل دیے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ زنانہ پرایا ہے۔ بہت ہنسے کہنے لگے۔ "دریافت کرلو۔ دوسرے ہی کا نکلے گا"...... بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا اندازہ صحیح تھا۔ واقعی زنانہ کہیں سے اڑا لائے تھے۔

پہاڑیوں کے رسم ورواج کا ذکر ہو رہا تھا۔ کہنے لگے بھئی نینی تال میں ایک پہاڑی میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ صاحب! آپ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہمارا ایک کاغذ لکھ دو۔ میں نے قلم سنبھالا اور کہا بتاؤ کیا لکھوں۔ اس نے کہا ہمارے پاس دو عورت ہے اور اس کا عورت مرگیا ہے۔ مگر اس کے پاس ایک گھوڑی ہے۔ ہم ایک عورت اس کو دے دیا ہے اور یہ اپنا گھوڑی ہم کو دے گا۔ اس کا پکا کاغذ لکھ دو۔ اور یہ عہد نامہ میں نے لکھ دیا۔

عجیب باغ و بہار شخصیت تھی۔ خالص جاگیرداری ماحول کی پیداوار۔ نہ اب کسی کو اتنے مواقع ہیں نہ فرصت۔ اس لیے میں نے سوچا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کردوں۔ کیوں کہ اس دور میں نہ ایسی شخصیتیں بنیں گی، نہ ان کی ضرورت ہے۔ ایک بات اور بتادوں۔ بوالہوسی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور فنکارانہ عیاشی کو آرٹ سمجھتے تھے اور اپنا پیدائشی حق۔

خدا مغفرت کرے۔ جب تک جئے خوش رہے۔ دوسروں کو خوش رکھا اور سب کو خوش دیکھنا پسند کیا۔ آخر میں فالج سے معذور ردولی میں بیٹھ رہے تھے۔ بچے سب پاکستان چلے گئے تھے۔ دو چھوٹے

لڑکے پاس تھے۔ اس میں ایک خبط الحواس تھا۔ دوسرا ابھی پڑھ رہا تھا۔ اس وقت وہی ردولی میں ان کا نام لیوا ہے۔ بڑی حسرت وغم سے پاکستان جانے والے لڑکے ولڑکیوں کو یاد کرتے تھے۔

محفلوں کی رونق، جلسوں کے صدر نشین، دوستوں کے محبوب اور مذہبی حلقوں سے برسرِ پیکار۔ یہ تھے محمد علی چچا!

وہ صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے۔ افسانوں کے دو مجموعوں کے علاوہ ان کے نام کو زندہ رکھنے والی متعدد کتابیں بھی ہیں۔ مثلاً اتالیق بیوی، صلاح کار، حیاتِ کرامت حسین، میرا مذہب اور کشکول محمد علی شاہ فقیر وغیرہ۔ آرٹ کی پرکھ پر ایک مختصر سا کتابچہ ''نقادی کے نکتے'' کے نام سے اور دوسرا فیملی پلاننگ پر 'پردے کی بات' کے نام سے لکھا تھا، اگرچہ اس وقت فیملی پلاننگ کا کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ 'گویا دبستان کھل گیا' کے نام سے ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ان کی بیٹی ہما بیگم نے، ان کی زندگی ہی میں لاہور (پاکستان) سے شائع کیا تھا۔ اب ان کی کتابوں کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔

اشرف صبوحی دہلوی

مٹھو بھٹیارہ

میاں مٹھو کا نام تو کچھ بھلا سا ہی تھا۔ کریم بخش یا رحیم بخش ٹھیک یاد نہیں، ڈھائی ڈھوئی کے مہینے سے پہلے کی بات ہے۔ ساٹھ برس سے اوپر ہی ہوئے ہوں گے۔ مگر ایک اپنی گلی والے کیا، جو انہیں پکارتا ''میاں مٹھو'' بھٹیارے تھے۔ سرائے کے نہیں، دلی میں محلے محلے جن کی دوکانیں ہوتی ہیں، تندور میں روٹیاں لگتی اور شوربا، پائے اور اوجھڑی بکتی ہے۔ نان بائی اور نہاری والوں سے ان بھٹیاروں کو ذرا نیچے درجے کا سمجھنا چاہیے۔ تندور والے سب ہوتے ہیں۔ نان بائیوں کے یہاں خمیری روٹی پکتی ہے۔ یہ بے خمیری پکاتے ہیں۔ ادھر آٹا گوندھا اور اُدھر روٹیاں پکانی شروع کر دیں۔ پراٹھے تو ان کا حصہ ہیں۔ بعض تو کمال کرتے ہیں۔ ایک ایک پراٹھے میں دس دس پرت اور کھجلے کی طرح خستہ۔ دیکھنے سے منہ میں پانی بھر آئے۔ قورمہ اور کبابوں کے ساتھ کھایئے سبحان اللہ۔ باسن کی بٹی کلمہ نہ پڑھنے لگے تو ہمارا ذمہ۔

شاہ تارا کی گلی میں شیش محل کے دروازے سے لگی ہوئی میاں مٹھو کی دکان تھی۔ شیش محل کہاں؟ کبھی ہوگا۔ اس وقت تک آثار میں آثار ایک دروازہ وہ بھی اصلی معنوں میں پھوٹا ہوا باقی تھا۔ نمونتہً یا بطور یادگار۔ اب تو ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بھی صاف ہوگیا۔ اس کی جگہ دوسری عمارتیں بن گئیں۔ دروازہ تو کیا ڈھہتا دروازے کے دیکھنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے۔ سنا ہے جاڑے، گرمی برسات محلے بھر میں سب

سے پہلے میاں مٹھو کی دکان کھلتی۔ منہ اندھیرے بغل میں مصالحہ کی پوٹلی وغیرہ، سر پر پتیلا، پیٹھ کے اوپر کچھ چھپٹیاں کچھ جھانکڑ لنگی میں بندھے ہوئے گنگناتے چلے آتے ہیں۔ آئے، دکان کھولی، بہارو بہارو کی، تندور کھولا، ہڈیوں گڈیوں یا اوجھڑی کا ہنڈا نکالا، ہڈیاں جھاڑیں، اس کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کیے یعنی گھر سے جو پتیلا لائے تھے ہنڈے کا مال اس میں ڈالا، مصالحہ چھڑکا اور اپنے دھندے سے لگ گئے۔ سورج نکلتے نکلتے سالن، نہاری، شروا، جو کھو درست کر لیا۔ تندور میں ایندھن جھونکا۔ تندور گرم ہوتے ہوتے غریب غربا کام پر جانے والے روٹی پکوانے یا لگاون کے لیے شروا لینے آنے شروع ہو گئے۔ کسی کے ہاتھ میں آنے کا طباق ہے تو کوئی مٹی کا پیالہ لئے چلا آتا ہے اور میاں مٹھو ہیں کہ جھپا جھپ روٹیاں بھی پکاتے جاتے ہیں اور پتیلے میں کھٹا کھٹ چمچہ بھی چل رہا ہے۔

میاں مٹھو کی اوجھڑی مشہور تھی۔ دور دور سے شوقین منگواتے۔ آنتوں اور معدے کے جس مریض کو حکیم اوجھڑی کھانے کو بتاتے وہ یہیں دوڑا چلا آتا۔ کہتے ہیں کہ پراٹھے بھی جیسے میاں مٹھو پکا گئے پھر دلی میں کسی کو نصیب نہ ہوئے۔ ہاتھ کچھ ایسا منجھا ہوا تھا، تندور کا تاؤ کچھ ایسا جانتے تھے کہ مجال ہے جو کچا رہے یا جل جائے۔ سُرخ جیسے باقر خانی، سموسے کی طرح ہر پرت الگ نرم کہو تو لچئ سے زیادہ نرم بالکل ملائی۔ کرارا کہو تو پاپڑوں کی تھئ کھجلے کو مات کرے۔ پھر گھی کھپانے میں وہ کمال کے پاؤ سیر آٹے میں ڈیڑھ پاؤ گھی کھپا دیں۔ ہر نوالے میں گھی کا گھونٹ۔ اور لطف یہ کہ دیکھنے میں روکھا۔ غریبوں کے پراٹھے بھی ہم نے دیکھے۔ دو پیسے کے گھی میں تر بتر۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ ڈیڑھ پاؤ گھی والے سے دو پیسے والے پر زیادہ رونق ہے۔ اس ہنر کی بڑی داد یہ ملتی کہ غریب سے غریب بھی پراٹھا پکوا کر شرمندہ نہ ہوتا۔ پوسیری اور چھٹنکی پراٹھے دیکھنے والوں کو یکساں ہی دکھائی دیتے۔ مال دار اور مفلس کا بھید نہ کھلتا۔

پچھلے وقتوں میں ہر آدمی اپنی کھال میں رہتا۔ جس رنگ میں ہوتا وہی رنگ دکھاتا۔ جس قوم کا ہوتا وہی بتاتا۔ یہ نہیں کہ پیٹ سے زیادہ ملا اور اپھر گئے۔ ہیں اوباش اور صورت ایسی اختیار کی کہ لوگ صوفی کہیں، تھے مردھوں میں اللہ نے کام چلا دیا اب مرزا مغل کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا۔ اللہ نے جیسا بنا دیا، جس پیشے میں رزق اتار دیا، جو صورت بنا دی، اپنی شخصیت کی جھوٹی نمائش انسان کیوں کرے۔ جہاں ہو، کیا وہاں شرافت نہیں دکھا سکتے؟ حلال خور، چمار، کنجڑے قصائی سب اپنے اپنے درجے میں شریف ہوتے ہیں۔ اچھے کام کرو، دین داری بھل منسائی کے ساتھ دوسروں سے پیش آؤ، حرام خوری پر کمر نہ باندھو یہی شرافت ہے ''جنم کا اولیا، کرم کا بھوت، پہلے کپوت دوجے اچھوت'' اونچے خاندان میں بھی تو فرشتے

نہیں ہوتے۔ ایک درخت کے بہت سے پھل، کو کھائے بھی نکل آتے ہیں۔ ڈھول کوٹ کی بعض کچریاں ایسی مزیدار دیکھو گے کہ لکھنؤ کا چسلا پانی بھرے۔

کوئی پچاس برس ہوئے کلن نفیری والا، گلزار بھانڈ، اچپل ہیجوا، نواں تیلی، اجلا دھوبی، بی رنگریز، چنو قصائی، چھوٹا گھوسی، امیر نائی، شبو شہدا، نبو گورکن، کوڑا بھنگی کہنے کو کمین اور پیشے کے لحاظ سے نیچے تھے۔ مگر ان کی شرافت کا کیا کہنا؟ پھر خدا نے ان کو بڑھاپا چڑھایا بھی ایسا ہی تھا۔ میاں مٹھو رہے تو بھٹیارے کے بھٹیارے غریب کو مرتے مرتے گھر کا مکان تک نہ جڑا۔ بھٹیارے سے نان بائی بھی نہ بنے۔ سدا اپنے ہاتھ سے تندور جھونکا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ جیتے جی کوئی ان کی طرف انگلی نہ اٹھا سکا۔ کیا مجال جو کسی طور طریق میں بساند آتی۔ نور کے تڑکے سر جھکائے آنا، ہنس کر بات کرنا، اپنے کام سے کام رکھنا، اور رات کے بارہ بجے آنکھیں بند کئے چلے جانا۔ آدمی کچھ مشٹنڈے نہ تھے۔ معمولی قد، چھریرا بدن، سر گھٹا ہوا، چندی آنکھیں، پلکیں اڑی ہوئیں، شاید دھویں اور آگ نے آنکھوں کا یہ درجہ بنا دیا تھا۔ ڈاڑھی کیا بتاؤں، جب کبھی ہوگی تو بالکل خصی بکرے کی سی۔ تندور میں جھک کر روٹی لگائی جاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی جھپا کا کرے، آگ کی لپٹ کہاں چھوڑے، جھلتے جھلتے لہسن کی پینڈی بن کر رہ گئی تھی۔ ڈاڑھی کا یہ حال تو مونچھوں کا کیا ذکر۔

دِلّی میں جب تک شاہی رہی دن عید رات شب برات تھی۔ ایک کماتا کنبہ بھر کھاتا۔ نہ ٹیکس تھے، نہ اتنی گرانی، ہر چیز سستی، غدر کے بعد تک روپے کا پچیس سیر آٹا، پکا دو ڈھائی سیر گھی، بکری کا اچھے سے اچھا گوشت چار یا چھ پیسے سیر، ترکاریاں پڑی سڑتیں، کون پوچھتا؟ مکانوں کا کرایہ برائے نام۔ اول تو غریب یا امیر سب کے مرنے جینے کے ٹھکانے اپنے الگ۔ پکا محل نہ سہی کچی کھپریل سہی۔ دوسرے غیر جگہ بسے بھی تو مفت برابر۔ آٹھ آنے، روپیہ، دو روپے حد تین، اس سے زیادہ نہ کوئی دیتا نہ لیتا۔ ان فارغ البالیوں اور راحتوں کے بعد مہینے کے تیس دن میں اکتیس میلے کیوں نہ ہوتے؟ ایک نہ ایک تہوار رکھا تھا۔ پھر جو تھا رنگیلا۔ بات بات میں دل کے حوصلے دکھانے اور چھٹی منانے کے بہانے ڈھونڈے جاتے۔ عید کے پیچھے ہفتہ بھر تک سیریں منائی جاتیں۔ باغوں میں ناچ ہو رہے ہیں۔ دعوتیں اڑ رہی ہیں۔ شب برات آئی آتش بازی بن رہی ہے۔ وزن سے وزن کا مقابلہ ہے۔ بسنتوں کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی، سورج مکھی کے ارد گرد مرہٹی بازوں کے غول میں واہ واہ کا شور ہے، آج اس مزار پر پنکھا چڑھا کل اس درگاہ پر، محرم میں سبیلیں سجتیں، تعزیہ داریاں ہوتیں، براق نکلتے، اکھاڑے جمتے۔

"دِلّی کی دل والی منہ چکنا پیٹ خالی"۔ غدر کے بعد کی کہاوت ہے۔ گھر بار لٹ گیا شاہی اجڑ گئی سفید پوشی ہی سفید پوشی باقی تھی۔ اندر خانہ کیا ہوتا ہے؟ کوئی کیا جانے۔ باہر آبرو، جہاں تک سنبھالی جا سکتی سنبھالتے۔ مدتوں پرانی وضعداری کو نبھایا۔ شہر آبادی کی رسمیں پوری کرتے رہے۔ سات دن فاقے کرکے آٹھویں روز پلاؤ کی دیگ ضرور چڑھ جاتی۔ اپنے بس تو باپ دادا کی لکیر چھوڑی نہیں۔ اب زمانہ ہی موافق نہ ہو تو مجبور ہیں۔ فاقے مست کا لقب بھی مسلمانوں کو قلعہ کی تباہی کے بعد ملا ہے۔ اللہ اللہ ایک حکومت نے کیا ساتھ چھوڑا سارے لچھن جھڑ گئے۔ ہر قدم پر منہ کی کھانے لگے۔

اگلے روپ اب تو کہاں دیکھنے میں آتے ہیں۔ کچھ بدنصیبی نے بگاڑے تو کچھ نئی تہذیب نے بدلے۔ اور جو کہیں دکھائی بھی دیں گے تو بالکل ایسے جیسے کوئی سانگ بھرتا ہے۔ دل کی امنگ کے ساتھ نہیں صرف رسماً کھیل تماشہ سمجھ کر۔ محرم میں سبیلیں آج بھی رکھی جاتی ہیں۔ تعزیہ داری بھی ہوتی ہے۔ مگر دلوں کے حوصلے مر گئے تو زندگی کس بات میں؟ پرانی روحوں کو ثواب پہنچانے کے سوا کچھ نہیں۔ میاں منٹو دوکان کے آگے دو کورے مٹکے رکھ کر سبیل بھی لگاتے اور برابر کی دوکان میں تعزیہ بھی رکھتے۔ ان کے تعزیہ میں کوئی ندرت تو نہ ہوتی۔ آرائش والوں سے بنوا لیتے۔ معمولی پھپچیوں اور پنّی کا۔ ہاں جو چیز دیکھنے کے قابل تھی وہ ان کی عقیدت یا سوگوار صورت، چاند رات سے جو یہ امام حسین علیہ السلام کے فقیر بنتے تو بارہویں کو حلیم کھا کر کہیں نہاتے دھوتے اور کپڑے بدلتے۔

دِلّی میں پچاس ساٹھ برس پہلے تک منتوں، مرادوں کا بڑا زور تھا، درگاہوں میں چلّے چڑھتے، مسجدوں میں طاق بھرے جاتے، بچوں کے گلے میں اللہ آمین کے گنڈے ڈالتے، جینے کے لیے طرح طرح سے منتیں مانی جاتیں۔ کوئی شاہ مدار کے نام کی چوٹی رکھتا، کوئی حسینی فقیر بنتا۔ لوگ کچھ کہیں جہالت کے عیب لگائیں یا عقیدے کا کچا بتائیں۔ سچ پوچھو تو فارغ البالی کے سارے چونچلے تھے۔ وہ جو مثل ہے "کیا گنجی نہائے گی کیا نچوڑے گی"۔ دل ہی افسردہ ہو اور ہاتھ خالی ہو گئے تو جس کام میں جتنی چاہو فی نکال لو، خیر وقت وقت کی راگنیاں ہوتی ہیں۔ مطلب یہ کہ میاں منٹو بھی فقیر بنتے تھے۔ بچپن میں ماں باپ نے بنایا ہوگا۔ جوانی میں بدصورت پر بھی کچھ نہ کچھ روپ ہوتا ہے۔ سبز پوشی بھا گئی۔ ہر سال فقیر بننے لگے۔ تعزیہ داری کئی پشتوں سے ان کے ہاں ہوتی آئی تھی۔ یہ اپنے بڑوں کی سنت کیوں ترک کرتے۔ اس کے بعد لوگوں کا بیان ہے کہ انہیں کچھ نظر بھی آیا۔ حضرت عباس کی زیارت بھی ہوئی۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار۔ یہی سبب تھا کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق سچے دل سے تعزیہ نکالتے اور جو کچھ کرتے

بناوٹ سے خالی ہوتا۔ جوانی بحران کا بھی طور رہا۔ اور مرتے مرتے اور کچھ نہ ہو تعزیہ نکالنا اور فقیر بننا نہ چھوڑا۔ آخر میں غریب کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ دکان پر ایک شاگرد کو بٹھا دیا تھا۔ وہ نالائق نکلا آٹھ آنے روز استاد کو دیتا وہ بھی آٹھ آٹھ آنسو رلا کر۔ تاہم جس طرح بنتا محرم کے لیے انہیں بیس پچیس روپے بچانے لازمی تھی۔ دوستوں کو حلیم کھلا کر فقیری اترتی۔

باپ کے مرنے کے بعد میاں مٹھو نے جب دوکان سنبھالی ہے تو ان کی عمر پچیس برس سے کم نہ ہوگی۔ شادی ہوگئی تھی بلکہ دو بچے بھی ہو کر مر گئے تھے۔ باپ کے سامنے یہ بھی گھنٹے دو گھنٹے کے لیے تعزیے کے پاس آ کر بیٹھتے لیکن رات کے دس بجے دوکان اٹھا کر۔ اب تعزیے داری کا بوجھ ان کے سر پر آ پڑا تھا۔ اس لیے چراغ جلتے ہی جلدی جلدی دوکانداری ختم کی، پاس کی مسجد میں نہائے، سبز تہمد باندھا، سبز کرتا پہنا، لال کلاوہ گلے میں ڈالا، جھولی سنبھالی، سبز دو پلڑی ٹوپی منڈھے ہوئے سر پر جمائی اور تعزیے کے پہلو میں دوزانوں آ بیٹھے۔ ملنے والوں میں جو سوز، نوحہ مرثیہ پڑھنے والے ہوتے آتے اور ثواب کے لیے کچھ پڑھ کر چلے جاتے۔ اب جہاں جہاں اس قسم کی تعزیہ داری ہوتی ہے یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ انہیں خود بھی سوز پڑھنے کا شوق تھا۔ شوق کیا، تعزیہ داری، سبیل لگانے، حسینی فقیر بننے اور تعزیے کے آگے کچھ پڑھنے کو نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ آواز تو جیسی بھونڈی تھی، تھی ہی۔ طرہ یہ کہ سلام یا بین جو چیز حضرت پڑھتے وہ بھی سنا گیا آپ ہی کی تصنیف ہوتی۔ لیکن پڑھتے وقت صورت کچھ ایسی سچ مچ کی رونی بناتے اور ایسے جذبے کے ساتھ ادا کرتے کہ سننے والے حضرت امام کی بے کسی کو بھول کر ان پر ترس کھانے لگتے۔

محلے میں کئی جگہ تعزیے نکلتے اور بڑی کاری گری کے ہوتے۔ مرثیے بھی وہاں خوب خوب پڑھے جاتے۔ مگر جتنی بھیڑ ان کی دکان کے آگے رہتی۔ کہیں نہ رہتی۔ بڈھوں کو رقت چاہیے اور بچوں کو دل لگی۔ یہ دونوں باتیں میاں مٹھو میں موجود تھیں۔ بڑے بوڑھے تو انہیں کچھ اور ہی سمجھنے لگے تھے۔ جاگتے یا سوتے یہ سقائے سکینہ کی زیارت کر چکے تھے۔ سبز عمامہ باندھے نقاب ڈالے نیزہ ہاتھ میں لیے، گھوڑے پر سوار سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ کو بھی انہوں نے اپنے تعزیے کے سامنے دیکھا تھا۔ یہ اپنا گھڑا ہوا سلام الاپتے اور وہ بیٹھے سر دھنا کرتے۔ لڑکے بالے کچھ تو ریوڑیوں یا کھیلوں کے لالچ میں جمے رہتے یا ان حرکات وسکنات کا تماشا دیکھنے کے لیے۔ بے چارے شاعر تو کیا تھے بلکہ کلام مجید بھی پورا نہیں پڑھا تھا۔ جوانی میں چاوڑی بازار بھی دو چار ہی مرتبہ گئے ہوں گے۔ ورنہ مرثیے کے دو چار بند، سلام کے پانچ سات شعر یا کوئی سوز وہیں سے یاد کر لاتے۔ اب شوق پورا کرنا ٹھیرا، گھڑ گھڑا کر ایک سلام بنا لیا، میرا

حافظہ کم بخت ایسا ہے کہ کئی دفعہ سُنا اور یاد نہیں رہا۔ حالانکہ میاں مٹھو اسی سلام کی بدولت بنے۔
سلام کہو یا مرثیہ، سوز کہو یا نوحہ کوئی ایسی چیز تھی جس میں بار بار
''نبی جی کے لاڈلوں پر بھیجو سلام۔''
آتا تھا۔ اور اسی کو وہ سب سے زیادہ لہک لہک کر ادا کرتے تھے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ناپ تول کے حساب سے کوئی مصرعہ ہے یا کیا۔ افسوس میں نے لکھ کیوں نہ لیا۔ اور اب جس سے پوچھتا ہوں اسی ایک مصرعہ کے سوا کچھ نہیں بتاتا۔ اچھا اس مصرعے سے اور میاں مٹھو کے خطاب سے کیا نسبت؟ آہ دِلّی مرحوم! دِلی والوں کی دور بلا، میاں دِلّی والے ہی نہ رہے۔ دِلّی کا چھ برس کا بچہ تک سمجھ جاتا۔ آخر کریم بخش یا رحیم بخش پر میاں مٹھو کی پھبتی بھی تو بچوں ہی نے کہی تھی۔ ''نبی جی کے لاڈلوں پر سلام'' والا سلام پڑھتے انہیں دوسرا دن تھا کہ محلے کا ایک لڑکا روٹی پکوانے آیا۔ اتفاق سے رات کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لڑکا انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ اکیلا تھا کچھ کہنے کا ہیاؤ نہ پڑا۔ اتنے میں اس کا ایک یار بھی آ پہنچا۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ میاں مٹھو کی طرف اشارہ کیا اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنستے ہنستے ایک بولا ''میاں مٹھو ہیں۔'' دوسرا کہنے لگا ''میاں مٹھو نبی جی بھیجو۔'' دوکان پر کھڑے ہونے والے لونڈوں کی باتوں پر لوٹ لوٹ گئے۔ اب کیا تھا۔ ساری گلی میں ''میاں مٹھو نبی جی بھیجو'' شروع ہو گیا۔ اس دن سے یہ ایسے میاں مٹھو بنے کی لوگوں کو ان کا اصلی نام ہی یاد نہ رہا۔ لیکن اللہ بخشے کبھی بُرا نہ مانا اور نہ اپنی وضع بدلی۔ مرتے مرتے اپنا وہی سلام پڑھا۔

دیوان سنگھ مفتون

ہندوستان کا مام دین

میں ۱۹۴۷ء میں ایک روز اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک گیروے یعنی سادھوؤں والے کپڑے پہنے ایک سوامی جی تشریف لائے جن کے پاس اردو کے مشہور شاعر حضرتِ احمق پھپھوندوی کا تعارفی خط تھا اور اس خط میں لکھا تھا کہ سوامی پارس ناتھ جی اس غرض کے لیے دہلی آ رہے ہیں کہ یہ جمہوریہ ہندوستان کی صدارت کے امیدوار ہیں اور اس عہدہ کے حاصل کرنے کے لیے ان کی ہر ممکن امداد کی جائے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد میں نے سوامی جی سے باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی مخلص اور قابلِ محبت انسان ہیں مگر ان کے دماغ کی ایک چول نہیں، کئی چولیں ڈھیلی ہیں۔ چنانچہ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ہندی زبان کے اچھے شاعر ہیں۔ آگرہ کے ہندی زبان کے ایک ماہوار رسالہ کو ایڈیٹ کرتے رہے ہیں۔ پچیس برس سے ہندی کی ایک مشہور شاعرہ جوالہ آباد کی رہنے والی ہیں، کے عاشق ہیں۔ ان کو اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا پچیس برس ہوئے صرف ایک بار اتفاق ہوا تھا۔ پچھلے پچیس برس میں یہ خاتون بوڑھی ہو چکی ہیں مگر سوامی جی کے خیال میں یہ شباب کے دور میں ہی ہیں۔ میں نے سوامی جی کی رہائش کا اپنے مکان کے ایک کمرہ میں انتظام کر دیا اور یہ دو سال کے عرصہ تک میرے ہاں بطور مہمان مقیم رہے جس کے لیے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

''ریاست'' کا دفتر اور اس کے ایڈیٹر کا رہائشی مکان ہمیشہ ایک ہی بلڈنگ میں رہے کیوں کہ اس صورت میں کام کرنے کی بہت سہولت رہتی ہے۔ صبح سے شام تک کام کرتے رہو۔ کہیں جانے آنے کی ضرورت نہیں اور اخراجات میں بھی کفایت رہتی ہے۔ اور چونکہ ایڈیٹر ''ریاست'' تنہا رہتا ہے، شام کے وقت دو چار، پانچ سات دوست تشریف لے آتے ہیں۔ دن بھر کے کام کے بعد ایک دو گھنٹے تفریح کے گذر جاتے ہیں۔ چنانچہ سوامی جی سے ملنے کا وقت بھی شام کو دوستوں کی موجودگی میں ہی ہوتا اور وہ دن بھر اپنے کمرے میں یا تو کچھ لکھتے پڑھتے رہتے یا آرام فرماتے۔

سوامی جی کی زندگی کے پچھلے واقعات بھی بے حد دلچسپ ہیں اور ان واقعات کے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ان واقعات میں سے صرف ایک واقعہ سن لیجئے۔ چونکہ آپ ہندی کے شاعر ہیں، پچیس برس ہوئے ایک دوست کے ساتھ الٰہ آباد گئے تو ہندی کے ایک دوسرے شاعر کے ساتھ وہاں کی مشہور شاعرہ جو وہاں کے ایک زنانہ کالج میں پرنسپل بھی ہیں کے مکان پر چلے گئے۔ وہاں چند منٹ بیٹھے اور یہ شاعرہ دوسرے شاعر کے ساتھ باتیں کرتی رہیں اور سوامی جی سے مخاطب بھی نہ ہوئیں مگر سوامی جی اس ملاقات میں ہی وہاں سے عشق خرید لائے اور واپس اپنے وطن پھپھوند (ضلع اٹاوہ، یو۔ پی) پہنچ کر، اس شاعرہ سے یک طرفہ خط و کتابت شروع کر دی۔ یعنی سوامی جی ہفتہ میں ایک دو عشقیہ خط ضرور لکھتے اور وہاں سے کبھی کوئی جواب نہ آتا۔ سوامی جی اس ''ون وے ٹریفک'' سے تنگ آ گئے تو آپ الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں دریائے گنگا کے کنارے آپ نے ایک کوٹھری میں قیام کیا اور جب کوئی شخص وہاں سے اس سڑک کی طرف جاتا جہاں کہ آپ کی ''محبوبہ'' کی کوٹھی تھی (یہ خاتون ہندوستان میں ہندی کی بہترین شاعرہ ہونے کے علاوہ الٰہ آباد میں بہت با اثر ہیں۔ ان کے نہرو فیملی سے بھی کافی مراسم ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی صاحبزادی اندرا گاندھی ان سے پڑھتی رہی ہیں۔ تمام یو۔ پی میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں اور ایک کوٹھی میں امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتی ہیں۔) تو آپ اس کے ہاتھ اپنی محبوبہ کو خط بھیج دیتے جس میں کہ بے اعتنائی کی شکایت کی جاتی اور آپ خط لے جانے والے ہر شخص کو خط لے جانے کا معاوضہ آٹھ آنے دیتے۔ آپ نے ایک روز ایک لڑکے کو خط دیا کہ یہ خط ان کی محبوبہ کو پہنچا دیا جائے۔ یہ لڑکا چالاک ٹائپ کا تھا۔ اس نے خط پڑھا اور دیکھا کہ سوامی جی عشق بازی میں مبتلا ہیں تو اس نے خط پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور کہہ دیا کہ اس نے خط پہنچا دیا ہے۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا۔ سوامی جی خط اور آٹھ آنے دیتے لڑکا خط پھاڑ دیتا اور واپس آ کر کہہ دیتا کہ خط پہنچا دیا ہے۔ ایک روز لڑکے نے اپنی

بہن (جو ہندی پڑھی ہوئی تھی) سے سوامی جی کے نام اس خاتون کی طرف سے خط لکھوایا جس میں تمام خطوط پہنچنے کا اقرار کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ گھر والوں کی سختی اور نگرانی کے باعث جواب نہ دینے کے لیے مجبور تھیں۔ آپ لکھنؤ جارہی ہیں۔ آپ کے پاس اخراجات کے لیے روپیہ نہیں، ساٹھ روپیہ بھیج دیجئے۔ سوامی نے جب اس جواب کو دیکھا تو شدتِ مسرت کے باعث آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ آپ کے پاس اس وقت پچپن روپے تھے۔ آپ نے اپنے پاس ایک پیسہ رکھے بغیر یہ پچپن روپے اس لڑکے کے حوالے کئے۔ سوامی جی کا بیان ہے کہ یہ لڑکا اگلے روز نئے سلے ہوئے کپڑے اور نئی رسٹ واچ پہن کر آیا تو آپ نے سمجھا کہ ان کے ساتھ یہ دھوکہ ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے آئندہ اس لڑکے کا اعتبار کرنا چھوڑ دیا مگر خطوط کا سلسلہ جاری رہا جو دوسرے راہ چلتے لوگوں کے ذریعہ بھیج دیئے جاتے۔

خطوط بھیجنے کا یہ سلسلہ جب چھ ماہ کے قریب جاری رہا اور یہ خاتون ان خطوط سے تنگ آ گئیں تو اس خاتون نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو خط لکھا کہ ایک پاگل شخص ان کو خطوط بھیج کر تنگ کرتا ہے، اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ سوامی جی نے بتایا کہ اس زمانے میں الٰہ آباد میں سپرنٹنڈنٹ پولس ایک انگریز مسٹر مورس تھے۔ انہوں نے ایک کانسٹیبل بھیج کر سوامی جی کو بلایا۔ سوامی جی جب آئے تو مسٹر مورس نے پوچھا کہ آپ اس خاتون کو عشقیہ خطوط کیوں لکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں سوامی جی نے فرمایا کہ یہ خاتون ان کی پچھلے جنم کی بیوی ہے اور اس جنم کی روحانی محبوبہ، اس لیے خط لکھتے ہیں۔ مسٹر مورس نے جب یہ جواب سنا تو آپ سمجھ گئے کہ سوامی جی اپنے دماغ کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ آپ نے سوامی جی کو حکم دیا کہ پہلی گاڑی سے الٰہ آباد سے چلے جاؤ ورنہ حوالات میں دے دیئے جاؤ گے۔ اس حکم کو سن کر سوامی جی کو بادلِ ناخواستہ واپس پھپھوند آنا پڑا۔ پھپھوند واپس آنے پر سوامی جی نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ان کی محبوبہ تو ان کو چاہتی تھیں مگر اس خاتون کے رشتہ دار راستے میں مخل ہوئے تھے اور انہوں نے ہی پولیس کے سپرنٹنڈنٹ سے کہہ کر الٰہ آباد سے نکلوا دیا۔

اوپر کا واقعہ تو پچیس برس پہلے کا ہے، اب سوامی جی کی دہلی کی مصروفیات سنئے۔ سوامی جی سے جب باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ آپ گانجا استعمال کرتے ہیں تو ان میں بہت بڑی ''روحانیت'' پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور سیاست داں بھی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سوامی جی کو دہلی تشریف لائے چند دن ہوئے تھے تو آپ کے لیے انگریزی کے بہت شاندار وزیٹنگ کارڈ چھپوائے گئے جن پر لکھا تھا۔ ''سوامی پارس ناتھ ایگریکلچر، دفینہ اور روحانیت کے اکسپرٹ۔''

کیونکہ سوامی جی کا ارشاد تھا کہ آپ کو زمین کے اندر کی تمام دولت کا علم ہے اور آپ کروڑ ہا من سونا نکلوا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں غلہ کی پیداوار کو دس گنا زیادہ کر سکتے ہیں اور روحانی اعتبار سے چاہیں تو ہندوستان کی تمام بھڑیں، بچھو اور سانپ جمع کر کے غیر ممالک کی فوجوں کے مقابلہ کے لیے بھیج دیں۔ جب وزیٹنگ کارڈ تیار ہو گئے تو ایڈیٹر ''ریاست'' نے عرض کیا کہ اصل مقصد تو ہندوستان کی صدارت حاصل کرنے کا ہے۔ جس کے لیے آپ پھپھوند سے تشریف لائے اور اس کے لیے انتہائی کوشش کی جائے گی مگر یہ عہدہ طریقہ کے ساتھ حاصل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ سوامی جی اس پر آمادہ ہو گئے اور فیصلہ ہوا کہ پہلے تو کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کی ممبری حاصل کی جائے اور کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کی ممبری کے بعد جمہوریہ ہندوستان کی صدارت حاصل ہو۔ چنانچہ ایک درخواست تیار کر کے ٹائپ کی گئی جو وزیر اعظم پنڈت نہرو کے نام تھی۔ اس درخواست میں لکھا گیا کہ سوامی جی ہندوستان کے دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گداگروں کے پیشوا ہیں۔ ان سادھوؤں کا ایک نمائندہ کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی میں ہونا چاہیے تا کہ ان کے حقوق محفوظ رہیں اور سوامی جی بطور ان کے پیشوا اور لیڈر کے ان کے بہترین نمائندہ ہو سکتے ہیں، اس لیے ان کو کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کا ممبر نامزد کیا جائے۔ اس درخواست کے ساتھ آپ کو پنڈت نہرو کے پاس بھیجا گیا۔ اس زمانے میں پنڈت نہرو ہر شخص سے مل لیا کرتے تھے۔ آپ جب پنڈت نہرو کی کوٹھی پہنچے اور آپ نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجا تو پنڈت جی نے آپ کو اندر طلب فرمایا۔ آپ نے جاتے ہی پنڈت جی کو وہ درخواست دی۔ پنڈت جی اس درخواست کو پڑھ کر حیران سے ہو گئے کہ یہ کون حضرت ہیں جو کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کے ممبر ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کے اور پنڈت جی کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی:

آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

میں پھپھوند ضلع اٹاوہ، یوپی کا رہنے والا ہوں۔

آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے؟

میں دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گداگروں کا پیشوا اور نمائندہ ہوں۔ میرا اصل مقصد تو ہندوستان کا صدر بننا ہے مگر فی الحال کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کا ممبر ہونا چاہتا ہوں۔

آپ پھپھوند میں کیا کرتے ہیں؟

میں زراعت، دفینہ اور روحانیت میں ماہر ہوں۔ زمین کا تمام دفن شدہ سونا اور جواہرات نکال کر ملک کو مالا مال کر دوں گا اور اگر ضرورت ہوئی تو دشمن ملک کی فوجوں کے مقابلہ کے لیے ہندوستان کے تمام

بھڑوں، بچھوؤں، سانپوں اور مچھروں کو بھیج دوں گا۔

آپ دہلی کب سے تشریف فرما ہیں؟

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتے کے قریب ہو گیا ہے۔

آپ یہاں دہلی میں کہاں مقیم ہیں؟

میں اخبار ''ریاست'' کے دفتر میں اس اخبار کے ایڈیٹر دیوان سنگھ کا مہمان ہوں۔

سوامی جی کا بیان ہے کہ جب پنڈت جی نے اخبار ''ریاست'' اور اس کے ایڈیٹر دیوان سنگھ کا نام سنا تو آپ نے مسکراتے ہوئے کہا، ''خوب! میں اب سمجھا کہ آپ بہت بلند شخصیت ہیں۔ میری بھی رائے ہے کہ کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کی ممبری کے لیے آپ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص مستحق نہیں یقیناً آپ اس کے حقدار ہیں اور آپ کو ضرور اسمبلی کا ممبر بنایا جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے پنڈت جی نے سوامی جی کی درخواست کو سامنے پڑی فائیلوں کے اوپر رکھ دیا اور کہا کہ آپ جا سکتے ہیں، آپ کو ضرور ممبر بنایا جائے گا۔ چنانچہ سوامی جی جب دفتر ''ریاست'' میں واپس آئے تو بہت ہی خوش اور مطمئن تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مرحلہ تو طے ہو گیا۔ اب بھگوان نے چاہا تو صدارت بھی مل جائے گی۔

پنڈت نہرو کے ملنے کے بعد اگلے روز سوامی جی دوستوں کے مشورے کے مطابق بابو راجندر پرشاد (جو اس زمانہ میں فوڈ منسٹر تھے) کے پاس پہنچے کیوں کہ سوامی جی بھی جنم کے لحاظ سے کائستھ ہیں اور بابو راجندر پرشاد بھی کائستھ۔ ایک کائستھ کو اپنے کائستھ بھائی کی امداد ضرور کرنی چاہیے۔ سوامی جی جب بابو راجندر پرشاد کی کوٹھی گئے تو آپ نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ بابو جی نے سوامی جی کو بلا لیا اور دونوں کے درمیان یہ باتیں ہوئیں۔

میں دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گداگروں کا نمائندہ اور پیشوا ہوں اور میں کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کا ممبر ہونا چاہتا ہوں تاکہ ان کے حقوق کی حفاظت کروں۔ آپ کائستھ ہیں اور میں گو اب سادھو ہوں مگر جنم کے لحاظ سے میں بھی کائستھ ہوں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ میری امداد کریں اور مجھے کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کا ممبر بنوا دیں۔ میں پنڈت نہرو سے بھی مل آیا ہوں اور انہوں نے وعدہ فرما لیا ہے۔ بابو راجندر پرشاد نے جب یہ سنا تو وہ بھی چکرائے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے ٹالنا چاہا تو سوامی جی کو اپنی برادری کی بے مہری کا خیال آ گیا اور آپ نے خفا ہو کر کہا آپ: ایگریکلچر منسٹر بنے پھرتے ہیں مگر آپ کو کچھ پتہ نہیں کہ

ایگری کلچر کیا ہے۔ بھلا آپ بتائیے کہ جوی کیا ہوتی ہے؟ سوامی جی کے اس سوال پر بابو راجندر پرشاد مُسکرائے اور فرمایا کہ فی الحقیقت آپ کو علم نہیں کہ جوی کیا ہوتی۔ سوامی جی نے جواب دیا کہ بس یہی زراعت کے متعلق آپ کی معلومات ہیں۔ اب اگر کہیں تو میں بتاتا ہوں کہ جوی کیا ہوتی ہے۔ بابو راجند پرشاد نے کہا فرمایئے جوی کیا ہوتی ہے؟ تو سوامی جی نے فرمایا جوی جو کی گھر والی یعنی جو کی بیوی ہوتی ہے۔ اس گفتگو کے بعد سوامی جی واپس دفتر ''ریاست'' میں تشریف لے آئے مگر آپ بابو راجندر پرشاد اور اپنی کایستھ برادری دونوں پر بہت خفا تھے کہ انہوں نے سوامی جی کی قدر نہ کی۔

تیسرے روز آپ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کے لیے گئے مگر آپ کے سکریٹری مسٹر اجمل خاں نے کہہ دیا کہ مولانا مصروف ہیں۔ سوامی جی واپس آئے اور بہت ناراض تھے اور ان کو سخت شکایت تھی کہ مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا اور ان کی شخصیت اور علمیت کی قدر نہ کی گئی۔

اگلے روز آپ مہاتما گاندھی سے ملنے کے لیے ہری جنوں کی بستی میں گئے جو ریڈنگ روڈ نئی دہلی پر ہے۔ مہاتما جی لوگوں سے ملاقاتیں کر رہے تھے اور ہر ایک کو دو دو منٹ دیئے جاتے تھے۔ اس وقت ان کے پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض مسٹر برج کرشن چاندی والے ادا کر رہے تھے۔ سوامی جی تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے تو مسٹر برج کرشن جی نے سوامی جی کو مہاتما جی کے پاس اندر جانے کے لیے کہا۔ سوامی جی اندر گئے تو آپ نے وہی درخواست جو آپ پنڈت نہرو کو دے چکے تھے، مہاتما جی کو بھی دی۔ مہاتما گاندھی اس درخواست کو پڑھ کر خاموش رہے۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ آپ کسی بے معنی بات پر ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کرتے تھے اور سیاسی معاملات کے تفکرات کے باعث بہت سنجیدہ تھے۔ مہاتما جی نے کچھ جواب نہ دیا اور دو منٹ پورے ہو گئے اتنے میں مسٹر برج کرشن جی نے کہا سوامی جی دو منٹ ہو چکے ہیں، تشریف لے چلئے کیوں کہ دوسرے اصحاب منتظر ہیں۔ سوامی جی کمرے سے باہر نکل آئے اور واپس دفتر ''ریاست'' میں پہنچے مگر بہت غمناک تھے۔ میں نے پوچھا سوامی جی کیا بات ہے، آج رنجیدہ کیوں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ مہاتما گاندھی سے مل کر آیا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ وہاں کیا ہوا؟ میرے سوال پر آپ نے جو جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے آپ نے فرمایا۔

''میں مہاتما گاندھی کے سامنے پیش کیا گیا اور اپنی درخواست بھی دی۔ انہوں نے درخواست پڑھی مگر کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی پاگل ہیں اور ان کا دماغی توازن قایم

نہیں رہا، ورنہ کچھ تو جواب دیتے۔''

سوامی جی کا یہ جواب سن کر میں نے اپنے دل میں تو یہی کہا کہ انسان جیسا ہو دوسرا بھی اس کو ویسا ہی نظر آتا ہے۔ سوامی جی پاگل ہیں تو اب ان کو مہاتما جی بھی پاگل نظر آتے ہیں مگر ان سے میں نے کہا سوامی جی کوئی خیال نہ کیجئے، مہاتما جی مصروف ہوں گے، اس لیے فی الحال کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر غور کرنے کے بعد جواب بذریعہ ڈاک بھیج دیں گے۔ میرے اس کہنے پر سوامی جی کا غم وغصہ کم ہوا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ ایک درجن کے قریب دوست بیٹھے تھے جن میں زیادہ تعداد شعراء اور اخبار نویس حضرات کی تھی۔ سوامی جی بھی گانجا پینے کے بعد تشریف فرما تھے اور ان کا ''روحانی'' فیض جاری تھا۔ سوامی نے فرمایا کہ دنیا کے تمام سنیما بند کر دیئے جانے چاہئیں۔ یہ فضول خرچی ہے اور صرف ایک سنیما زمین اور آسمان کے درمیان قائم کیا جائے جسے ہر ملک دیکھ سکے۔ یہ طریقہ تمام ممالک کی اقتصادیات میں بحث کا باعث ہوگا۔ سننے والے تمام اصحاب نے اس تجویز کی تعریف کی اور ایک صاحب نے کہا کہ سوامی جی نہ صرف ایگریکلچر، دفینہ اور روحانیت میں ماہر ہیں بلکہ اقتصادیات میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ سن کر سوامی جی مسکرائے، گویا کہ وہ اپنے ماہر اقتصادیات ہونے پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی تشریف لے آئے۔ جوشؔ صاحب نے بھی جب ''انٹرنیشنل سنیما'' کی اس سکیم کو سنا تو آپ نے بہت تعریف کی۔ اس کے بعد میں نے جوشؔ صاحب سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو میں سوامی جی سے درخواست کر سکتا ہوں کہ سوامی جی آپ کو اپنا شاگرد بنالیں۔ جوشؔ صاحب نے کہا کہ ان کے لیے اس سے زیادہ عزت کا باعث اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جوشؔ صاحب نے اپنی جیب سے دو روپے نکال کر سوامی جی کی نذر کیے اور جوش صاحب کو شاگرد بنانے کی رسم ادا کی گئی۔ اب سوامی جی دہلی میں کسی سے ملیں یا دہلی سے باہر، تو باتوں باتوں میں جوشؔ صاحب کے شاگرد ہونے کا ذکر ضرور کرتے ہیں کیونکہ جب جوشؔ صاحب نے بطور شاگرد دو روپے نذر کیے تو پھر وہ لوگوں سے اپنے استاد ہونے کا ذکر کیوں نہ کریں اس کے علاوہ یہ مان لیا گیا کہ جوشؔ صاحب اس وقت اردو اور فارسی کے بے مثل اور انقلاب پسند شاعر ہیں مگر روحانیت کے مراحل تو انہوں نے طے نہیں کیے۔ ایک روز سوامی جی کا دربار دفتر ''ریاست'' میں لگا ہوا تھا اور چند اخبار نویس اور شاعر حضرات تشریف فرما تھے کہ آل انڈیا ریڈیو کے مسٹر مضطر ہاشمی تشریف لے آئے۔ میں نے مضطر صاحب سے کہا کہ مضطر صاحب اگر آپ

ریڈیو پر سوامی جی کی تقریر کرائیں تو نہ صرف آل انڈیا ریڈیو بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا پر بھی احسان ہوگا۔ اور یہ تقریر دفتر ''ریاست'' سے نشر کی جائے۔ اگلے روز سوامی جی کی تقریر ''نشر'' کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ چالیس کے قریب دوست جمع ہوئے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' کے پاس ورزش کرنے کی ایک مشین ہے جس میں بجلی کا ایک موٹر لگا ہے اور یہ بجلی سے گھومتی ہے۔ سوامی جی نے اس مشین کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ مشین سوامی سے پوشیدہ طور پر گودام میں سے نکلوا کر اوپر منگائی گئی۔ سوامی جی کو اس مشین کے سامنے یہ کہہ کر بیٹھا دیا گیا کہ یہ براڈ کاسٹنگ مشین ہے۔ سوامی جی سنجیدہ صورت میں مشین کے سامنے بیٹھ گئے اور مشین کی موٹر چلا دی گئی۔ سوامی جی کو براڈ کاسٹنگ کے لیے ہدایت دینے کا کام لالہ اسیر چند کھنہ اور مضطر صاحب کے سپرد تھا۔ اس مشین میں ایک لیمپ لگا دیا گیا اور سوامی جی سے کہا گیا کہ وہ لیمپ کے قریب ہو کر تقریر کریں اور اپنی تقریر میں الہ آباد والی اپنی محبوبہ کو بھی جو پیغام دینا ہو دے لیں۔ چنانچہ پندرہ منٹ کے قریب سوامی جی نے تقریر کی اور جب سوامی جی نے اپنی محبوبہ کے نام پیغام دیا تو سوامی جی کچھ کانپ رہے تھے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ تقریر ختم ہونے سے پہلے یہ انتظام کر لیا گیا تھا کہ جو دوسرے دوست سوامی جی سے دفتر ''ریاست'' سے باہر ملیں تو اس تقریر کی تعریف کریں۔ چنانچہ اس تقریر کے بعد سوامی جی دفتر ''ریاست'' سے بازار میں گئے تو وہاں ایک صاحب نے کہا کہ سوامی جی آج تو آپ کی ریڈیو والی تقریر بہت دلچسپ اور عالمانہ تھی۔ پھر آپ اردو بازار میں گئے تو وہاں یار لوگوں نے کہا کہ سوامی جی آج تو آپ نے تقریر میں کمال کر دیا۔ اس کے بعد آپ محلہ سوئی والان میں گئے تو وہاں ایک صاحب نے کہا کہ سوامی جی آپ کی تقریر بہت دلچسپ اور عالمانہ تھی۔ اس کے علاوہ اگلے روز پانچ چھ خطوط لکھے گئے جن کے اوپر مختلف شہروں مثلاً لکھنؤ، جھانسی، مرادآباد اور الہ آباد وغیرہ کے نام تھے اور یہ تمام سوامی جی کے نام لکھے گئے تھے۔ ان میں مختلف لوگوں کی طرف سے لکھا گیا کہ یہاں آپ کی ریڈیو والی تقریر کو بہت پسند کیا گیا۔ چنانچہ ان خطوط میں ایک خط ہندی میں ایک خاتون کی طرف سے بھی تھا جس میں تقریر کی تعریف کے ساتھ اظہارِ عشق بھی کیا گیا تھا۔ اس خاتون کا یہ خط سوامی جی کے پاس اب تک موجود ہے اور آپ اس خط کا ذکر اکثر کیا کرتے ہیں۔ یہ تمام خطوط ریلوے ٹرین میں پوسٹ کئے گئے تاکہ سوامی جی کو ڈاکخانے کی مہر سے پتہ نہ چل سکے کہ یہ دہلی سے ہی پوسٹ کئے گئے ہیں۔

ایک دن ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ سوامی جی کی، ان کی ''محبوبہ'' سے ٹیلیفون پر ملاقات کرائی

جائے۔ چنانچہ سوامی جی سے ان شری متی جی کے نام خط لکھوایا گیا کہ آپ آئندہ اتوار کو شام کے چھ بجے ٹرنک ٹیلیفون پر سوامی جی سے بات کرلیں۔ سوامی جی بہت مضطرب ہیں۔ یہ خط سوامی جی سے لے کر اور اس پر ٹکٹ لگا کر چپڑاسی کو دیا گیا کہ یہ فوراً پوسٹ کر دیا جائے مگر اس کے کان میں یہ کہہ دیا گیا کہ خط پوسٹ نہ کیا جائے، اسے پھاڑ دیا جائے۔ ادھر میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ ان کی بیوی ٹیلی فون پر سوامی جی سے اتوار کی شام کو چھ بجے بات کریں اور یہ بتائیں کہ الہٰ باد سے ان کی محبوبہ بات کر رہی ہیں۔ چنانچہ اتوار کی شام کو چھ بجے سے پہلے ہی سوامی جی ٹیلیفون کے انتظار میں اوپر تشریف لے آئے۔ چھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ جب ٹیلیفون اٹھایا تو میرے اس دوست نے اپنی بیوی سے بات کرانے سے پہلے کہا۔ الہ آباد سے ٹیلیفون آیا ہے، سوامی پارس ناتھ جی ہیں؟ میں نے فوراً گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے سوامی جی کو آواز دی۔ سوامی جی جلدی آیئے، الہ آباد سے ٹیلیفون آیا ہے۔ جب سوامی جی نے ٹیلیفون کا رسیور کان پر لگایا تو میرے اس دوست نے اپنی مردانہ آواز میں پوچھا۔ سوامی پارس ناتھ ہیں۔ سوامی جی نے کہا کہ ہاں میں سوامی پارس ناتھ بول رہا ہوں۔ اس پر میرے دوست نے کہا کہ الہٰ آباد سے بات کرو۔ سوامی جی اس وقت رسیور ہاتھوں میں تھامے لرز رہے تھے۔ ان کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میرے دوست کی بیوی اور سوامی جی کے درمیان ٹیلی فون پر یہ باتیں ہوئیں۔

سوامی جی ہیں؟

جی ہاں، میں سوامی پارس ناتھ بول رہا ہوں۔

سوامی جی آپ کے خطوط پہنچتے رہتے ہیں۔ مگر یہ کمبخت میرے گھر کے لوگ میری نگرانی کرتے ہیں، اس لیے میں جواب نہیں دے سکتی اب بھی بہت مشکل کے ساتھ یہ ٹیلی فون ایک دوسری جگہ سے کر رہی ہوں۔

آپ دہلی کیوں نہیں آجاتیں؟ میں آج کل دہلی میں رہتا ہوں۔

آپ ہندوستان کے پریذیڈنٹ ہوجائیں تو میں فوراً آپ کے پاس آجاؤں گی۔

میں پریذیڈنٹ تو بعد میں ہوجاؤں گا، آپ ضرور آجایئے۔

اُونہہ، آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں، کیا جلدی ہے، میں آجاؤں گی۔

اتنی بات ہوئی تھی کہ میرے دوست جو اپنی بیوی سے ٹیلی فون پر بات کر رہے تھے، نے فوراً کہا ''تین منٹ ہو چکے ہیں، بات ختم کرو۔''

سوامی جی ٹیلی فون سننے کے بعد بار بار کہتے رہے ''اُونہہ آپ تو ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں'' کیا میٹھی زبان تھی، جیسے امرت ہو، چنانچہ سوامی جی اب بھی اس ٹیلیفون کو اکثر یاد کیا کرتے ہیں اور ایک خاص انداز میں کہا کرتے ہیں۔ ''اُونہہ، آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں''۔

جب سوامی جی کا براڈ کاسٹنگ اور ٹیلی فون ہو چکا تو اردو بازار کی قومی درگاہ یعنی مولانا سمیع اللہ کی کتابوں کی دوکان (مولانا سمیع اللہ مرحوم مفتی کفایت اللہ کے داماد ہیں۔ آپ جیسا مخلص اور مہمان نواز بھی شاید دہلی میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ صبح سے شام تک آپ کی دکان پر علم دوست، اخبار نویس، شعراء اور ممبران پارلیمنٹ و اسمبلی وغیرہ آتے رہتے ہیں۔ اشعار پڑھے جاتے ہیں اور علم و سیاست پر بحث ہوتی ہے اور مولوی صاحب کو چاہے دو روپے کی کتاب ایک روپے میں پڑوسیوں کو دینی پڑے، آپ ان سب کی چائے سے تواضع کرتے ہیں) پر کسی نے سوامی جی سے کہہ دیا کہ براڈ کاسٹنگ اور ٹیلیفون وغیرہ دیوان سنگھ کی شرارت ہے ورنہ نہ براڈ کاسٹنگ ہوا نہ الٰہ آباد سے ٹیلی فون آیا۔ سوامی جی نے جب یہ سنا تو ان کو شک ہوا کہ شاید یہ تمام ''جعلسازی'' ہی ہو۔ سوامی جی تشریف لائے تو بہت خفا اور مغموم تھے۔ میں نے پوچھا سوامی جی کیا بات ہے، آج جی تو اچھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ دیکھو سچ بتاؤ، یہ ٹیلیفون اور براڈ کاسٹنگ جعلسازی تھی یا کہ دراصل ٹیلیفون اور براڈ کاسٹنگ ہوا۔ کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جعلسازی تھی۔ میں نے جب سوامی جی سے سنا تو میں نے بہت غصہ کی حالت میں کہا ''سوامی جی آپ دوسروں کو بے ایمان سمجھتے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ نے میری خدمات کی قدر نہ کی۔ ہم لوگ آپ کے لیے کوشش کرتے کرتے مر گئے اور پچیس سال کے بچھڑوں کو ٹیلی فون پر ملوا دیا مگر ان خدمات کا معاوضہ آج یہ مل رہا ہے کہ مجھے آپ بے ایمان اور جھوٹا سمجھتے ہیں''۔ سوامی جی کو جب میں نے ڈانٹا تو سوامی جی نے کہا کہ وہ تو یقین کرتے ہیں کہ براڈ کاسٹنگ بھی ہوا ٹیلی فون بھی، کیوں کہ براڈ کاسٹنگ کے متعلق دہلی کے باہر کے شہروں سے بھی خطوط آئے اور ٹیلی فون میں ''اونہہ، آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں'' کون کہہ سکتا تھا؟ مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب جعلسازی تھی۔ جب سوامی جی میرے غصے کے باعث ٹھنڈے ہوئے تو میں پھر نرم ہو گیا اور میں نے اپنے غصے کے متعلق سوامی جی سے معافی طلب کی اور سوامی جی سے

حلف لیا کہ ان کو میرے اخلاص اور میری خدمات وسچائی کے متعلق کوئی شک نہیں۔

سوامی جی چند سال ہوئے دہلی سے بریلی چلے گئے کیونکہ وہاں کے رادھے شام پریس والوں نے ان کو ہندی کی ایک تصنیف کے سلسلے میں وہاں بلالیا۔ بریلی میں سوامی جی نے وہاں کے لوگوں سے براڈ کاسٹنگ اور الٰہ آباد کے ٹرنک ٹیلیفون کا ذکر کیا تو ان لوگوں نے بھی سوامی جی سے کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ نہ براڈ کاسٹنگ ہوا اور نہ ٹیلیفون۔ آپ لوگوں کے کہنے سے پھر متاثر ہوگئے۔ اور آپ نے مجھے ایک خط لکھا کہ میں جھوٹا اور بے ایمان ہوں۔ نہ براڈ کاسٹنگ ہوا اور نہ ٹیلی فون اور میں نے سوامی جی کو بے وقوف بنایا۔ سوامی جی کا جب یہ خط مجھے ملا تو مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سوامی جی کو رجسٹر ڈ نوٹس دیا۔ کہ آپ نے مجھے جھوٹا اور بے ایمان لکھ کر میری توہین کی ہے۔ آپ پانچ ہزار روپے بطور ہرجانہ ادا کرو ورنہ آپ پر فوجداری اور دیوانی دعویٰ دائر کر دیا جائے گا۔ میرا یہ نوٹس جب سوامی جی کے پاس پہنچا تو آپ بہت گھبرائے اور آپ نے خط لکھا کہ آپ تو فقیر ہیں، آپ کے پاس ہرجانہ دینے کے لیے پانچ ہزار روپے کہاں ہیں۔ مگر آپ صدق دلی کے ساتھ معافی چاہتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ ایڈیٹر "ریاست" سچا اور ایمان دار آدمی ہے۔ اس جواب کے بعد سوامی جی کے ساتھ پھر خط وکتابت شروع ہوگئی اور سوامی جی نے "ریاست" کے "جذباتِ مشرق" کے کالم کے لیے پھر ہندی کے دوہے ہندی کی کتابوں سے منتخب اور ترجمہ کر کے بھیجنے شروع کر دئے اور ہماری صلح ہوگئی مگر سوامی جی کو براڈ کاسٹنگ اور ٹرنک ٹیلیفون کے متعلق کچھ شک سا رہا۔ سوامی جی بریلی کے کام سے فارغ ہو کر دہلی آ گئے تو پہلے کی طرح آپ نے دفتر "ریاست" میں رہائش اختیار نہ کی بلکہ آپ نے جمنا کے پار ایک گاؤں میں قیام کرلیا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ آپ مجھ پر ناراض ہیں۔ چنانچہ ایک دن میں نے ایک دوست کی ڈیوٹی لگائی کہ سوامی جی کو دفتر "ریاست" میں لایا جائے۔ یہ دوست سوامی جی کو لے آئے تو ان کے آتے ہی میں نے سب سے پہلے ان کے پاؤں چھوئے اور اس کے بعد شکوے شکایت کے دفتر کھول دیئے کہ آپ مجھ سیوک کو بھول گئے، آپ نے میری خدمات فراموش کر دیں، آپ کا خون سفید ہوگیا ہے، آپ کی صورت دیکھنے کو میں ترس گیا۔ اور مجھ جیسے مخلص دوستوں کو تو بھولنا نہ چاہئے تھا، وغیرہ۔ سوامی جی میری ان التجاؤں سے بہت متاثر ہوئے تو میں ان سے لپٹ گیا اور کہا کہ تب تک نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آپ کا دل میرے متعلق صاف نہ ہو جائے، چنانچہ سوامی جی نے نہ صرف اس کا اقرار کیا بلکہ قسم کھائی کہ ان کا

دل بالکل صاف ہے اور وہ ایڈیٹر ''ریاست'' کو سچا، ایماندار اور مخلص اور خیر خواہ سمجھتے ہیں۔ اس ڈرامے کے بعد سوامی جی نے وعدہ کیا کہ آپ کبھی کبھی دفتر ''ریاست'' میں درشن دیتے رہا کریں گے، اور اب آپ نے ہفتہ عشرہ کے بعد پھر آنا شروع کر دیا ہے جس کے لیے ایڈیٹر ''ریاست'' آپ کا شکر گزار اور احسان مند ہے کیوں کہ ایسے صاف دل، معصوم، مخلص اور محبت کے ''روحانی بزرگ'' کہاں؟

اس مضمون سے پاکستان کے رہنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر پاکستان نے گجرات (پنجاب) کے مام دین کو پیدا کیا تو ہندوستان میں بھی ایک ہندو مام دین یعنی سوامی پارس ناتھ موجود ہیں جو پاکستان کے مام دین کا علم شاعری اور ''روحانیت'' وغیرہ سب اعتبار سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آہ! افسوس کہ پاکستان کا مام دین انتقال کر گیا۔ خدا ہندوستان کے مام دین کو رہتی دنیا تک یا کم از کم اس زمانے تک جب تک کہ ایڈیٹر ''ریاست'' زندہ ہے سلامت رکھے۔ آمین۔

سعادت حسن منٹو

مُرلی کی دُھن

اپریل کی تئیس یا چوبیس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیرِ علاج تھا کہ شیام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دنوں ایک عجیب وغریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوش مندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہوگئی تھیں کہ میں خود کو ''نومینز لینڈ'' میں بھٹکتا محسوس کرتا تھا۔

شیام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظروں سے گزری تو میں نے سمجھا یہ سب ترکِ شراب کی کارستانی ہے۔ جس نے میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر رکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کئی عزیزوں کی موتیں میرے لیے واقع ہو چکی تھیں۔ اور نیم ہوشمندی کے وقت مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں اور میری صحت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے یہ خبر پڑھی تو ساتھ والے کمرے کے پاگل سے کہا، ''جانتے ہو۔۔۔ میرا ایک نہایت ہی عزیز دوست مر گیا ہے''۔

اس نے پوچھا، ''کون؟''

میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا "شیام"

"کہاں؟ یہاں پاگل خانے میں؟"

میں نے جواب کوئی نہ دیا اوپر تلے کئی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں اُبھریں۔ جن میں شیام تھا۔ مسکراتا شیام، ہنستا شیام، شور مچاتا شیام، زندگی سے بھرپور شیام، موت اور اس کی ہولناکیوں سے قطعاً ناآشنا شیام، میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھا ہے بالکل غلط ہے۔ اخبار کا وجود میرے دماغ کی اختراع ہے۔

آہستہ آہستہ الکحل کی دھند دماغ سے ہٹنے لگی اور میں تمام واقعات کو ان کے صحیح خدوخال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سست رفتار تھا کہ جب میں شیام کی موت کے حادثے سے دوچار ہوا تو مجھے زبردست دھکا نہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ عرصہ ہوا مر چکا تھا اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے پہنچ چکا تھا۔ اب صرف اس کے آثار باقی تھے، صرف ملبہ رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ جس کی میں کھدائی کر رہا تھا شکستہ اینٹوں کے ڈھیر میں کہیں شیام کی مسکراہٹ دبی ہوئی مل جاتی تھی۔ کہیں اس کا بانکا قہقہہ۔

پاگل خانے سے باہر فرزانوں کی دنیا میں یہ مشہور تھا کہ سعادت حسن منٹو شیام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا شیام کی موت کی خبر سن کے مجھے زیادہ ہوش مند ہو جانا چاہیئے تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس میرے دل و دماغ میں زیادہ شدید ہو جانا چاہیئے تھا۔ اور انتقامی جذبے کے تحت اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنے کا عزم میرے اندر پیدا ہو جانا چاہیئے تھا۔ شیام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو جانا محض پاگل پن تھا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

رسوم و قیود کے بتوں کو توڑنے والے شیام کی موت پر پاگل ہو جانا اس کی بہت بڑی توہین تھی۔

شیام زندہ ہے اپنے دو بچوں میں جو اس کی بےلوث محبت کا نتیجہ ہیں، تاجی (ممتاز) میں جو بقول اس کے اس کی کمزوری تھی اور ان تمام عورتوں میں جن کی اوڑھنیوں کے آنچل اس کے محبت بھرے دل پر گاہے گاہے سایہ کرتے رہے اور میرے دل میں جو صرف اس لیئے سوگوار ہے کہ وہ اس کی موت کے سرہانے یہ نعرہ بلند نہ کر سکا "شیام زندہ باد"!

مجھے یقین ہے موت کے ہونٹوں کو بڑے خلوص سے چومتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز

میں کہا ہوتا۔ ''منٹو۔۔۔خدا کی قسم ان ہونٹوں کا مزا کچھ اور ہی ہے۔''

میں جب بھی شیام کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے مشہور روسی ناول نویس آرتزبی شیف کا ہیرو سنیائن یاد آ جاتا ہے۔ شیام عاشق تھا، عشق پیشہ نہیں تھا۔ وہ ہر خوبصورت چیز پر مرتا تھا۔۔۔میرا خیال ہے کہ موت ضرور خوب صورت ہوگی، ورنہ وہ کبھی نہ مرتا۔

اس کو تپش اور حدت سے پیار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شیام ٹھنڈے ہاتھوں کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیئے ہوتے۔۔۔''ہٹو بڑی بی۔۔۔تم میں خلوص نہیں ہے۔''

مجھے ایک خط میں لکھتا ہے۔

قصہ یہ ہے جان من! کہ یہاں ہر ایک ''ہپ ٹلا'' ہے لیکن اصلی ''ہپ ٹلا'' یہاں سے بہت دُور لیکن میری پوچھتے ہو تو بھی کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حرف شکایت لب پر لاؤں۔ زندگی خوب گزر رہی ہے۔ رندی وے نوشی! اے نوشی و رندی! ساتھ ساتھ چل رہی ہے تاجی (ممتاز) چھ مہینے کے عرصے کے بعد واپس آ گئی ہے وہ ابھی تک میری ایک بڑی زبردست کمزوری ہے اور تم جانتے ہو عورت کی محبت کی گرمی کی راحت محسوس کرنا کتنی فرحت انگیز چیز ہے!۔۔۔آخر میں انسان ہوں ایک نورمل انسان۔

نگار (نگار سلطانہ) کبھی کبھی ملتی ہے۔ لیکن اولین حق ''ت'' کا ہے۔

شاموں کو تمہاری ''داشمندنہ بکواس'' اکثر یاد آتی ہے۔

شیام نے اس خط میں ایک لفظ ''ہپ ٹلا'' استعمال کیا ہے اس کی تشریح چونکہ خالی از دلچسپی نہیں۔ اس لیئے آپ بھی سن لیجیئے۔

میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ ان دنوں کمال امروہی کی فلمی کہانی ''حویلی'' (جو ''محل'' کے نام سے فلمائی گئی) کی تشکیل و تکمیل ہو رہی تھی۔ اشوک، واچا، حسرت (لکھنوی) اور میں سب ہر روز بحث و تمحیص میں شامل ہوتے تھے۔ ان نشستوں میں کام کے علاوہ کبھی کبھی خوب زوروں پر گپ بھی چلتی تھی۔ ایک دوسرے سے مذاق ہوتے شیام کو جب فلم ''مجبور'' کی شوٹنگ سے فراغت ہوتی تو وہ بھی ہماری محفل میں شریک ہو جاتا۔

کمال امروہی کو عام گفتگو میں بھی ٹھیٹ قسم کے ادبی الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے۔ میرے لیے یہ ایک مصیبت ہو گئی تھی۔ اس لیے اگر میں عام فہم انداز میں کہانی کے متعلق اپنا کوئی نیا خیال پیش کرتا

تو اس کا اثر کمال پر پوری طرح نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اگر میں زوردار الفاظ میں اپنا عندیہ بیان کرتا تو اشوک اور واچا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ چنانچہ میں ایک عجیب قسم کی ملی جلی زبان استعمال کرنے لگا۔

ایک روز صبح گھر سے بمبئی ٹاکیز آتے ہوئے میں نے ٹرین میں اخبار کا اسپورٹس کالم کھولا۔ بڑے برن اسٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہو رہے تھے ایک کھلاڑی کا نام کچھ عجیب و غریب تھا،'' ہپ ٹلا''۔۔۔ ایچ، ای، پی، ٹی، یو، ایل، ایل، ایچ، اے۔۔۔ ہپ ٹلا۔۔۔ میں نے بہت سوچا کہ آخر یہ کیا ہو سکتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شاید ہیبت اللہ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔

اسٹوڈیو پہنچا تو کمال کی کہانی کی فلمی تشکیل کا کام شروع ہوا۔ کمال نے اپنے مخصوص ادیبانہ اور اثر پیدا کرنے والے انداز میں کہانی کا ایک باب سنایا۔ مجھ سے اشوک نے رائے طلب کی'' کیوں منٹو۔''

معلوم نہیں کیوں میرے منہ سے نکلا۔ ٹھیک ہے۔۔۔ مگر ہپ ٹلا نہیں! بات کچھ بن ہی گئی۔ ہپ ٹلا۔ میرا مطلب بیان کر گیا میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سیکونس زوردار نہیں ہے۔ کچھ عرصے کے بعد حسرت نے اسی باب کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا۔ میری رائے پوچھی گئی تو میں نے اب کی دفعہ ارادی طور پر کہا۔ بھئی حسرت بات نہیں بنی۔۔۔ کوئی ہپ ٹلا چیز پیش کرو۔ ہپ ٹلا۔

دوسری مرتبہ، ہپ ٹلا کہہ کر میں نے سب کی طرف ردِ عمل معلوم کرنے کے لیے دیکھا۔ یہ لفظ اب معنی اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں بلا تکلف میں نے اسے استعمال کیا۔ ہپ ٹیلیٹی نہیں۔ ہپ ٹولائز کرنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ لیکن اچانک ایک بار اشوک مجھ سے مخاطب ہوا'' ہپ ٹلا کا اصل مطلب کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے!''

شیام اس وقت موجود تھا جب اشوک نے مجھ سے سوال کیا۔ اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ٹرین میں وہ میرے ساتھ تھا۔ جب میں نے کرکٹ کے کھلاڑی کے اس عجیب و غریب نام کی طرف اس کو متوجہ کیا تھا، ہنس ہنس کر دوہرا ہوتے ہوئے اس نے سب کو بتایا کہ یہ منٹو کی نئی منٹویت ہے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو ہپ ٹلا کو کھینچ کر فلمی دنیا میں لے آیا مگر کھینچا تانی کے بغیر یہ لفظ بمبئے کے فلمی حلقوں میں رائج ہو گیا۔

۴۸/ ۷/ ۲۹ کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے۔

پیارے منٹو! اب کی دفعہ تم پھر خاموش ہو، تمہاری یہ خاموشی مجھے بہت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں تمہارے دماغی تساہل سے بخوبی واقف ہوں۔ میں غصے سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

جب کہ تم یکلخت چپ سادھ لیتے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ میں بھی کوئی بہت بڑا خط باز نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسے خط لکھنے اور وصول کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے جو ذرا الگ قسم کے ہوں۔۔۔ یعنی ہپ ٹلا۔

لیکن ہپ ٹلا یہاں بہت ہی نایاب چیز ہو گئی ہے۔۔۔

اسے کاغذ پر لکھو تو کم بخت ''ہپ ٹلی'' بن جاتی ہے اور اگر یہ ہپ ٹلی بھی دستیاب نہ ہو تو بتاؤ کتنی کوفت ہوتی ہے۔ معاف کرنا۔ اگر میں نے پچولائز کرنا شروع کر دیا ہو......

لیکن کیا کروں۔ جب حقیقتیں گم ہو جائیں تو انسان پچولیٹ ہی کرتا ہے مگر مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ تم کیا کہو گے کیا نہیں کہو گے۔ میں اتنا جانتا ہوں۔ اور تمہیں اس کا علم ہوگا کہ تم ایسے بڑے ہپ ٹلا کو اس میدان میں شکست دینے کا سہرا صرف میرے ہی سر ہے۔

منٹو! کسی نے کہا ہے جب عاشق کے پاس لفظ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ چومنا شروع کر دیتا ہے اور جب کسی مقرر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ کھانسنے لگتا ہے۔ میں اس کہاوت میں ایک اور چیز شامل کرتا ہوں جب مرد کی مردانگی ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے لیکن تم فکر مند نہ ہونا میں اس آخری منزل سے کچھ دور ہوں۔ زندگی بہت مصروف اور بھرپور ہے۔ اور بھرپور زندگی میں تم جانتے ہو دیوانگی کے لیے بہت کم فرصت ملتی ہے حالانکہ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نسیم والا فلم (چاندنی رات) قریب قریب نصف مکمل ہو چکا ہے۔ امرناتھ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں۔ ذرا سوچو تو میری ہیروئن کون ہے؟۔۔۔ نگار (نگار سلطانہ) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا۔ محض یہ معلوم کرنے کے لیے کہ پردے پر ان پرانے جذبات کا اعادہ کیسے لگتا ہے جو کبھی کسی سے حقیقت کی دنیا میں متعلق رہے ہیں۔ پہلے مسرت تھی اب محض کاروبار۔ لیکن کیا خیال ہے تمہارا۔ یہ سلسلہ جوش آفریں نہیں رہے گا۔

تاجی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی اچھی ہے اور اس کا سلوک بے حد نرم و نازک، پچھلے دنوں سے رمولا بھی یہاں بمبئی میں ہے۔ اس سے ملاقات کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اس کے دل و دماغ میں میری طرف سے موجود ہے مغلوب نہیں کر سکی۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی سیر و تفریح رہی۔

اولڈ بوائے میں ان دنوں ''فلرٹیشن'' کے فن میں اڈوانس ٹریننگ لے رہا ہوں۔ مگر دوست یہ سارا سلسلہ بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بہر حال میں پیچیدگیاں پسند کرتا ہوں۔

وہ میرے اندر جو قسمت آزما، مہم جو اور آوارہ گرد ہے ابھی تک کافی طاقتور ہے۔ میں کسی مخصوص جگہ کا نہیں اور نہ کسی مخصوص جگہ کا ہونا چاہتا ہوں۔ میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور ان سے نفرت کرتا ہوں۔ زندگی یوں ہی گزر رہی ہے۔ دراصل زندگی ہی ایک ایسی معشوقہ ہے جس سے مجھے محبت ہے لوگ جائیں جہنم میں!

مجھے مصنف کا نام بھول گیا ہے۔ مگر اس کا ایک جملہ یاد رہ گیا ہے۔ شاید وہ بھی درست نہ ہو۔ مگر مفہوم کچھ اسی قسم کا تھا۔۔۔ ''وہ لوگوں سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ (خود کو محبت کرنے میں) کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس طور پر ان سے نفرت کرتا تھا کہ (نفرت کرنے میں خود) کو یکہ و تنہا محسوس کرتا تھا۔'' میں اس میں اور کوئی فقرہ شامل نہیں کر سکتا۔

ان دو خطوں میں تاجی کا ذکر آیا خطوط وحدانی میں اتنا تو میں بتا چکا ہوں کہ یہ ممتاز کی تصغیر ہے۔ ممتاز کون ہے یہ خود شیام بتا چکا ہے کہ وہ اس کی کمزوری ہے۔ سچ پوچھئے تو نگار، رمولا سب اس کی کمزوریاں تھیں۔ عورت دراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور یہی اس کے کردار کا مضبوط ترین پہلو تھا۔

ممتاز، زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن ہے۔ زیب کے ساتھ بمبئے گئی تو ظہور راجہ کے بھاری بھرکم عشق میں پھنس گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اپنا دامن چھڑا کر لاہور آئی تو شیام کے ساتھ رومانس شروع ہو گیا۔ بمبئے میں جب شیام کی حالت درست ہوئی تو اس نے اپنے ہونے والے بچوں کی خاطر اس سے شادی کر لی۔

شیام کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت بچوں سے خواہ وہ حد درجہ بدتمیز ہی کیوں نہ ہوں۔ طہارت و نفاست پسند طبقوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بدتمیز تھا۔ بعض عورتیں تو اس سے اس کی بدتمیزی کی وجہ سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ مگر وہ بالکل بے پروا تھا۔ اس نے کبھی ان عورتوں کی خوشنودی کے لیے اپنی عادت سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا ''منٹو۔۔۔ میری باتیں سن کر یہ ناک بھوں چڑھانے والی سالیاں سب بنتی ہیں۔۔۔ میک اَپ کی دنیا میں رہتی ہیں۔''

لیکن بعض عورتیں اس کی بدتمیزیوں سے محبت بھی کرتی تھیں۔ کیوں کہ ان میں بستر کی بو نہیں ہوتی تھی۔ شیام ان سے کھلے مذاق کرتا وہ بھی اس سے ایسی باتیں کرتیں جو مہذب سوسائٹی میں قابل ستر پوش سمجھی جاتی تھیں۔۔۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچتیں، حلق سے قہقہے اُچھلتے۔ ہنستے ہنستے شیام کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دُور کونے میں طہارت پسندی نوکیلے کیلوں پر آسن جمائے اپنے

گناہ بخشوانے کی رائیگاں کوشش کر رہی ہے۔

شیام سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سے ملنے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ ویسے اب سوچتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے کہ بمبئی میں اس سے شروع شروع کی ملاقاتیں شاید لیڈی جمشید جی روڈ پر ہوئی تھیں۔ جہاں میری بہن رہتی تھی۔ "ہائی نسٹ" میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈائمنڈ رہتی تھی۔ اس کے ہاں شیام کا آنا جانا تھا۔ دو تین مرتبہ غالباً سیڑھیوں میں اس سے ملنا ہوا۔ یہ ملاقاتیں گو رسمی تھیں لیکن غایت درجہ بے تکلف تھیں۔ کیونکہ شیام نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا کہ ڈائمنڈ نام کی عورت جو مسز شیام کہلاتی ہے، درحقیقت اس کی بیوی نہیں لیکن تعلقات کی بنا پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ ازدواجی رشتے اور اس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لیکن جب ایک تکلیف کے سلسلے میں اسے ڈائمنڈ کو ہسپتال داخل کرانا پڑا تو اس نے رجسٹر میں اس کا نام مسز شیام ہی لکھوایا۔

بہت دیر بعد ڈائمنڈ کے شوہر نے مقدمے بازی کی۔ شیام کو بھی اس میں پھنسایا گیا۔ لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا اور ڈائمنڈ جو کہ اب فلمی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور وزنی جیبیں دیکھ چکی تھی۔ شیام کی زندگی سے نکل گئی مگر شیام اس کو اکثر یاد کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ پونے کے ایک باغ میں اس نے مجھے سیر کراتے ہوئے کہا۔ "منٹو۔۔۔ ڈائمنڈ گریٹ عورت تھی۔۔۔ خدا کی قسم جو عورت اسقاط حمل برداشت کر سکتی ہے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی صعوبت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔" لیکن فوراً ہی اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہ کیا بات ہے منٹو۔۔۔ عورت پھل پھول سے کیوں ڈرتی ہے۔ کیا اس لیے کہ یہ گناہ کا ہوتا ہے؛ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نوٹ اصلی یا جعلی ہو سکتا ہے ایک بچہ حلال کا یا حرام کا نہیں ہو سکتا۔ وہ جھٹکہ یا کلمہ پڑھ کر چھری پھیرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی پیدائش کا موجب تو عظیم الشان دیوانگی ہے۔ جس کے مرتکب سب سے پہلے باوا آدم اور اماں حوا ہوئے۔۔۔ آہ یہ دیوانگی!"

اور وہ دیر تک اپنی مختلف دیوانگیوں کی باتیں کرتا رہا۔

شیام بہت بلند بانگ تھا۔ اس کی ہر بات، اس کی ہر حرکت، اس کی ہر ادا اونچے سُروں میں ہوتی تھی۔ اعتدال کا وہ بالکل قائل نہیں تھا۔ محفل میں سنجیدگی و متانت کی ٹوپی پہن کر بیٹھنا اس کے نزدیک مسخرہ پن تھا۔ شغل مے نوشی کے دوران میں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا فلسفی بن جاتا تو اسے ناقابل

بیان کوفت ہوتی۔اس قدر جھنجھلا جاتا کہ بعض اوقات بوتل اور گلاس توڑ پھوڑ کر گالیاں دیتا محفل سے باہر چلا جاتا۔

پُونے کا ایک واقعہ ہے شیام اور مسعود پرویز دونوں زبیدہ کاٹیج میں رہتے تھے۔ایک کہانی فروخت کرنے کے سلسلے میں مجھے وہاں ٹھہرنا پڑا۔مسعود طبعاً خاموشی پسند ہے۔شراب پی کر وہ اور بھی زیادہ منجمد ہو جاتا۔ایک دن صبح سے رم کا دور شروع ہوا۔اس دوران میں کئی آئے اور بہک کر چلے گئے۔میں، مسعود اور شیام ڈٹے ہوئے تھے۔شیام بہت خوش تھا۔اس لیے کہ وہ بہکنے والوں سے مل کر جی بھر کے شور مچاتا رہا تھا۔مگر شام کے قریب اس کو دفعتہً محسوس ہوا کہ مسعود دن کی تمام ہاؤ ہو سے الگ تھلگ رہا ہے۔نشے سے چور آنکھوں کو سکیڑ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا" کیوں حضرت پرویز۔کیا آپ نے اپنا مرثیہ مکمل فرمالیا ہے"۔

مسعود حسب عادت مسکرادیا۔اتنے میں کرشن چندر آ گیا اور شیام مسعود کی منجمد مسکراہٹ کے پیدا کردہ اثر کو بھول گیا۔دو ایک دور چلے تو شیام نے کرشن سے مسعود کے" ناقابل برداشت انجماد" کا ذکر کیا۔کرشن کی زبان کا تالا کھولنے کے لیے دو پیگ کافی تھے۔چنانچہ مسعود سے مخاطب ہو کر اس نے لعن طعن شروع کر دی۔تم کیسے شاعر ہو پرویز۔صبح سے پی رہے ہو اور تم نے ابھی تک کوئی واہیات بات نہیں کی۔خدا کی قسم جو شاعر واہیات بکواس کرنا نہیں جانتا۔۔۔وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔مجھے حیرت ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔میرا خیال ہے تمہاری یہ شاعری یقیناً بکواس ہوگی۔اور تمہارا پی کر یوں کیسٹر آئل کی بوتل بن جانا تمہاری اصل شاعری ہے"۔

یہ سُن کر شیام اس قدر ہنسا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔جب کچھ دیر تک مسعود سے چھیڑ جاری رہی تو وہ اکسا، اُٹھ کر اس نے ہم سب کے گلاس خالی کر دیے اور کہا۔" چلو باہر چلیں"۔

ہم باہر نکلے۔مسعود کے کہنے پر سب نے اپنے جوتے اُتار کر جیبوں میں رکھ لیے اور دوڑنے لگے۔اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے پونہ کی سڑکیں سب سنسان تھیں۔میں، مسعود، شیام اور ایک اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔دیوانہ وار شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔بالکل بے مطلب! اپنی منزل سے ناآشنا۔

راستے میں کرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔وہ دوڑ سے پہلے ہم سے الگ ہو کر چلا گیا تھا۔دروازہ کھلوا

کر ہم نے اسے بہت پریشان کیا۔ اس کی ثمینہ خاتون ہمارا شور سُن کر دوسرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس سے کرشن اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ جس کے پیش نظر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور پھر سڑک پیائی شروع کردی۔

پونہ مندروں کا شہر ہے۔ ہر فرلانگ پر ایک نہ ایک مندر ضرور ہوتا ہے۔ مسعود نے ایک کا گھنٹہ بجایا۔ میں اور شیام سجدے میں چلے گئے اور شوشمبھو، شوشمبھو کہنے لگے۔ اس کے بعد جو بھی مندر آتا۔ ہم چاروں یہی عمل دہراتے اور خوب قہقہے لگاتے جب کوئی پجاری آنکھیں ملتا باہر نکلتا تو ہم خاموش ہو جاتے اور چپ چاپ چل پڑتے۔

اسی طرح تین بج گئے۔۔۔ ایک سڑک پر کھڑے ہو کر مسعود نے وہ مغلظات بکیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے میں نے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں سنا تھا، مگر جب وہ موٹی موٹی گالیاں اُگل رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کی زبان پر ٹھیک طور پر بیٹھتی نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زبیدہ کاٹیج پہنچے اور سو گئے۔ لیکن مسعود شاید جاگتا اور شعر کہتا رہا۔

مے نوشی کے معاملے میں بھی شیام اعتدال پسند نہیں تھا۔ وہ کھل کھیلنے کا قائل تھا۔ مگر اپنے سامنے میدان کی وسعت دیکھ لیتا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی کو اچھی طرح جانچ لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نکل نہ جائے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔ ''میں چوکے پسند کرتا ہوں۔ چھکے محض اتفاق سے لگ جاتے ہیں''۔

ایک چھکا ملاحظہ ہو:۔

تقسیم ہونے سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے۔ شیام، شاہد لطیف کے گھر سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کے دن تھے مگر مے نوشی بڑی باقاعدگی سے جاری تھی۔ ایک شام باتوں باتوں میں زیادہ پی گئے۔ راجہ مہدی علی خاں بھی اتفاق سے موجود تھا۔ کرفیو کا وقت ہوا تو اس نے جانے کی اجازت چاہی میں نے اسے کہا ''پاگل ہوئے ہو پکڑے جاؤ گے۔''

شیام نے اس سے ازراہِ مذاق کہا۔ ''یہیں سو جاؤ۔ آج کل تاجی یہاں نہیں ہے۔'' راجہ نے مسکرا کر جواب دیا مجھے نیند نہیں آئے گی۔ سپرنگ والے پلنگوں پر میں قطعاً سو نہیں سکتا۔

شیام نے ایک گلاس میں راجہ کے ڈیل ڈول کے مطابق برانڈی کا پیگ ڈالا۔ اور اس کو دے دیا ''یہ لو۔ اس سے نیند آجائے گی''۔

راجہ ایک جرعے میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ بہت دیر تک تاجی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جو شیام سے

ناراض ہوکر اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔۔۔ ہر آٹھویں دسویں روز نکمی نکمی باتوں پر دونوں میں چخ ہوجاتی تھی۔ میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ اس لیے کہ شیام کو یہ بالکل پسند نہیں تھا۔ ہم دونوں میں گویا دل ہی دل میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

تاجی یوں گئی تھی جیسے کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اور شیام نے بھی اسے یوں وداع کیا تھا جیسے وہ پھر کبھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوگا۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے دور بیٹھے تڑپتے رہتے تھے۔ شاموں کو تو شیام اکثر تاجی کے معاملے میں بہت جذباتی ہوجاتا تھا۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور رات بھر اس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم بخت نیند کا کچھ ایسا ماتا تھا کہ پلنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔

میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا اور دوسرا بیٹھنے کا، سونے والا کمرہ میں نے شیام اور تاجی کو دے دیا تھا۔ اور بیٹھنے والے کمرے میں گدا بچھا کر میں سوتا تھا۔ تاجی چونکہ موجود نہیں تھی۔ اس لیے اس کا پلنگ راجہ مہدی علی خاں کو مل گیا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ اس لیے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر سو گئے۔

حسب معمول پونے چھے کے قریب میری جاگ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بیوی ہے مگر وہ تو لاہور بیٹھی تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شیام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جلے ہوئے کپڑے کی بو ناک میں گھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا سگرٹ گرنے سے اس کا ایک حصہ جل گیا تھا۔ مگر اتنی دیر کے بعد اب بو آنے کا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں تو میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ محسوس کی اور ہلکے ہلکے دودھیا بادل بھی دیکھے۔۔۔ اُٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پلنگ جس پر شیام سویا کرتا تھا۔ سُلگ رہا ہے اور پاس ہی دوسرے پلنگ پر راجہ مہدی علی خاں اپنی توند نکالے بڑا خراٹے لے رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر پلنگ کے جلے ہوئے حصہ کا معائنہ کیا۔ میٹرس میں بڑی رکابی کے برابر سوراخ تھا۔ جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ بجھانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ پلنگ پانی میں تر بتر تھا۔ مگر معاملہ چونکہ روئی اور ناریل کے پھوس کا تھا۔ اس لیے آگ پوری طرح بجھی نہیں تھی اور برابر سُلگ رہی تھی۔ میں نے راجہ کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ کروٹ بدل کر اور زور سے خراٹے لینے لگا۔ ایک دم پلنگ کے سیاہ سوراخ سے ایک لال لال شعلہ باہر لپکا۔ میں فوراً غسل خانے

کی طرف بھاگا ایک بالٹی پانی کی اس سوراخ میں ڈالی اور جب پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ آگ بجھ گئی ہے تو راجہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس سے جب آتشزدگی کی واردات کے متعلق استفسار کیا تو اس نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب نمک مرچ لگا کر واقعات بیان کیے۔ تمہارا یہ شیام ہنومان مہاراج ہے۔ رات برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگاتے ہوئے میں سو گیا دو بجے کے قریب جب عجیب عجیب آوازیں آئیں تو میں جاگ پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیام ایک بہت بڑا ہنومان ہے۔ اس کی گچھے دار دم کے ساتھ مٹی کے تیل میں ڈوبی چندیاں بندھی ہیں اور ان میں آگ لگی ہے۔ شیام پلنگ پر زور زور سے اُچھل کود رہا ہے اور اپنی دم سے آگ لگا رہا ہے۔ جب آگ لگ گئی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں اور برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگا گیا۔ تہہ کے ساتھ لگ کر سونے ہی والا تھا کہ مجھے تمہارا خیال آیا ہے کہ غریب آدمی کا پلنگ ایسا نہ ہو کہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ اٹھا، شیام غائب تھا۔ دوسرے کمرے میں تمہیں حالات سے آگاہ کرنے کے لیے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیام اپنے اصلی روپ میں تمہارے ساتھ چمٹ کر لیٹا ہے۔ میں نے تمہیں جگانے کی کوشش کی۔ اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا لگا کر تمہیں پکارا، گھنٹے بجائے، ایٹم بم چلائے۔ مگر تم نہ اٹھے۔ آخر میں نے ہولے ہولے تمہارے کان میں کہا۔ خواجہ اٹھو۔ اسکاچ وسکی کی ایک پوری پیٹی آئی ہے۔ تم نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور پوچھا ''کہاں''۔۔۔ میں نے کہا ''ہوش میں آؤ'' سارا مکان جل رہا ہے۔ آگ لگ گئی ہے۔ آگ! تم نے کہا'' بکتے ہو'' میں نے کہا ''نہیں خواجہ، میں خواجہ خضر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آگ لگی ہے'' جب تمہیں میرے بیان پر یقین آ گیا تو تم آرام سے یہ کہتے ہوئے سو گئے۔'' فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دو'' تمہاری طرف سے مایوس ہو کر میں نے شیام کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ میری بات اس کے دماغ تک پہنچ سکے تو اس نے مجھ سے کہا'' تم بجھادو نا یار۔ کیوں تنگ کرتے ہو''۔۔۔ اور سو گیا۔۔۔ آگ آخر آگ ہے اور کا بجھانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس لیے میں فوراً اپنی ساری انسانیت مجتمع کر کے فائر بریگیڈ بن گیا اور وہ جگ جو میں نے تمہاری سالگرہ پر تحفے کے طور پر دیا تھا بھر کے آگ پر ڈال دیا۔۔۔ میرا کام چونکہ پورا ہو چکا تھا نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر سو گیا''۔

شیام جب پوری نیند سو کر اٹھا تو میں نے اور راجہ سے اس نے پوچھا کہ آگ کیسے لگی تھی۔ شیام کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بہت دیر غور وفکر کے بعد اس نے کہا'' میں آتشزدگی کی اس واردات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا''۔ مگر جب راجہ دوسرے کمرے سے شیام کی جلی ہوئی ریشمی قمیض اٹھا کر لایا تو شیام نے مجھ سے

کہا ''اب تفتیش کرنی ہی پڑے گی''۔

سب نے مل کر تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ شیام صاحب نے جو بنیان پہنا تھا۔ وہ بھی دو ایک جگہ سے جلا ہوا ہے۔ زیادہ گہرائیوں میں گئے تو دیکھا کہ ان کی چھاتی پر روپے روپے جتنے دو بڑے آبلے ہیں۔ چنانچہ شرلک ہومز نے اپنے دوست واٹسن سے کہا۔'' یہ بات قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آگ ضرور لگی تھی اور شیام صرف اس غرض سے کہ اس کے ہمسائے راجہ مہدی علی خان کو تکلیف نہ ہو۔ چپ چاپ اٹھ کر میرے پاس چلا آیا''۔

جب شیام نے تہذیب وتمدن کے مروجہ قوانین کے پیشِ نظر تاجی سے باقاعدہ شادی کی تو میرا خیال ہے، صرف ایک انتقامی جذبے کے تحت اس نے اتنی شاندار دعوت کی کہ دیر تک فلمی دنیا میں اس کے چرچے رہیں۔ اتنی شراب بہائی گئی کہ خم کے خم خالی ہوگئے۔ مگر افسوس کہ تہذیب تمدن کی ستر پوش چولی کے داغ دھل نہ سکے۔

شیام صرف بوتل اور عورت ہی کا رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجود ہیں وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اچھی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مرگئی تھی۔ مگر اس کی اپنی سوتیلی ماں سے بھی ویسی ہی محبت تھی جو حقیقی ماں سے ہوسکتی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد صرف اس کی اکیلی جان تھی جو اتنے بڑے کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک عرصے تک وہ انتہائی خلوص کے ساتھ دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اسے کئی غچے دیئے مگر وہ ہنستا رہا۔'' جان من ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تو میری بغل میں ہوگی''۔ اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر آہی گیا کہ دولت اور شہرت دونوں اس کی جیب میں تھیں۔

موت سے پہلے اس کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔ بمبئے کے مضافات میں ایک خوبصورت بنگلہ اس کی ملکیت تھا اور کبھی وہ دن تھے کہ اس کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہی ہنستا ہوا شیام تھا دولت وشہرت آئی تو اس نے ان کا یوں استقبال نہ کیا جس طرح لوگ ڈپٹی کمشنر کا کرتے ہیں۔ یہ دونوں محترمائیں اس کے پاس آئیں تو اس نے ان کو اپنی لوہے کی چارپائی پر بٹھالیا۔ اور پٹاخ پٹاخ بوسے داغ دیئے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے تو دونوں کی حالت پتلی تھی۔ فلم انڈسٹری ملک کی سیاسیات کی طرح ایک بڑے ہی نازک دور سے گزر رہی تھی۔ میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ اس کا وہاں ایک پکچر کا کنٹریکٹ تھا دس ہزار روپے میں۔ عرصے کی بیکاری کے بعد اس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر پیسے نہیں ملتے تھے۔ بہر حال ہم دونوں کا گذر کسی نہ کسی طور پر ہو جاتا تھا۔ میاں بیوی ہوتے تو ان میں روپے پیسے کے معاملے میں ضرور چخ ہوتی۔ مگر شیام اور مجھے کبھی محسوس تک نہ ہوا کہ ہم میں سے کون خرچ کر رہا ہے اور کتنا کر رہا ہے۔

ایک دن اسے بڑی کوششوں کے بعد موٹی سی رقم ملی (غالباً پانچ سو روپے تھے)۔ میری جیب خالی تھی۔ ہم ملاڈ سے گھر آرہے تھے راستے میں شیام کا یہ پروگرام بن گیا کہ وہ چرچ گیٹ کسی دوست سے ملنے جائے گا۔ میرا اسٹیشن آیا تو اس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گڈی نکالی آنکھیں بند کر کے اس کے دو حصے کیے اور مجھ سے کہا "جلدی کرو منٹو۔۔۔ ان میں سے ایک لے لو"۔

میں نے گڈی کا ایک حصہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ شیام نے مجھے "ٹاٹا" کہا اور کچھ نوٹ جیب سے نکال کر لہرائے "تم بھی کیا یاد رکھو گے۔ سیفٹی کی خاطر میں نے یہ نوٹ علیحدہ رکھ لیے تھے۔۔۔ ہپ ٹلا"

شام کو جب وہ اپنے دوست سے مل کر آیا۔ تو کباب ہو رہا تھا۔ مشہور "فلم اسٹار کے کے" نے اس کو بلایا تھا کہ وہ اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہے۔ شیام نے برانڈی کی بوتل بغل میں سے نکال کر اور گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈال کر مجھ سے کہا "پرائیویٹ بات یہ تھی۔۔۔ میں نے لاہور میں ایک دفعہ کسی سے کہا تھا کہ "کے کے" مجھ پر مرتی ہے۔ خدا کی قسم بہت بُری طرح مرتی ہے۔ لیکن ان دنوں میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آج اس نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا کہ تم نے بکواس کی تھی۔ میں تم پر کبھی نہیں مری۔ میں نے کہا تو آج مر جاؤ۔ مگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مجھے غصے میں آکر اس کے ایک گھونسہ مارنا پڑا"۔

میں نے اس سے پوچھا "تم نے ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا"۔

شیام نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جو زخمی ہو رہا تھا "کم بخت آگے سے ہٹ گئی۔ نشانہ چوکا اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا"۔

یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا "سالی بے کار ٹنگ کر رہی ہے"۔

میں نے اوپر روپے پیسے کا ذکر کیا۔۔۔غالباً دو برس پیچھے کی بات ہے۔ میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبوں حالی اور اپنے افسانے۔۔۔"ٹھنڈا گوشت" کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالتِ ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانے کی سزا دی تھی۔ میرا دل اس قدر کھٹا ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھونک کر کوئی اور کام شروع کر دوں جس کا تخلیق سے کوئی علاقہ نہ ہو۔۔۔چنگی کے محکمے میں ملازم ہو جاؤں اور رشوت کھا کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالا کروں۔ کسی پر نکتہ چینی کروں نہ کسی معاملے میں اپنی رائے دوں۔

ایک عجیب و غریب دور سے میرا دل و دماغ گزر رہا تھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ افسانے لکھ کر ان پر مقدمے چلوانا میرا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ میں صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ سستی شہرت کا دلدادہ ہوں اور لوگوں کے سفلی جذبات مشتعل کر کے اپنا اُلو سیدھا کرتا ہوں۔ مجھ پر چار مقدمے چل چکے تھے۔ ان چار اُلوؤں کو سیدھا کرنے میں جو خم میری کمر میں پیدا ہوا اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی آس پاس کے ماحول نے جب نکما کر دیا تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ ایک صرف مکتبہ جدید لاہور کے چوہدری برادران تھے جو مقدور بھر میری امداد کر رہے تھے۔ غم غلط کرنے کے لیے جب میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کی تو انہوں نے چاہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ مگر وہ اتنے مخلص تھے کہ مجھے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط و کتابت نہیں تھی۔ دراصل میرا دل بالکل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا جن کا ادب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی و روحانی خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تحسین پکچرز کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ میں فوراً ملوں بمبئے سے انہیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ ہدایت بھیجنے والا کون ہے، میں تحسین پکچرز والوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ بمبئے سے شیام کے پے در پے انہیں کئی تار ملے ہیں کہ مجھے ڈھونڈ کر ۵۰۰ روپے دے دیے جائیں۔ میں جب دفتر میں پہنچا تو وہ شیام کے تازہ تاکیدی تار کا جواب لکھ رہے تھے کہ تلاش بسیار کے باوجود انہیں منٹو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵۰۰ روپے لے لیے اور میری مخمور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ شیام کو خط لکھ کر اس کا شکریہ ادا کروں اور پوچھوں کہ اس نے مجھے یہ ۵۰۰

روپے کیوں بھیجے تھے۔ کیا اس کو علم تھا کہ میری مالی حالت کمزور ہے۔ اس غرض سے میں نے کئی خط لکھے اور پھاڑ دیے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شیام کے اس جذبے کا منہ چڑا رہے ہیں جس کے زیرِ اثر اس نے مجھے یہ روپے روانہ کیے تھے۔

پچھلے سال جب شیام اپنے ذاتی فلم کی نمائش کے سلسلے میں امرتسر آیا تو تھوڑی دیر کے لیے لاہور بھی آ گیا۔ یہاں اس نے بہت سے لوگوں سے میرا اتا پتا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے ہی معلوم ہو گیا کہ وہ لاہور میں موجود ہے۔ میں اسی وقت دوڑا اس سنیما پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھا کر آ رہا تھا۔ میرے ساتھ رشید عطرے تھا، شیام کا پونے کا پرانا دوست۔ جب موٹر سنیما کے صحن میں داخل ہوئی تو شیام نے مجھے اور رشید کو دیکھ لیا۔ ایک زور کا نعرہ بلند کیا۔ اس نے ڈرائیور سے موٹر روکنے کے لیے بہت کہا۔ مگر اس کے استقبال کے لیے اس قدر ہجوم تھا کہ ڈرائیور نہ رُکا۔ موٹر سے نکل کر پولیس کی مدد سے شیام اور اوم ایک ہی قسم کا لباس اور سر پر سفید پانامہ ہیٹ پہنے سنیما کے اندر پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔ بڑے دروازے سے ہم اندر پہنچے۔ شیام۔۔۔ وہی شیام تھا۔ مسکراتا، ہنستا اور قہقہے لگاتا شیام۔

دوڑ کر ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ پھر اس قدر شور مچا کہ ہم میں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا۔ اوپر تلے اتنی باتیں ہوئیں کہ انبار لگ گئے اور ہم ان کے نیچے دب کر رہ گئے۔ سنیما سے فارغ ہو کر اسے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانا تھا۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جو بات بھی شروع ہوتی، فوراً کٹ جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ نیچے بازار میں ہجوم شور برپا کر رہا تھا کہ شیام درشن دینے کے لیے باہر بیلکنی میں آئے۔

شیام کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی متعدد سڑکوں پر اس کے رومانوں کے چھینٹے بکھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصلہ اب امرتسر سے ہزاروں میل ہو گیا تھا۔ اور اس کا راولپنڈی کہاں تھا جہاں اس نے اپنے لڑکپن کے دن گزارے تھے؟ لاہور، امرتسر اور راولپنڈی، سب اپنی اپنی جگہ پر تھے۔ مگر وہ دن نہیں تھے، وہ راتیں نہیں تھیں جو شیام یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ سیاست کے گورکن نے انہیں نہ معلوم کہاں دفن کر دیا تھا۔

شیام نے مجھ سے کہا، میرے ساتھ ساتھ رہو، مگر اس کے دل و دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اس سے یہ وعدہ کر کے کہ رات کو اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا۔ چلا گیا۔

شیام سے اتنی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر خوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی گھٹی گھٹی کوفت

محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت میں اس قدر جھنجھلاہٹ تھی کہ جی چاہتا تھا کسی سے زبردست لڑائی ہو جائے۔ خوب مار کٹائی ہو اور میں تھک کر سو جاؤں۔ گھٹن کا تجزیہ کیا تو کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ، جہاں خیالات کے سارے دھاگے بری طرح آپس میں الجھ گئے۔ اس سے طبیعت اور بھی جھنجھلا گئی اور فلیٹیز میں جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں پینا شروع کر دی۔

نو ساڑھے نو بجے کے قریب شور سننے پر معلوم ہوا کہ شیام آ گیا ہے۔ اس کے کمرے میں ملنے والوں کی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ مگر کھل کر کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لگا کر چابیاں کسی نے ایک بہت بڑے گچھے میں پرو دی تھیں۔ ہم دونوں اس گچھے میں سے ایک ایک چابی نکال کر یہ تالے کھولنے کی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تھے۔

میں اکتا گیا۔ ڈنر کے بعد شیام نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی مگر میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ سنا۔ میرا اپنا دماغ بڑے اونچے سروں میں جانے کیا بک رہا تھا۔ شیام نے اپنی بکواس ختم کی تو لوگوں نے بھرے پیٹ کے ساتھ تالیاں پیٹیں۔ میں اٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہاں فضلی بیٹھے تھے۔ ان سے ایک معمولی بات پر بحث ہو گئی۔ شیام آیا تو اس نے کہا: "یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں چلو آؤ تم بھی چلو۔"

میں قریب قریب رو دیا۔ "میں نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں۔" "تم میرا انتظار کرو۔۔۔ میں ابھی آیا"۔

یہ کہہ کر شیام ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹی موٹی گالیاں دیں اور فضلی سے کہا "میرا خیال ہے آپ تو یہاں انتظار کریں گے اگر تکلیف نہ ہو تو از راہِ کرم اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر تک چھوڑ آیئے"۔

رات بھر اُوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا، شیام سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی۔ صبح دودھ والا آیا تو میں کھوکھلے غصے میں اس سے کہہ رہا تھا "تم بالکل بدل گئے ہو۔۔۔ اُلو کے پٹھے، ذلیل۔۔۔ تم ہندو ہو"۔

نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا تو یقین ہو گیا کہ وہ میرا منہ نہیں تھا۔ سیاست کا بھونپا تھا جس سے یہ گالی نکلی تھی اس کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے دودھ والے سے دودھ لیا جس میں ایک چوتھائی پانی تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی کہ شیام ہندو تھا مگر پانی ملا ہندو نہیں تھا۔

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خونریز جنگ جاری تھی اور طرفین کے ہزاروں آدمی

روزانہ مرتے تھے۔شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی روداد سُنا رہے تھے جو بہت ہی دردناک تھی۔شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ہلچل جو اس کے دل و دماغ میں مچ رہی تھی اس کو بھی میں بخوبی سمجھتا تھا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا"میں مسلمان ہوں۔کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو"۔

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا"اس وقت نہیں۔۔۔لیکن اس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا۔۔۔میں تمہیں قتل کرسکتا تھا"۔

شیام کے منہ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا۔اس وقت شاید میں بھی اسے قتل کرسکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا! اور اُس وقت اور اس وقت میں زمین وآسمان کا فرق ہے کیا؟۔تو ان تمام فسادات کا نفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آ گیا۔جس میں روزانہ سینکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان موت کے گھاٹ اتارے جارہے تھے۔

اِس وقت نہیں۔۔۔اُس وقت ہاں۔۔۔کیوں؟ آپ سوچئے تو آپ کو اس کیوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔

بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ بمبئے ٹاکیز کی عنانِ حکومت جب اشوک اور واچا نے سنبھالی تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔اس سے بمبئی ٹاکیز کے ہندو اسٹاف میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے جس میں اسٹوڈیو کو آگ لگانے اور مرنے مرانے کی دھمکیاں ہوتی تھیں۔اشوک اور واچا دونوں کو ان کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔لیکن کچھ ذکی الحس ہونے کے باعث اور کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا تھا کئی مرتبہ میں نے اشوک اور واچا سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔اوران کو رائے دی کہ وہ مجھے بمبئے ٹاکیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان وہاں داخل ہو رہے ہیں مگر انہوں نے کہا کہ میرا دماغ خراب ہے۔

دماغ میرا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ بیوی بچے پاکستان میں تھے۔ جب وہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا تو میں اسے جانتا تھا۔اس میں وقتاً فوقتاً جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے، میں ان سے بھی واقف تھا۔ مگر اب اس خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا۔اپنی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اس کی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔

۱۴ اگست کا دن میرے سامنے بمبئے میں منایا گیا۔ پاکستان اور بھارت دونوں آزاد ملک قرار دیئے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے مگر قتل اور آگ کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگرس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہرلال نہرو، قائداعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان، اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بیدردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں، ہمارا غلام کون ہوگا۔۔۔ جب غلام تھے تو آزادی کا تصور کر سکتے تھے اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے، کیسے مر رہے تھے، کیوں مر رہے تھے۔۔۔ ان سوالوں کے مختلف جواب تھے۔ بھارتی جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو، کوئی کہتا نہیں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لیے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالمِ وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا۔ لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام۔۔۔ مذہبی جنون کا غلام۔۔۔ حیوانیت و بربریت کا غلام۔۔۔

میں نے بمبئے ٹاکیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واچا آتے تو میں خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کر دیتا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ شیام مجھے دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ اس کو میری قلبی کیفیات کا بخوبی علم تھا۔ کچھ دن بہت زیادہ پی کر میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گم صم صوفے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن شیام سٹوڈیو سے آیا تو اس نے مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا ''کیوں خوابِ جگالی کر رہے ہو؟''

مجھے بہت جھنجلاہٹ ہوتی تھی کہ شیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا۔ اس کے دل و دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہیں جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح مسکراتا، ہنستا اور شور مچاتا رہتا۔ مگر شاید وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جو فضا اس وقت گرد و پیش تھی اس میں سوچنا بالکل بے کار ہے۔

میں نے بہت غور وفکر کیا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہا۔ ہٹاؤ چلیں یہاں سے۔۔۔ شیام کی نائٹ شوٹنگ تھی۔ میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اسی میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو شیام شوٹنگ سے فارغ ہوکر آیا۔ اس نے میرا بندھا ہوا اسباب دیکھا تو مجھ سے صرف اتنا پوچھا ''چلے؟''

میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا۔ ''ہاں''۔

اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان ''ہجرت'' کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ بقایا سامان رکھوانے میں اس نے میرا ہاتھ بٹایا اس دوران میں رات کی شوٹنگ کے لطیفے بیان کرتا رہا۔ اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اس نے الماری میں سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے اور ایک مجھے دے کر کہا۔ ''ہپ ٹلا''

میں نے جواب میں ہپ ٹلا کہا اور اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ بھینچ لیا ''سُوّر کہیں کے''۔

میں نے اپنے آنسو روکے ''پاکستان کے''۔

شیام نے پُر خلوص نعرہ بلند کیا ''زندہ باد پاکستان''۔

''زندہ باد بھارت''۔ اور میں نیچے چلا گیا۔ جہاں ٹرک والا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بندرگاہ تک شیام میرے ساتھ گیا۔ جہاز چلنے میں کافی دیر تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کے لطیفے سنا کر میرا دل بہلاتا رہا۔ جب وسل ہوا تو اس نے ہپ ٹلا کہہ کر میرا ہاتھ دبایا۔ اور ''گینگ وے'' سے نیچے اتر گیا۔۔۔ مڑ کر اس نے میری طرف نہ دیکھا اور مضبوط قدم اٹھاتا بندرگاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے لاہور پہنچ کر اس کو خط لکھا۔ انیس ایک اڑتالیس کو اس کا جواب آیا یہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔ تمہاری اور تمہاری بذلہ سنجی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں جو تم بڑی فراخدلی سے ان پر ضائع کرتے تھے۔ واچا ابھی تک اس بات پر مُصر ہے کہ تم کنی کترا گئے۔ اب کی دفعہ اس کو اطلاع دیئے بغیر پاکستان بھاگ کر گئے۔ عجیب متناقض بات ہے کہ وہ جو بمبئے ٹاکیز میں مسلمانوں کے داخلے کی مخالفت میں سب سے آگے تھا، سب سے پہلا آدمی تھا جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا، خود کو اپنے نظریے کا شہید بناتے ہوئے۔۔۔ یہ واچا کا اپنا نظریہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اس کو ضرور خط لکھا ہوگا۔ اگر نہیں لکھا تو فوراً لکھو کم از کم شرافت کا یہی تقاضا ہے۔ تمہارا شیام۔

آج چودہ اگست ہے، وہ دن جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے ہیں۔ ادھر اور اُدھر دونوں طرف خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ حملے اور دفاع کی تیاریاں بھی زور و شور سے جاری ہیں۔۔۔ میں شیام کی روح سے مخاطب ہوتا ہوں۔" پیارے شیام میں بمبئے تا کیز چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیا پنڈت جواہر لال نہرو کشمیر نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔ ہے نا ہپ ٹلا بات؟"

غلام عباس

راشد: چند یادیں

۱۹۲۸ء کے اواخر میں جب میں لاہور کے مشہور نشری ادارے ''دارالاشاعت پنجاب'' سے منسلک ہوا تو اس وقت میری عمر اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس ادارے کے ایک اہم رکن سید امتیاز علی تاج تھے جن کا شمار ملک کے ممتاز ادبا میں ہوتا تھا۔ ان کی شخصیت بڑی جاذب نظر تھی، انہوں نے ڈرامہ ''انارکلی'' لکھا تھا جس کی شہرت اس کی اشاعت سے قبل ہی دور دور پھیل گئی تھی اور لوگ اس ڈرامے کے اقتباسات ان کی زبان سے سننے کے بڑے مشتاق رہا کرتے تھے۔

تاج صاحب کے احباب کا حلقہ خاصا وسیع تھا مگر ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر سید احمد شاہ بخاری پطرس تھے جو ان کے کالج کے زمانے کے رفیق اور دوست تھے۔ ایک زمانے میں ان کی جوڑی کو خاصی شہرت حاصل رہی کیونکہ وہ لاہور کی علمی و ادبی مجالس اور میلوں ٹھیلوں میں ہمیشہ ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔

ایک دن بخاری صاحب تاج صاحب سے ملنے آئے تو وہ بڑے جوش میں تھے۔ کہنے لگے، ''امتیاز، آج میں نے ایک اردو رسالے میں ایک نظم پڑھی ہے جسے بلاشبہ اس صدی کی نظم کہا جا سکتا ہے، اس کا عنوان ہے ''اتفاقات'' اس کا خالق ن۔م۔راشد ہے جو ہمارے گورنمنٹ کالج ہی کا فارغ

التحصیل ہے۔"

پھر بخاری صاحب نے بتایا کہ وہ راشد سے ملنے اور اس نظم کی داد دینے اس کے مکان پر گئے تھے۔ اس وقت راشد بڑی تنگی ترشی سے گزر کرتے تھے، ان کا رہن سہن کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ کرسی تلاش کرنے لگے جو موجود نہ تھی۔ بخاری صاحب نے کہا۔ رہنے دو۔ فرش پر جو کتابیں پڑی ہیں، میں ان کو جمع کر کے ان پر بیٹھ جاؤں گا۔ پھر وہ دیر تک راشد سے اس کی نظم پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔

میں نے راشد کو کئی بار مشاعروں میں شعر پڑھتے سنا تھا لیکن ان سے شناسائی اس وقت ہوئی جب مولانا چراغ حسن حسرت بھی "دارالاشاعت پنجاب" کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ حسرت صاحب پیشے کے لحاظ سے تو صحافی مگر ادب کا بڑا ارفع مذاق رکھتے تھے۔ ان کی علمی استعداد کا کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر استادانہ مہارت رکھتے تھے ان کے گرد اس وقت کے ابھرتے ہوئے ادبا و شعرا اور ادب کے طالب علموں کا خاصا مجمع لگا رہتا تھا۔ ان میں اکثر راشد اور میرا جی بھی ہوتے تھے۔ حسرت صاحب کو جدید شاعری قطعاً ناپسند تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آزاد شاعری جب قافیہ اور ردیف سے آزاد ہے تو اس میں تعقید لفظی اور اسی قسم کے دوسرے عیوب نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر نئی نظم میں "میں نہیں سکتا تھا" جیسا ٹکڑا ہو تو وہ سخت ناگوار گزرتا ہے۔ نثر ہو تو صاف اور رواں۔

حسرت صاحب کی وسیع القلبی دیکھئے کہ جب میرا جی نے اپنی بے قافیہ نظموں کی کاپی حسرت صاحب کو بغرض اصلاح پیش کی تو وہ انکار نہ کر سکے۔ اور کئی دن تک اس پر بڑی محنت صرف کرتے رہے۔ اس کے کئی سال بعد دلی میں جب راشد نے اپنی نظموں کے پہلے مجموعے "ماورا" کا مسودہ حسرت صاحب کو اصلاح کے لئے دیا انہوں نے اس پر بھی غائر نظر ڈالی۔ اور اس کے زبان کے بعض اسقام کو دور کیا۔ راشد نے "ماورا" کے دیباچے میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

راشد نے ایام جوانی ہی میں خود کو خاکسار تحریک سے وابستہ کر لیا تھا۔ وہ کئی سال تک اس کے سرگرم رکن بنے رہے۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کی طرف سے انہیں دعوت دی گئی کہ وہ خاکسار تحریک کے بارے میں کالج کی ایک تقریب میں مقالہ پڑھیں۔ اور کالج کے طلباء کو اس تحریک کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کریں۔ راشد نے کہا میں اس تقریب میں شامل ہونے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھے خاکساروں کی وردی پہن کر آنے اور ہاتھ میں بیلچہ اٹھانے کی اجازت ہو۔

کالج والوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ راشد اپنی شرائط کے مطابق خاکساروں کی

وردی پہن کر اور کندھے پر بیلچہ اٹھا کر کالج گئے اور خاکسار تحریک پر ایک نہایت دل چسپ اور پر از معلومات مقالہ پڑھا۔

۱۹۳۷ء میں مجھے ''پھول'' اخبار کی ایڈیٹری چھوڑ کر دلی جانا پڑا۔ جہاں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے کی ایڈیٹری مجھے سونپ دی گئی۔ اس کے کچھ دن بعد پروفیسر احمد شاہ بخاری نے، جواب آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر تھے، مجھ سے کہا۔ کہ راشد ریڈیو میں ملازم ہوگیا ہے۔ فی الحال لاہور میں ہے لیکن عنقریب اسے دلی بلوالیا جائے گا اور خبروں کے ترجمے کے کام پر لگا دیا جائے گا۔ تم ذرا اس کی دل جوئی کرتے رہنا۔

چنانچہ چند روز بعد راشد دلی آ گئے۔ اور شام کی خبروں کے بلیٹن کے مترجم بن گئے۔ میں نے خبروں کے بعد ان کے دفتر میں جا کر ان سے ملاقات کی۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ تنہا آیا ہوں اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔

اتفاق سے ان دنوں میں گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ کیونکہ بیوی طویل علالت کی وجہ سے ہسپتال میں تھی اور والدہ نے بھی اس کی تیمارداری کے لیے ہسپتال ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ میں نے کہا تم میرے ہاں کیوں نہیں آ رہتے۔ راشد مان گئے۔ اور تقریباً ایک ماہ میرے پاس ہی رہے اور یوں ہماری شناسائی نے رفتہ رفتہ ایک گہری دوستی کی شکل اختیار کر لی۔

ہم دن رات ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ دنیا جہاں کی باتیں کرتے۔ موضوع گفتگو زیادہ تر ادب ہوتا۔ میری طرح انہیں بھی روسی لٹریچر سے بڑی دل بستگی تھی۔ میں نے دوستوافسکی ''ٹالسٹائی،'' گورکی اور چیکوف کے افسانے ترجمہ کیے تھے۔ انہوں نے الیگزنڈر کپرن کے ناول "Yama The Pit" کو اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ ایک بڑا طویل ناول تھا جس کا ترجمہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے کیا تھا۔ مگر ظالم ناشر نے نہ تو ترجمے کا کوئی معاوضہ دیا تھا اور نہ کتاب پر بہ حیثیت مترجم ان کا نام ہی درج کیا تھا، اس پر اور ستم یہ کہ رسالوں اور اخباروں میں اس کتاب کے جو اشتہار چھپتے تھے، ان میں ان کا نام بڑے جلی حروف میں چھپوایا جاتا تھا۔

کبھی کبھی موضوع سخن ان کی شاعری اور میری افسانہ نویسی بھی ہوتا تھا۔ ان کی جو نظمیں میری سمجھ میں نہ آتیں وہ ان کا ایک ایک نکتہ مجھے اس طرح سمجھاتے جس طرح کوئی بچے کو سمجھاتا ہے اور اس طرح میں ان کی نظموں کے مفہوم اور ان کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہو کر ان سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے لگا۔

وہ میرے مختصر ناول ''جزیرہ سخنوراں'' کے بڑے مداح تھے۔ اور ہر چند میں نے ایک معصوم سی شرارت کے تحت اس ناول میں ان کا کردار ایک باغی شاعر کے طور پر استعمال کر کے اسے سخن ناشناسوں کے ہاتھوں پٹوا بھی دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ان کی ستائش میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کے کئی سال بعد بھی انہوں نے ریڈیو پاکستان سے ''میری پسندیدہ کتاب'' کے عنوان سے ''جزیرہ سخنوراں'' کے بارے میں ایک طویل انٹرویو براڈ کاسٹ کیا گیا تھا۔

راشد تنقید کی بھی بے پایاں صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے یورپ کے اعلیٰ پایہ کے نقادوں کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ''اردو ادب پر غالب کا اثر''، ''ظفر علی خاں کی شاعری''، ''انارکلی''، ''اختر شیرانی کے ساتھ لمحے'' کے عنوانوں سے جو مقالات لکھے تھے ان میں تنقید کا بہت اونچا معیار پیش کیا گیا تھا۔

آل انڈیا ریڈیو میں راشد کا تبادلہ جلد ہی خبروں کے محکمے سے تقریروں کے محکمے میں ہو گیا۔ اب وہ تقریروں کے نئے نئے سلسلے سوچنے لگے۔ یہ کام ان کی مرضی کے عین مطابق تھا، بڑی محنت کرتے اور سرگرم رہتے۔ جب وہ مقررین کی جستجو میں نکلتے تو رہنمائی کے لئے اکثر مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ کبھی تو گوہر مقصود جلد ہی مل جاتا اور کبھی اس کی تلاش میں پہروں دلی کے کونوں کھدروں کی خاک چھاننی پڑتی۔ ہمارے لئے یہ امر باعثِ طمانیت ہوتا تھا کہ ہم نے اس تقریب کی بدولت دلی کے بزرگ شعراء کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین (بھارت کے سابق صدر)، شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، مرزا محمد سعید دہلوی، مولوی عبدالحق، پنڈت دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، خواجہ حسن نظامی جیسے ذی علم اور برگزیدہ حضرات سے شرف نیاز حاصل کر لیا۔

اس زمانے میں خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی نے ایک پروگرام بنایا کہ قرول باغ دلی میں خاکساروں کا ایک بڑا اجتماع ہو جس میں ایک لاکھ سے زیادہ خاکسار شرکت کریں۔ راشد اس تحریک کے رکن ہی نہیں بلکہ ملتان کے ضلع کے سالار بھی تھے۔ بڑی پریڈیں کرتے اور سالاری کے فرائض محنت سے انجام دیتے تھے۔ قواعد کے اتنے پابند تھے کہ ایک مرتبہ جب ان سے کوئی بے ضابطگی ہوئی تو انہوں نے سر بازار اپنے ہاتھ پاؤں بندھوا کر کوڑے کھائے۔ بڑے فخر سے کہا کرتے کہ نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے اگر سالار خود مثال پیش نہ کرے تو کام کیسے چل سکتا ہے۔ مگر اب کچھ بددل سے ہو گئے تھے۔ علامہ مشرقی نے بلوایا۔ یہ جا کر مل آئے۔ میں نے کہا اگلی دفعہ جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔ کہنے لگے، اب تو شاید میں

بھی نہ جا سکوں۔ اس کے بعد انہوں نے تحریک میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔

راشد خاصی تنگدستی کا زمانہ گزار کر دلی آئے تھے۔ ملتان میں جہاں وہ کمشنر کے دفتر میں کلرک تھے۔ انہیں شاید تیس یا چالیس روپے تنخواہ ملتی تھی جو دلی میں ایک دم ڈیڑھ سو ہوگئی۔ یعنی تقریباً چار پانچ گنا زیادہ۔ چنانچہ اب وہ آہستہ آہستہ آسائش کی زندگی کی طرف مائل ہونے لگے۔ پینے پلانے کی طرف سے بھی حجاب اٹھنے لگا۔ مگر جو مشاہرہ انہیں ملتا تھا اس میں کسی قسم کی فضول خرچی کی گنجائش نہ تھی۔ البتہ ذہن میں طرح طرح کے خیالی پیکر اور ہیولے ابھرنے لگے تھے جن کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے سے خاصی تسکین ہو جاتی تھی، چنانچہ ''شرابی''، ''انتقام''، ''اجنبی عورت''، ''رقص''، ''خودکشی'' وغیرہ نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں۔

''ماورئی'' چھپ گئی۔ چغتائی صاحب نے اس کا بہت خوبصورت گرد پوش بنایا تھا۔ کرشن چندر نے دیباچہ لکھا تھا۔ جیسا کہ توقع تھی کتاب ملک میں بہت مقبول ہوئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ کچھ رسائل و جرائد میں اس کے خلاف تنقیدیں بھی چھپیں مگر اس کی مقبولیت پر کچھ اثر نہ پڑا۔

اس دوران میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ راشد کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ اور وہ کپتان بن کر ملک سے باہر چلے گئے۔ کوئی ڈیڑھ دو سال بعد واپس آئے تو دلی میں میرے ہی پاس آ کر ٹھہرے۔ ان کی عدم موجودگی میں ''ماورئی'' کا دوسرا ایڈیشن چھپ گیا تھا۔ جس کی ایک جلد میں خرید لایا تھا۔ خوش خوش اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ اچانک ان کا چہرہ غصے سے متغیر ہوگیا۔ ناشر نے دوسرے ایڈیشن میں ان کی وہ نظمیں بھی رسائل سے لے کر شامل کر دی تھیں جو انہوں نے ''ماوری'' کے چھپنے کے بعد پچھلے ڈیڑھ دو سال میں کہی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے ناشر کو اس کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ راشد شاید ان نظموں کو اپنے دوسرے مجموعے کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

وہ اس واقعہ سے سخت پریشان ہوئے۔ رات کو نیند بھی نہ آئی۔ بس تڑپتے اور کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر وردی پہن گھر سے نکل گئے، تین چار دن غائب رہے۔ اس کے بعد آئے تو بڑے ہشاش بشاش، لپٹ لپٹ کر گلے ملتے اور قہقہے لگاتے رہے۔

بولے، جانتے ہو میں کہاں سے آ رہا ہوں؟ لاہور سے۔ میں اس صبح اپنے دفتر سے اجازت لے کر لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ میں سیدھا انارکلی چوک کے تھانے میں پہنچا۔ میں نے تھانے دار سے کہا۔ میں فوج میں کپتان ہوں۔ میں جنگ کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب ہم جنگ پر

ملک سے باہر جائیں تو سرکار ہمارے پیچھے ہمارے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ اب دیکھئے میرے ساتھ میرے پبلشر نے کیا کیا، اس کے بعد میں نے تھانے دار کو اس واقعہ کی تفصیل بتائی۔ اس نے کہا، صاحب آپ فکر نہ کریں، میں ابھی اس کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس نے فوراً سپاہی بھیج کر ناشر کی دکان پر تالا ڈلوا دیا۔ اس کے ساتھ ہی جس پریس میں کتاب چھپی تھی اس کے مالک کو بھی طلب کرلیا۔

''ماورئی'' کا ناشر بڑا اکڑ باز تھا۔ بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کبھی کبھی مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ مگر راشد کی اس کارروائی سے اس کی ساری اکڑفوں نکل گئی۔ گڑ گڑا کر راشد سے معافی مانگی اور کہا کہ میں پوری رائلٹی کے علاوہ ایک ہزار روپیہ اس کا ہرجانہ بھی دوں گا۔ پریس والے بے قصور تھے، انہیں معاف کردیا گیا۔ البتہ ان کے رجسٹر سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ پہلا ایڈیشن ایک ہزار نہیں جیسا کہ اس میں درج تھا بلکہ دو ہزار جلدوں کا چھاپا گیا تھا۔ چنانچہ ناشر کو ایک ہزار کی مزید رائلٹی ادا کرنی پڑی۔

راشد مزاجاً سخت گیر تھے۔ کسی سے انہیں تکلیف پہنچے تو اسے آسانی سے معاف نہیں کرتے تھے۔ اپنے خلاف بے جا یا معاندانہ تنقید کی چبھن انہیں عمر بھر رہتی تھی۔ ہمارے معاصرین میں ایک افسانہ نگار تھے۔ حیات اللہ انصاری، انہوں نے راشد کی شاعری پر ایک تنقیدی مقالہ لکھا۔ اور دلی کی ایک ادبی مجلس میں پڑھا جس میں میں بھی موجود تھا۔ تنقید شروع سے آخر تک ترقی پسند مصنفین کا نقطہ نظر لئے ہوئے تھی۔ کہیں کہیں راشد کی تعریف بھی کی گئی تھی۔ مقالہ بہ حیثیت مجموعی راشد کے زیادہ خلاف نہیں تھا۔ میں نے راشد سے اس کا ذکر کیا تو بڑے جز بز ہوئے اور بغیر مقالہ پڑھے اسی وقت حیات اللہ انصاری کے نام ایک سخت سا خط اور وہ بھی انگریزی میں لکھ ڈالا۔ انصاری صاحب کو یہ خط پڑھ کر یقیناً غصہ آیا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے مقالے سے تمام تعریفی جملے تو حذف کردیئے اور اس میں بہت سے اعتراضات شامل کرکے اسے کتابی صورت میں شائع کردیا۔ نام تھا ''ن۔م۔راشد پر''

راشد کو اپنی اس بے صبری اور جلد بازی کی عادت کی ایک دفعہ اور بھی سخت سزا بھگتنی پڑی تھی۔ راشد کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ انہیں فوج میں کمیشن مل گیا ہے۔ اور اب صرف چند ابتدائی کارروائیاں باقی رہ گئی ہیں، مثلاً جسمانی معائنہ وغیرہ۔ تو وہ خود ہی فوج کے دفتر میں پہنچ گئے کہ میرا معائنہ کر لیجئے۔ شام کو جب واپس آئے تو ان کی بری حالت تھی۔ ان کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آئی تھیں، گھٹنے زخمی تھے اور منہ سوجا ہوا۔ سارا جسم اکڑ گیا تھا، چلنا پھرنا دوبھر تھا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ملال بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ کہنے

لگے بھائی یہ امتحان تو پل صراط سے گزرنے سے کم نہ تھا۔ مجھے خاردار تاروں پر سے گزرنا پڑا، خاصے اونچے اونچے درختوں پر چڑھا اور وہاں سے زمین پر چھلانگیں لگائیں۔ کبھی دوڑتا تھا، کبھی رینگتا تھا، قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس جسمانی معائنہ کی صعوبتیں ناحق ہی اٹھائیں۔ کیونکہ انہیں تو اس معائنہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ یہ معائنہ تو صرف جنگ میں لڑنے والے سپاہیوں کے لئے لازمی تھا، لکھنے پڑھنے کا کام کرنے والوں کے لئے نہیں۔

جب راشد کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''ایران میں اجنبی'' شائع ہوا تو اس کا دیباچہ پطرس بخاری نے نہایت محبت اور خلوص سے لکھا۔ البتہ اس میں کہیں کہیں مخصوص طنزیہ رنگ میں راشد پر تنقید بھی کی تھی۔ یہ تنقید راشد کو بالکل پسند نہ آئی۔ کہنے لگے۔ مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو شائع کروں یا نہ کروں۔ میں نے کہا یہ سچ ہے کہ اس دیباچے میں تمہاری زیادہ مدح سرائی نہیں کی گئی، مگر یقین جانو کہ اس میں کسی بے التفاتی یا عناد کو ذرا بھی دخل نہیں۔ اگر یہ دیباچہ روایتی مدحیہ انداز میں ہوتا تو پھر بخاری صاحب میں اور دوسرے لکھنے والوں میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ مگر میں راشد کو مطمئن نہ کر سکا۔

راشد خط لکھنے اور خط کا جواب دینے میں بڑے مستعد تھے۔ ہماری دوستی کی اس طویل مدت کے دوران انہوں نے مجھے بے شمار خط لکھے جو محبت، یگانگت اور خلوص سے بھرے ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ان خطوط سے ان کی بے باک طرزِ نگارش اور اعلیٰ انشا پردازی کا رنگ بھی بخوبی جھلکتا تھا۔ نمونے کے طور پر ان کے خطوں کے کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں:

۱۔ ''میں نومبر کے آخر میں ریٹائر ہو رہا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ریٹائر ہونے کے بعد کیا کیا جائے۔ پاکستان میں آباد ہونا مشکل ہے۔ ہمارے طبقہ میں کلچر کا جو فقدان شروع سے چلا آ رہا ہے وہ مجھے راس نہیں آ سکتا۔ اگر ایران میں کوئی مفید قسم کی مشغولیت مل گئی تو شاید یہیں بس جاؤں ورنہ یورپ کے کسی ملک میں۔ ایران میں اس وقت مواقع بہت ہیں۔ تاہم اس سوسائٹی کی اخلاقی خامیوں میں دروغ گوئی جسے ان لوگوں نے ہنر کی حد تک پہنچا دیا ہے بعض دفعہ اداس کر دیتی ہے۔''

۲۔ ''پطرس بخاری کے بارے میں میرے ایک انٹرویو کا ترجمہ ''اوراق'' لاہور میں شائع ہو رہا ہے۔ جو انگریزی میں پروفیسر انور شبنم دل (پنجاب یونیورسٹی) نے نیویارک میں میرے ساتھ کیا تھا۔ یہ انٹرویو قصیدۂ مدحیہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں بخاری کی ذات اور عمل پر ایک طرح سے تنقید بھی شامل ہے۔ شاید

اس کے بعض حصوں سے تمہاری عقیدت کو ٹھیس پہنچے۔ تاہم اگر تمہاری نظر سے گزرے تو اپنی رائے سے ضرور مطلع کرو۔''

۳۔ ''یہاں گذشتہ پندرہ سولہ مہینوں میں سولہ سترہ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے ذہن کو اتنا چاق و چوبند کم پایا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بجھتے چراغ کی لو نہ ہو۔''

۴۔ ''ذوالفقار بخاری صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ بے حد رنج ہوا۔ سب آہستہ آہستہ چلتے چلے جا رہے ہیں۔ بخاری سے رنگین تر اور متنوع تر شخصیت کا مالک کم ہی کوئی ہوگا۔ ان سے دکھ بھی پہنچے۔ لیکن وہ کبھی نشتر نہ بنے۔ کانٹے کی چبھن سے زیادہ نہ ہوئے، اور پھر انہیں اس چبھن کو دور کرنے کے بھی ہزاروں مرہم یاد تھے۔ خدا ان کی روح کو تسکین دے۔''

عصمت چغتائی

دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بد مذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑ بڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ "گھر کی مرغی دال برابر" والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہو گا ہی کیا؟ یہ ادب نہیں پھکڑ، مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہوں گی۔ یعنی بے پڑھے رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خود ستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا۔ میں اور رحیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آ گئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار؟

تھے بولے ''لاؤ میں تمہیں سناؤں'' اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہوگئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر انہی کی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے:۔

''تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں...... '' اور انہوں نے چھیڑا لو ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہوگئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں اور بخدا وہ شخص جب کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے، میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ ''مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو۔'' اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہوگئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ افوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان کی رلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں، وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک، دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا۔ پتلی پتلی پچپچی جیسی ٹانگیں جن کے سر پر ورم جیسے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کیڑوں، بھنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑ کتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا، معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے، نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا جبار و قہار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمہ کا

عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی نہ رلا سکا۔ اس دکھ میں جلن، ہنستے نہیں ہنساتے رہنا، کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے ''زندہ لاش۔'' خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جان دار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! اس میں کتنی جان تھی۔ منہ پر گوشت نام کو نہ تھا۔ مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آ جانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا، کنپٹیاں بھر گئی تھیں، پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرہ پر آ ئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آ گئی تھی۔ جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بے کس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ ''خانم'' پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں، ان میں اتنی جان ہی کب تھی۔ مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا، کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی ''خانم'' اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لئے ''خانم'' کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیریکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھائی جان، نانی اماں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھنگی، بہشتی۔ یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم چلتے پھرتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ ''خانم'' کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابھی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

''گھر یا بہادر'' جس کا پہلا ٹکڑا ''روح لطافت'' میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور

انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروالیتا ہے وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا، شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا، مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیئے نا جینے کے لئے!

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی؟ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا مگر بے بس۔ سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انہیں بھی انسان سمجھے۔ انہیں بھی کوئی ڈانٹے۔ انہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصا گھر میدان جنگ بن گیا۔ اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہوگئے اور کمزور ولاچار، ہردم کا روگی، تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا اور کیا چاہیے؟ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا، ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنالینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی ''سانپ جنا تھا میں نے!''

مرنے سے پہلے قابل رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں، جی چاہتا تھا کہ جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے۔ ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بھی اسے کوئی پیار کرے،

بیوی پوجا کرے، بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی۔ مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے، ورم بڑھ گیا، آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پر ہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے، آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰ اگست کو صبح شمیم نے آ کر کہا ''منے بھائی ختم ہو رہے ہیں اٹھو۔''

''وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو۔'' میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

''ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں۔'' شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔

''ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے۔۔۔ ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔'' میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابھی انہیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجہ سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

''منے بھائی'' میں نے ان پر جھک کر کہا۔ ایک لحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

''ختم ہو گئے منے بھائی...... '' نہ جانے کس نے کہا۔

''وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔'' مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں ناممکن، وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لئے تو وہ مر کر ہی جئے اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے، اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کا پیغام ''دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو'' یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان

کی صحت اچھی ہوتی، وہ جھوٹے تھے۔ ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا، ہنسا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا، بیوی کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ ملاؤں کے فتوؤں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرا جا رہا ہوگا مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی۔ نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے بل رہے ہوں گے مگر کوئی اسے رلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی، باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی، کولھے میں امرود برابر پھوڑا، آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہو گئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے، ''یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہنچیں''۔ یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہیے، پتھر کا کلیجہ ہو مرتے وقت جملے کسنے کے لئے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن! بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی، اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے، خیالات بدل گئے ہیں، ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہمارا دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری، سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے۔ نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دکھ میں ٹھٹھا لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے، زندگی کے ہر معاملہ میں دکھ کو ہنس کر نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو، اس سے دوستی۔ ''کھرپا بہادر'' میں جو ''شاہ

لنکران'' کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یااللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اسی میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن، بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے، وہی قصے ''سوانہ کی روحیں''، ''مہارانی کا خواب''، ''چمکی'' اور ''ریزے'' بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی، بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی، خصوصاً ''کولتار'' تو بالکل ردی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی رنگ میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے۔ ''شریر بیوی'' تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے میں بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

''چمکی'' ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ! وہ ''چمکی'' کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا اور پھر خود مصنف کی زندگی۔ کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن وعشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں، یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں ''گل بکاؤلی''، ''زہرہ عشق'' وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انہیں پرانی کہہ دیا گیا۔ لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ، پنڈلیوں کی گاؤدی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے، وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ ''نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں ''اماں کھانا'' معلوم ہوتا ہے۔'' یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ''ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس

سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری، مصوری، قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق ومحبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہوکر وہی ''الف لیلہ'' کا رنگ غالب آ گیا۔

انہیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے ''یہ عورت بہت پیارے جھوٹ بولتی ہے۔'' انہیں شکایت تھی کہ میں بہت الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں! اوران کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں۔ اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً ''جھوٹ'' کہا کرتے تھے۔ جہاں انہوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے، پھر ''قصر صحرا'' لکھنے لگے۔ وہ ان کی گپوں کو ''قصر صحرا'' کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے ''سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔''

وہ یہ بھی کہتے کہ ''جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو ''قصر صحرا'' ہے۔

اس پر ماموں کہتے:۔

''ارے زندہ لاش کو منع کرو یہ کفر ہے۔'' اس پر وہ ماموں کے تو ہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کہتے تھے ''دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے۔''

کہتے تھے ''میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر پجوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی۔''

انہیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے ''دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں۔ عقل چاہیے ان چیزوں کے لیے۔''

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا۔ مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں انکا۔ عموماً پیسے دے کر ڈھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے، اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی

کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لیے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مداح تھے اور امام حسینؓ کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ کھڑے ہیں، ادھر سے یزید لعین آیا، آپ کے پیر پکڑ لیے، گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا، پھر ہم کیوں لڑیں۔"

سیاست سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے "بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔" بہت سال ہوئے کچھ مضامین "ریاست" میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے:۔

"بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہٰذا چپ ہی رہو۔" پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے۔ "یہ پرانی بات ہو گئی اب پردہ روکے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم کر چکے۔ اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔" لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے، تو فرماتے، "یہاں کون سی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں۔" کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ سب انہیں "باغی" اور "دوزخی" کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے الجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ "دوزخی" کا کیا ٹھکانہ۔

اوپندر ناتھ اشک

منٹو: میرا دشمن

نہیں، کسی کو تکلیف پہنچانے کے لیے کمینہ بننا ضروری نہیں، لیکن زندگی کا المیہ یہ ہے کہ بھلے اور شریف لوگ، جو باہمی محبت کرتے ہیں، تمام تر نیک خواہشات کے باوجود ایک دوسرے کو سخت صدمے پہنچا سکتے ہیں۔

(آندرے ژید)

منٹو میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتب پبلشرز، بمبئی سے شائع ہونے والے ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو اسکیچ کرشن چندر نے لکھا اس میں اس چپقلش کا ذکر کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج، جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کیا واقعی ہم دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا ہی دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری افتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا۔۔۔ وہ لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دکانوں

کے اوپر چوباروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا اور رات کو خواب بھی فلاش ہی کے دیکھتا تھا اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ رندِ بلانوش تھا اور میں نے، شراب تو دور رہی، سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا جب میں بتیس برس کا تھا۔ اس نے کٹرہ گھونیاں ہو، ہیرامنڈی ہو یا فارس روڈ۔۔۔ اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے ادھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں بھر دی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بغیر ان پر فخر سے سربلند کر سکتی ہیں۔ ان کے انہیں کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہوگئی اور ہم نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے اس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج، جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کھل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتا جی جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے عموماً نعرہ لگاتے تھے: ''کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے!'' وہ حال میں جیتے تھے اور انہوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردعمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا۔۔۔ اور منٹو کو میرے اس زہد، حسابیت، پلاننگ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

...... مجھے منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لیے بمبئی بلایا تھا۔ میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے، ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی۔ اچانک اس نے انگریزی میں کہا:

"I like you,though I hate you."

...... ڈیڑھ سال بعد ہم فلمستان کی کنٹین میں بیٹھے تھے۔ لنچ کا وقت تھا۔ منٹو کی میز پر حسب دستور راجہ مہدی علی خان، واچا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں برابر کی میز پر اپنی یونٹ کے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے واہ کرم سنسکار اور کپال کریا۔۔۔ یعنی مردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم۔۔۔ کا ذکر چلا تو منٹو نے دانت پیس کر کہا:

''اشک جب مرے گا تو اس کی کپال کریا میں کروں گا۔''

...... میں کے۔ ای۔ ایم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دے دیا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا:

''منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا۔''

جب گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا: میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔ تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لیے جواب دے دیا تھا ورنہ منٹو سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ رہا منٹو، تو اس نفرت کے باوجود، جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا، اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے پھکڑ پنے میں منٹو کو بنا دیکھے، بنا جانے، بنا پڑھے اس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ منٹو کی ایک کہانی ''خوشیا'' ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور راجندر سنگھ بیدی اس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے سنانا نہ بھولتے اور میں لکھتا تو انہیں جا سناتا۔ دونوں مل کر ہم عصروں کے افسانوں پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ اور جیسا کہ جوانی میں ہوتا ہے، ہماری آراء خاصی تیز اور حکمی ہوتیں۔ بیدی نے ''خوشیا'' کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی، نہ اسے دیکھا تھا۔ ''سرگزشت اسیر'' کے نام سے ''ہیوگو'' کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے بغل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال ''خوشیا'' کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں میں جانتا تھا۔ اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی تینوں سے بڑا ہوں اور اس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے، ''ڈاچی''، ''کونپل''، ''قفس'' وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبع زاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لیے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ''خوشیا'' پڑھتے وقت بھی میں پہلے سے مصنف کے خلاف بدظن تھا۔ ''خوشیا'' مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا، حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے، تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ ''خوشیا'' حقیقی کردار نہیں، بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اس زمانے میں باقاعدہ اس گلی کی سیر کرتے تھے اور ان کی وساطت سے مجھے اس کے آداب وقواعد سے خاصی واقفیت تھی۔ نچلے طبقے کی طوائفوں کے (جیسی کہ خوشیا کی کانتا ہے) دلال ان سے پہلے

ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا، اسی لیے میرا خیال تھا کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے دماغ میں تھیں۔ یوں بھی پھکڑ پنے کے دن تھے، کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی، جو منہ میں آیا بک دیتے تھے، اس لیے میں نے کہا:

''دو کوڑی کی کہانی ہے۔''

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا، لیکن بیدی نہیں بھولا۔۔۔ جب کچھ عرصے کے بعد وہ دہلی گیا اور وہاں منٹو نے (جو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں آ گیا تھا) اپنی عادت کے مطابق اسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے 'خوشیا' کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلی سے واپس آ کر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمہاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے اس لیے میں نے اس اطلاع کو سنا ان سنا کر دیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں جب کرشن چندر کے بلاوے پر میں دلی ریڈیو سٹیشن گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لیے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدل ملے گا۔ اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا!

دہلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتا چل گیا، اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشمکش بھری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا اس لیے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشہ بنیں؟ لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا اور دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھا تھا اس لیے میری کوششیں بارآور نہیں ہوئیں۔ ریڈیو کا دفتر ان دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے سٹیشن ڈائریکٹر، پروگرام ڈائریکٹر اور میوزک ڈیپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ چھوٹے کمروں میں سے (جو شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے) ایک میں راشد، دوسرے میں کرشن اور تیسرے میں منٹو بیٹھتے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرشن سٹوڈیو میں (جو سڑک کے دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا) گیا ہوا تھا اور میں کوئی فیچر لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا

آیا اور ادھر ادھر کی بات کر کے اس نے ''خوشیا'' کی بات چھیڑی۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں میری کہانی 'خوشیا' پسند نہیں آئی۔'' وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ''تمہیں اس میں کیا پسند نہیں آیا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں، میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم مزے سے کام کرو اور مجھے کام کرنے دو، فضول کے بحث مباحثے میں مت پڑو، لوگ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کیوں تماشا بنیں؟

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اس نے ہاتھ کی جنبش سے، جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے، وہی سوال دہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی۔ مجبوراً میں نے کہا:

''کہانی وہ اچھی ہے لیکن حقیقی نہیں۔''

''کیوں حقیقی نہیں؟''

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا:

''تمہیں ایک خیال سوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے ردعمل کو قلمبند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیا واقعی دلال ہوتا، کانتا اس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اسے وہیں دبوچ لیتا۔۔۔ تم نے جو کچھ لکھا وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے، ان پڑھ دلال نہیں۔''

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو لمحہ بھر چپ رہا پھر تلملا کر بولا:

''ہاں ہاں، میں وہ دلال ہوں، منٹو وہ دلال ہے۔ تمہیں افسانہ نویسی کا علم بھی ہے! تم خود کیا لکھتے ہو؟''

لیکن اسی وقت کرشن چندر آ گیا یا مجھے اڈوانی (سٹیشن ڈائریکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہوا، بہر حال وہ قصہ وہیں ختم ہو گیا۔

۔۔۔لیکن وہ قصہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ دل میں جو چپقلش رہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہیں بھول سکا۔ گذشتہ سال 'نقوش' کے کسی خاص نمبر میں اردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا۔ اس وقت، جب اردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے (ادھر میرے جو افسانے اردو میں چھپے بھی ہیں وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں) مجھے آٹھ برس ہونے کو آئے ہیں اور میرے احباب اور اردو کے

ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا۔ 'خوشیا' کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا!

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ منٹو سے میری چشمک نہ ہو، میں اپنی میز بھی اٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اترتا، دوستوں میں جاتا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

ان دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا۔ کرشن چندر ڈرامے کا انچارج تھا۔ میں ہندی صلاح کار تھا، اور چونکہ اس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈراما بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا: ''بولو بھئی، کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟'' موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا، اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا، کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈراما لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈرامہ آرٹسٹ غلام محمد، رندھیر (جواب فلم ایکٹر ہیں)، تاج محمد وغیرہ اسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انہیں ڈرامہ سنایا بھی کرتا تھا اور وہ سن کر ''منٹو صاحب، آپ ڈرامے کے بادشاہ ہیں،'' کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اڑایا کرتے تھے۔ جاوید اور حسرت صاحب سے منٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا اور اڈوانی اس سے اس لیے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ کے سکریٹری تھے۔ ریڈیو سٹیشن پر ہر وقت 'منٹو صاحب'، 'منٹو صاحب' ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ لنچ کے وقت کبھی اس کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی آ کھڑا ہوتا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اس کا ساتھ نہ دیتے مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں کرشن سے کہا:

''دیکھو بھائی، تم منٹو کو سمجھا دو، وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے، میں طرح دے جاتا ہوں۔''

''تم بھی اسے تنگ کرو۔'' کرشن نے کہا، ''میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا!''

اور اس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کرلیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اس کی کہانی ''دھؤاں'' شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تلا ہوا تھا اور چونکہ میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لئے میں نے اپنا طرزِ عمل طے کرلیا تھا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا:

''میں نے تمہاری کہانی 'دھؤاں' پڑھی۔''

''کیسی لگی؟''

''اچھی ہے، اب تم 'چپٹی' پر لکھو۔''

منٹو لحہ بھر چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا:

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دہرادی: ''بس اب تم چپٹی پر لکھو۔''

اس وقت عصمت نے ''لحاف'' نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا اس لیے اس نے کہا:

''تم کیا جھک مارتے ہو؟ میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔''

اس وقت میرا مجموعہ ''پاپی'' چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت: چھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لیے طرح دے کر میں نے کہا:

''میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑو، لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو جیسی جھک مارتے ہو وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ''کروٹ'' میں تم نے ''ماہم'' کے افسانے ''رین'' کی کہانی چرالی ہے۔ ''روح کا ناٹک'' پورے کا پورا ترجمہ کردیا ہے (اس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا) اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا لیکن طبع زاد تو لکھتا ہوں۔ میری اچھی بری چیز میری اپنی ہے کسی دوسرے کی چرائی ہوئی تو نہیں۔''

منٹو جلا اٹھا لیکن میں وہاں نہیں رکا، کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا اس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہوگیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اس نے پھر مجھ سے افسانے کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر

طرح دے کر نکل گیا اور سٹوڈیو چلا گیا۔ منٹو نے سٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اسی شام دشوامتر عادل اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مدن موہن بھلہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے انہیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ اس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ ''ادبِ لطیف'' میں اس نے افسانے کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا بکواس ہے، وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا کیونکہ تماشائی بڑے خوش تھے اور منٹو کیا کہتا ہے، وہ مجھے رائی رتی بتانا نہ بھولتے تھے۔ لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ ناخواستہ مجھے وہ سب کرنا پڑ رہا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا۔ 'خوشیا' کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ 'نیا قانون'، 'منتر'، 'شوشو'، 'ڈرپوک'، 'موسم کی شرارت'، 'ہتک'، 'مسز ڈی کوسٹا' مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلی میں رہا میں نے کبھی منٹو کے سامنے اس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی اس لیے خوشامد کرنے پر وہ اگرچہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا لیکن خوشامدی کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلی بلا کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا اس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی۔ منٹو اس طرفداری کا فائدہ اٹھا لیتا تھا لیکن کرشن کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہ تھی۔ وہ اسے بھی گالیاں دیتا تھا۔ چونکہ ان دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کرے، یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زوروں سے کرتا۔ غرضیکہ خاصی چپقلش رہتی تھی۔

ان دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت، اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن کھل کر نہ کھیلتے تھے لیکن انہوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبروریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے

پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لیے تمھیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑ ہانکی، تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا، لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع۔۔۔ یعنی 'نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی'۔۔۔ پر افسانے لکھے۔ منٹو نے ''بلاؤز'' اور میں نے ''ابال''۔ دونوں افسانے ''ساقی'' دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالنامے میں) چھپے۔ 'ابال' کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اسے اس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ 'بلاؤز' اور 'ابال' اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا ذکر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں 'بلاؤز' کے انجام کی حقیقت کوری حقیقت ہے۔ وہاں 'ابال' کے انجام میں نوکر کی ٹریجڈی کے ساتھ سماجی ٹریجڈی بھی پنہاں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (Social Realism) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت، جیسی بھی ہے، اس کا خاکہ کھینچنے تک ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی جائزہ لینا چاہیے؟ یہ بحث طویل ہے اور 'فن برائے فن' اور 'فن برائے زندگی' کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہرحال منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو، جیسا کہ میں نے دیکھا، میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا تقریباً انہیں حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اسی کے حربوں کو اس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:

''میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا: 'منٹو بھائی...... آگل راستہ نہیں ملے گا...... کار موٹر روک لو۔۔۔ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ، اور میں باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔''

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ اڑی تھی کہ اسے فلم میں نوکری مل گئی ہے۔ لیکن دو سال بعد اس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا...... باجو کی گلی سے...... آگل کا راستہ نہ ملنے پر...... بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے۔ 'کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے!' کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ وہ لگایا کرتے تھے وہ تھا...... 'سر قائم، جنگ دائم۔۔۔' اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہوگا اس لیے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پیٹنے سے پٹنا مشکل ہے۔ پٹو، لیکن پیٹنے والے کو نہ چھوڑو۔ میری صحت تو لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لڑتا لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی اور کشمکش حیات میں جہاں جہاں بھی معرکہ پڑا ہے میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے کو پیٹ دیا ہے!

منٹو سے میرا دو بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دہلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دہلی میں میں نے اسے زک دے دی، لیکن بمبئی میں ہماری جوڑ برابر رہی۔

'دھواں' کے سلسلے میں ہم میں جو چشمک ہوئی اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لیے ڈھال بن جاتا تھا اس لیے میرا اوار اوچھا پڑتا تھا لیکن اس دوران میں اپنے زعم میں منٹو، راشد سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ انہیں دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ ''ماورا'' کے نام سے شائع ہوا جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے ''نیلی رگیں'' کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں راشد کی نظموں سے الفاظ لے کر ان کا مذاق اڑایا۔

ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھئے:

سعید (شاعر): کرشن، تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن: ٹھنڈے ہاتھ......؟

سعید: ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو......اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں......ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں۔۔۔کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں یوں داخل ہوں جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آ نکلے۔

کرشن (مذاق کے طور پر): اپنی دم سے لالٹین باندھے۔نہیں۔چاند کی ڈلی چوستا ہوا ادھر آ نکلے۔تمہیں آج ہو کیا گیا ہے سعید؟ یہ ٹھنڈی یخ عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوئی؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا، راشد کی نادر تشبیہوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈھ لیا اور بات آئی گئی ہوگئی، لیکن راشد اسے نہیں بھولے۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔راشد ٹائپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر انہوں نے مسودہ واپس کیا۔

''کیسا ہے؟''منٹو نے پوچھا۔

''نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔''راشد نے اس استہزاء آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔ اور منٹو (بقول خود) کباب ہوگیا۔اس کے بعد منٹو ہفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کوستا رہا۔اپنے کسی دوست سے اس نے راشد کی نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے پڑوسی بھی تھے، منٹو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔تاہم مجھے پشیمان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اواخر یا ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سنہ مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام ایگزیکٹو) ہوگئے۔راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا۔بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو سٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈیول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کا کہنا مانتے تھے۔پروگرام ڈائریکٹر تک بیسیوں باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے اور بہت سی باتیں کرشن براہِ راست ڈائریکٹر سے منظور کرا لیتا تھا۔راشد کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل تھا۔انہیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن ان کو نظر انداز کر جائے۔اس لیے انہوں نے اس کو لکھنؤ بھجوا دیا۔لیکن کرشن کی تبدیلی

جن حالات میں ہوئی (راشد نے ان کی غیر حاضری میں ان کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور چونکہ بخاری صاحب تک راشد کی براہ راست رسائی تھی اس لیے فوراً تبادلہ کرا دیا) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا۔ راشد امید رکھتے تھے کہ میں ان کی تائید کروں گا لیکن جب میں نے کرشن کی طرف داری کی تو، باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا بیٹھنا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر (سریندر چوپڑہ) کو گانٹھ لیا۔ اس کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سوٹ اسے پرزنٹ کیا اور یوں اسے اپنی طرف ملا لیا۔ اڈوانی چونکہ مجھ سے خوش تھے اسلئے انہوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لیے کہا۔ منٹو کا ڈرامہ شیڈیول پر تھا۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اس کی ریہرسلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران میں لکھنؤ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے کے لیے پہنچا۔۔۔ نہایت بدصورت، لمبا تڑنگا، چپٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اس دن کا کام نمٹانے لگا، لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اس لکھنؤی پی۔ اے (پروگرام اسسٹنٹ) کو سمجھایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اسے اچھی نہ لگی تھی۔ اس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمہاری ہے۔ اشک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو، جواب دہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے کام کر رہا تھا کہ منٹو اس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا۔

میرا دھیان مسودے میں لگا ہوا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ آپ کی کرسی ہے۔''

ساتھ ہی اس نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''آپ ادھر آ جائیے۔''

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ پی۔اے کی آنکھوں میں تحکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا:

''میں اوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں، آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آ جائیے گا۔''

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصے کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔اے ان سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں ان کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل انہیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر ان سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا، کیونکہ ایک بار جب جنگل صاحب نے مجھے پی۔اے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب، جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے، اس کی انگیخت پر، مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ انہوں نے ہی مجھے بھیجا تھا، لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی فاتحانہ چمک میرے دل میں دور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اسی غصے میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ استعفٰی دے دوں، پھر خود ہی اس پر ہنسی آ گئی۔ جھلایا ہوا اوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی وہی چمک پھر سامنے آ گئی۔ خدا گواہ ہے اگر منٹو اس لکھنوی پی۔اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا۔ اور منٹو کو دہلی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام کرنا میرے لیے یکسر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔ راشد پر غصہ آتا، اس لکھنؤی پی۔اے پر غصہ آتا، لیکن سب سے زیادہ غصہ آتا منٹو پر: اس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی۔اے ہے، نہ راشد ہے، منٹو ہے۔ اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزا چکھاؤں گا۔ میرے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اس میں منٹو کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اس میں ایک لفظ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔ کچھ پہلے کا غصہ اور کچھ تازہ ہتک کا گھاؤ کام وام چھوڑ کر میں بس کہنیاں میز پر ٹکا، ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے مہرشی چانکیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان اس سے وابستہ تھا یا بچپن سے والد محترم سے اس مہرشی کے کارنامے سن سن کر میں نے اسی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہرحال، ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آئی میری سمجھ اور سوچ کی قوتیں اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں

اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے، میں نے کبھی معاف نہیں کیا۔ اور یہ بات کتنی ہی بری کیوں نہ ہو، اس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف مصیبت سے نکلا ہوں بلکہ ایک قدم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ یہ لکھنؤی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اسے بھڑکایا، لیکن جو منٹو کے کہنے میں آ گیا اس کی حماقت میں کیا شک ہے؟ اس وقت بھی ہندی میں میرا کافی نام تھا۔ اس نے میرا نام نہ سنا ہو، ایسی بات نہیں۔ وہ سمجھ دار ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آلہ کار بنایا جائے، اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا۔ لکھنؤی پی۔ اے سینہ تانے، چپٹی ناک چڑھائے، نتھنے پھلائے، لکھنؤ کے اپنے قصے سنا رہا تھا کہ کیسے جب صاحب (جو اس وقت لکھنؤ کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے) اسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ، پاؤں کرسی پر رکھے، گھٹنے باہوں میں دبائے، ہمہ تن گوش اس کی لن ترانیاں سن رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو چوپڑہ صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے ان لکھنؤی حضرت سے کہا:

''مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس سٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی؟''

اور میں نے اسے شام کو گھر پر چائے کے لیے مدعو کر دیا۔

میں ان دنوں تیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پلا کر میں اس لکھنؤی احمق کو رج پر لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگاتار اپنی تعریفیں کرتا رہا کہ کس طرح اس نے ڈرامے لکھے، کس طرح جب صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (Script) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح انہوں نے اس کی سفارش کر کے اسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اس کی شخصیت کی تعریف کی۔ اسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اس سے خوف کھائیں گے، ورنہ آرٹسٹ تو اچھے سے اچھے کو بدھو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈکاسٹ ہوں انہیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ (Vet) کرے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک

بھی چیز پڑھے اور ویٹ کیے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا۔

"اب جب آپ آ گئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں" میں نے کہا، "تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی اردو مسودے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے سن کر ویٹ کیا کیجئے اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجئے، کیونکہ خراب ڈرامہ براڈ کاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔"

اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیڈیول تو تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بنا کر گیا تھا۔ میں مہینے دوسرے مہینے ڈرامہ لکھتا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈراما منٹو کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھ یاد ہے) "آوارہ"۔ پلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے ان دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن اس لکھنؤ ی پی۔ اے نے اس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا۔ میں اسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اسے سنانے لگا۔ اس کو زبان وغیرہ یا ڈرامے وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا:

"کیوں صاحب، اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے گا؟"

اور وہ کہتا:

"ہاں ہاں، یہ بہتر ہے۔"

اور میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا۔ یہ وہ خود بخود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامے کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ تین اختتام تجویز کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس لکھنؤ ی پی۔ اے نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے، بڑا خام ہے۔ اس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈ کاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے، ان کو اپنا پرانا بدلہ نکالنے کا موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے وہ چند الفاظ بھی، جن پر میں نے لال پنسل سے گول دائرے بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں گیا اور اس نے راشد اور لکھنوی پی۔ اے کو بے نقط سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہوگا تو بنا ایک لفظ کٹے ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

میں اوپر نوبی کلارک، انگریزی اناؤنسر، کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کمرے کا روشن دان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اٹھ کر روشن دان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ انہوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہوگا تو انہیں تبدیلیوں کے ساتھ ہوگا ورنہ نہیں ہوگا اور ڈیوی ایشن (Deviation) یعنی جدول کے انحراف کی ذمہ داری ان کی نہیں ہوگی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے؟ اور منٹو پنجرے میں بند شیر کی طرح تلملا رہا تھا اور تقریباً دھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہوگا تو اسی روپ میں ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں، اردو کا ٹائپ رائٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو چالیس روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے لیے تھے اور اوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا اس سب کا صلہ چند لمحوں کی اس کی اس تلملاہٹ میں مجھے مل گیا۔

''سنار دی ٹھک ٹھک، لوہار دی اکوسٹ۔'' میں نے من ہی من میں پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انہوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائریکٹر کے کام میں مداخلت سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال، ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے معمور میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر پھیلا کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا۔۔۔ آنکھوں کے سامنے منٹو کی تلملاہٹ، اس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں، اس کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں۔۔۔ سب کچھ گھوم گیا۔۔۔ اور اس تلملاہٹ کا باعث میں تھا۔۔۔ میں جو درحقیقت اسے چاہتا تھا، اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس کے افسانوں کا اس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مداح تھا۔۔۔ میں، جس نے دو ایک مہینے پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ''چرواہے'' اس

کے نام معنون کیا تھا۔

'چرواہے' کا نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

منٹو کے نام

جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت برا

میرے اس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے!

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامے کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنؤ ی پی۔ اے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو، دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو۔ لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا، اگر وہ ڈرامہ نہ ہوتو اس کی جگہ دوسرا ڈرامہ چننے کی بات تھی، اس لیے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اٹھائی۔ لکھنؤ ی پی۔ اے نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی، سو اس نے پڑھ دی۔ بہر حال، منٹو کی تنقید ہو اور وہ بھی بھری میٹنگ میں، یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ لکھنؤ ی پی۔ اے کی سمجھ کے بارے میں اس نے دو تین تیز باتیں کیں، اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے پھر غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے۔۔۔ اور چونکہ سب قطع برید میں نے کی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں منٹو نے کیا کہا، لیکن غصے میں اس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ تکنیک کے ضمن میں میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجے میں کہا کہ میں تمھیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اوپر میرے کمرے میں آ ؤ تو تمھیں بتاؤں ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی، لیکن شور سن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔ طے ہوا کہ ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں ہوگا اور چونکہ اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جدول سے انحراف نہیں ہوگا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رکا۔ اس نے ٹائپ رائٹر اٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوپہر کو خورشید صاحب (سیکرٹری انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ) کا فون آیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر

براڈ کاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ خورشید صاحب نے منگوایا تھا اور پھر انہوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ راشد چونکہ تلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں کریں گے اس لیے منٹو نے خورشید صاحب کے ذریعے اسے کینسل کرا دیا تھا)۔

تیسرے دن بھی منٹو دفتر نہیں آیا۔ ڈرامہ اس نے منگوالیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری ووکری اسے کچھ نہیں ملی تھی اور بمبئی میں اسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں 'فلستان' میں اسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اس کا دوست نذیر جا کر اس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

''وہ تمہارا لال کیا ہوا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔'' اچانک منٹو نے کہا۔

یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصہ تھا نہ اس لکھنؤی پی۔ اے پر بلکہ منٹو پر تھا۔ اسی طرح منٹو کو بھی ان دونوں کی بجائے مجھی پر غصہ تھا۔ اس کا ڈرامہ میں نے کاٹا ہے، یہ بات وہ جان گیا تھا۔

''اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

''دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر ہمیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے 'فلستان' کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں، آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور چخ چخ رہی تو کیا فائدہ؟''

''نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔''

اور اس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا:

"I like you, though I hate you."

اس دن گھر آ کر میں نے صفیہ بھابھی سے کہا:

''دیکھیے، منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے۔ میں نہیں آ رہا تھا۔ دو بار تار دینے پر آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ 'آوارہ' کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دہلی کے اس واقعے کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشہ بنے ہیں۔ اب اس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجیے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں

تنگ ہوں گے۔''

منٹو اور صفیہ بھابھی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی، اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کیے لیکن 'ہاں' کردی۔ لیکن جب بعد میں میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقع ہی نہ آنے دوں گا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو۔ اور بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سے مل کر میں نے 'فلستان'، اس کے کرتا دھرتا ششدھر مکرجی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار اہم باتوں کا پتہ چلا:

۱۔ فلستان کا باس مکرجی زمانہ قدیم کے سادیت پسند ان داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار ان سے کام لیتے تھے۔

۲۔ فلستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے۔

۳۔ جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔

۴۔ فلستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے شاہد لطیف اور سنتوشی کو فلستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح بے ضرر ہوگیا؟ خود اس نے ہی مجھے وہاں بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے فلستان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا، لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ کوشلیا ٹریننگ لینے بمبئی جا رہی تھی لہٰذا میں بھی تیار ہوگیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی۔ لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ اس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا اس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی، لیکن اس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس قصے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے، اور خاصا دلچسپ ہے، اس لیے میں اس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دہلی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا۔ اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں، جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے، وہ مجھے اچھا لگا تھا...... گورا چٹا رنگ، پتلا چھریرا جسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر استہزاء آمیز مسکراہٹ۔ منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں میں 'منتر'، 'نیا قانون' اور شاید 'مسز ڈی کوسٹا' پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کی بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنالی تھی۔ لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لیے جو پارٹ ڈھل گئے تھے ان سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایمان کو راشد نے جواب دلوا دیا تھا۔ چڈھا، میراجی اور راجہ مہدی علی خاں، راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہو جاتی، خاصی چپقلش بھی رہتی تھی لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا۔۔۔ منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اسے ڈھیلا کر دیا۔۔۔ منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد۔۔۔ ٹھیک سنہ مجھے یاد نہیں، اس کا افسانہ ''بو'' شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے اس کے بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ میں نے 'بو' کی خوب تعریف کی۔ مجھے 'بو' کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی، میں اس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابک دستی سے 'بو' میں سمویا ہے وہ نہ صرف قابل داد ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال بھی شامل ہیں اور یشپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر ہندی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانے کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ 'بو' ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے جوڑ کا افسانہ بیدی کا ''لاجونتی'' ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اردو ادب میں اس کی ٹکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ 'لاجونتی' میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بہر حال مجھے خیال ہوتا ہے کہ 'بو' کے بارے میں جو خط میں نے چودھری نذیر احمد کو لکھا اس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اس کا خلاصہ انہیں بھیج دیا۔ کیونکہ جب میں بمبئی گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رخ کچھ ڈھیلا ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائریکٹر نتن بوس فلمستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی، غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق بمبئی میں ہوئی۔ منٹو اگر شراب نہ پیے ہوتا اور دہلی کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے 'آوارہ' کے اس مسودے کا ذکر نہ کرتا، جسے میں نے کاٹ چھانٹ دیا تھا، تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو کدورت تھی وہ دھل گئی ہے۔ منٹو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعے کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلمستان میں اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا یا شاہد کا یا میرا یا سنتوشی کا گٹ بن جاتا تو منٹو کو تکلیف ہوتی، اس لیے اس نے میری مخالفت کی۔ جس وقت اس نے مجھے بلایا اس وقت شاہد لطیف اور سنتوشی فلمستان چھوڑ چکے تھے اور منٹو، مکرجی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمہارے مکالموں کے پرخچے اڑا دے گا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے لیکن تمہاری جان ضیق میں آ جائے گی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اڑائی تھیں اس کا انتقام لینے کی ترکیب اس نے یوں نکالی تھی۔ اور چونکہ میں 'ہاں' کر چکا تھا اور دہلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کر لی ہے اس لیے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلمستان میں اپنا لائحہ عمل طے کر لیا۔

میں نے اس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کیے جب تک فلمستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی (یہ پہلی احتیاط تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔) اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی نتن بوس کے لیے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائیلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم ''مزدور'' تھا اور دوسرا ''سفر'' جسے مترا نے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی میں نے لکھے اور یوں فلمستان میں ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نت جھگڑے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا پہلا

فلم 'مزدور' خواہ باکس آفس پر کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائیلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا فلم 'سفر' باکس آفس پر بھی کامیاب رہا اور ظاہر ہے میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا۔ تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکر جی مان گئے۔ منٹو کے دونوں فلم ''چل چل رے نوجوان'' اور ''شکاری'' دو دو سال لینے کے باوجود ناکام رہے تھے اس لیے اشوک کمار میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ، جو میرے ذہن میں تھے، سنائے۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں۔ لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا۔ میں اس وقت پونے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے میں لکھوں گا۔ اگر چہ اشوک کمار، مکر جی کا سالا تھا لیکن ان دنوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک کمار نے کہا کہ آپ مکر جی سے کہیے۔ لیکن مکر جی مجھ سے خوش نہ تھے، میں نے انکار کر دیا۔ تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چنی لال سے کہوں گا، آپ بات کر لیجئے گا، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالیے۔

منٹو کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اس نے واچا کو ساتھ ملا لیا۔ واچا اشوک کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کو انہوں نے اس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منٹو نئے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اس کا مہورت ہو جائے گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لیے ''آٹھ دن'' کے فلمانے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں، یہ ایک الگ لمبی کہانی ہے۔ لیکن چونکہ منٹو نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، بغیر معاوضہ لیے ہوئے افسانہ لکھ دینا منظور کر لیا (یہ اور بات ہے جب آدھی فلم بن گئی تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا۔) اور اچھی خاصی سازش کر کے میرا پتا کاٹ دیا، اس لیے مجھے بہت برا لگا۔۔۔ خصوصاً اس وقت جب میں افسانے کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔ مہورت ہو گیا۔ مکر جی مجھ سے خوش نہ تھے، اس لیے سوائے اس کے کہ میں زہر کا گھونٹ پی کر چپ رہ جاتا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے منٹو سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی۔ 'آٹھ دن' کا ڈائریکٹر فلمستان کا ایڈیٹر دتارام پائی مقرر ہوا تھا۔ اگرچہ ڈائریکشن تو اشوک ہی کرتا تھا لیکن چونکہ بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لیے اس کی چلتی تھی۔ میں نے پائی کو ساتھ ملایا اور 'آٹھ دن' میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا معمولی رول تھا لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (Retake) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ پنڈت طوطا رام چونکہ ہندی بولتا تھا اس لئے پنڈت کے سب ڈائیلاگ میں لکھتا تھا۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو میں چار کر دیتا، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اس کے دو کر دیتا۔ مجھے سٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ناٹک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لیے وہ مضحکہ خیز رول میں کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے۔ اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو ان کے ساتھ ہی بمبئی ٹاکیز میں چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا۔) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا۔ جب میں بچ گئی سے الہ آباد آتے ہوئے اشوک سے ملا، میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کہانی لکھی تھی لیکن ہم نے کمال امروہی کی کہانی "محل" لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمہارے والی کہانی بنائیں گے، لیکن اس نے نہیں سنا۔

درحقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا۔ اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنہیں کبھی اس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ آگے راستہ بند ہے، کار موٹر نہیں چلے گی تو وہ باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹھیاں اشوک اور واچا کو ملی تھیں، لیکن سٹوڈیو کو آگ لگانا اور خود بے کار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاہد لطیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے۔ منٹو کے بددل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا۔ منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا!

لیکن منٹو کی اس رن چھوڑیت اور باری صاحب کی رن چھوڑیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی رن چھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا جب کہ منٹو کی رن چھوڑیت اس کی زبردست

انانیت کے باعث تھی۔ اور اس کی اسی انانیت میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر ان کی خوشنودی کے لیے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا، بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی، اپنے فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ لیکن غالب کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالب سے بڑا ہے!)، اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے، ان پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائریکٹروں کی محفل میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے (جسے منٹو 'بکواس' اور دوسرے بذلہ سنجی کا نام دیتے تھے۔) لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اس کی 'انا' کو ٹھیس نہیں پہنچی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کمتر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ کہ سب لوگ خواہ منٹو کو سنکی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اول درجے کا ڈائیلاگ رائٹر سمجھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اس میٹنگ میں، جہاں راشد نے، میں نے اور اس لکھنؤی پی۔ اے۔ نے اس کے ڈرامے کی "تنقید" کی، اور بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو میں، جہاں اشوک اور واچا، اس کے جگری دوستوں نے اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی۔ اور جب اس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کے لیے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی موٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہتک برداشت کرتا ہوا بھی وہیں پر جما رہتا، لیکن منٹو کی انانیت کے لیے وہ ہتک ناقابل برداشت تھی اور چونکہ پٹ کر پیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا اس لیے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری بار تو اس کی جان پر آ بنی لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (فارمل یا۔ ان فارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو فلمستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں، جب میں نے کنٹریکٹ پر دستخط نہ کیے تھے اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں اور میں مکرجی کو غالب کے بجائے مہادیوی ورما کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا، لیکن اس سلسلے میں ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے، ٹھیک مہینہ مجھے یاد نہیں۔ بمبئی میں امریکہ کا (یا انگلستان کا،

یہ بھی مجھے یاد نہیں۔) ایک مشہور ایکٹر آیا تھا۔ میں نے اس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بمبئی میں وہ ایک دو سٹوڈیوز میں گیا۔ رائے بہادر چنی لال نے اسے فلمستان میں بھی مدعو کیا۔ شام کو فلمستان کی کنٹین میں، جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میزیں لگا دی گئیں اور ششدھر مکرجی، گیان مکرجی، اشوک، واچا، چنلکر، برمن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن میں جانا تھا اس لیے اسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ منٹو حسب معمول باسز (Bosses) کے ساتھ بیٹھا بقول شیام اپنی بذلہ سنجی ان پر ضائع کرتا رہا۔ میں، نیپالی، برمن وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترا سامنہ۔ جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو شکنجے میں کس کر چپٹا کر دیا ہو، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ ان کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ روپے اور نام کی کشش نے اس حور کو اس لنگور کے پہلو میں لا بٹھایا تھا۔ بہرحال اس کے آگے آگے رائے بہادر چنی لال اور مکرجی آئے۔ کنٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی میزیں لگی تھیں۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا۔ منٹو، اشوک اور واچا کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن ایک تو اس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے، دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی مالکوں میں سے تھے۔ مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واچا اٹھ کر چھوٹی میز پر چنلکر کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے منٹو کو بھی اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس افراتفری میں، جب مہمان بیٹھ رہے تھے، منٹو چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا: ''کیوں؟''

''چلو چلیں''

''کیوں؟''

''سب بکواس ہے۔''

''بیٹھو۔'' میں نے کہا، ''جہاں اس بکواس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔''

لیکن منٹو نہیں رکا، خاموشی سے کنٹین سے نکل گیا۔

'گنجے فرشتے' میں منٹو نے شیام پر سکیچ لکھا ہے۔ اس میں اس کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ لاہور میں شیام آیا تو اس کے ملنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی 'انا' کو بار بار ٹھیس لگتی تھی۔ منٹو لکھتا ہے:

''شیام نے مجھ سے کہا۔۔۔ میرے ساتھ رہو۔ لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اس سے وعدہ کر کے کہ رات کو میں اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا، چلا گیا۔''

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اس کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ تھی، اس کی انا تھی۔ اس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اس امریکی (یا انگریزی) ایکٹر کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ مکرجی نے جب منٹو کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ یک لخت اداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ منٹو شیام سے ملنے فلیٹی بھی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملتا تھا تو عموماً شیام نہیں منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا، لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں، اس بات سے منٹو کو، جو اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہو گی۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا لیکن پٹنا نہیں، پدانا جانتا تھا لیکن پدنا نہیں۔ اسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا؟ (اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے۔) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چبھ سکتی ہے، اسے وہ اونچے درجے کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے۔۔۔ ٹالسٹائی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں انہوں نے اس کے خلاف لکھا۔ بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انہیں روپیہ

بے دریغ اور بچگانی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہیے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیے۔ صفحۂ قرطاس پر زندگی کی دبی چھپی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابک دستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن ان دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعوی کرنے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا۔

میں جن دنوں دہلی گیا منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا۔ اس کا نام تھا ''ترقی پسند''۔۔۔ چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ دیوندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لیے پہلی فرصت میں میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ بیدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے، ستیارتھی کو بھی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہو۔ بہر حال وہ اپنے کنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہوگئے اور صبح وشام اسے افسانے سنانے لگے۔

بیدی اس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اس کے پاس تھے۔ جگہ زیادہ نہیں تھی۔ پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا یوں بھی مشکل۔۔۔ بیدی تھکا ہارا شام کو گھر آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سنانے کے لیے تیار رہتے۔ سن کر نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اٹھتا تو اسے تصحیح شدہ افسانہ سننا پڑتا۔۔۔ مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی ''ترقی پسند'' کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف آخر میں منٹو نے ذرا افسانوی پیچ دے دیا ہے کہ پرمارتھی ('ترقی پسند' میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے کہ اس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لیے بھی غسل خانہ ہی بہتر جگہ خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔۔۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دل چسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ (بیدی کے منہ سے سنا ہوا) منٹو نے قلم بند کردیا، اس لیے مجھے برا لگا۔۔۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھو یار! میں اس واقعے پر افسانہ لکھ رہا ہوں، تمہیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں، ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو کے سے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں؟ خیال آیا تو اسے قلم بند کردیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعے کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہوسکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انہوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کرلیا اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات واطوار، شکل وشباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اڑایا تھا اسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھا اور منٹو کی ذاتی زندگی اور خامیوں کو اجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انہوں نے ہی لکھی بھی تھی۔ بیدی نے اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے پتے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کے تعلق ہے، بے حد اچھی اتری۔ نام ہے۔۔۔"نئے دیوتا"۔

"اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن ('نئے دیوتا' میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کما لیتا ہوگا۔ ڈیڑھ سو روپے کے لیے اس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی؟۔۔۔ غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا جا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔۔۔ ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے۔۔۔"

اور یوں شروع کر کے 'نئے دیوتا' کے لکھنے والوں نے نفاست حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات وسکنات، عادات واطوار، سفلے پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا کہ منٹو بلبلا اٹھا۔ بعد میں، جیسا کہ اس کی عادت تھی، اس نے خود اپنی سنک اور سفلے پن کی تشہیر شروع کر دی[9]۔

'نئے دیوتا' کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی عزت کسی بھی وقت اتار کر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا۔ دوست احباب، جب اکٹھے ہوتے، کسی نہ کسی بہانے اس کہانی کا یا ستیارتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اسے چھیڑتے۔ منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا، دنیا جہان کا مذاق اڑاتے ہوئے، مذاق کیے جانے پر کسی طرح سیخ پا ہو جاتا تھا، اس کا ایک واقعہ آج بھی

---

(۹) جوگیشوری کالج کے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا: "البتہ جب میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں تو مجھے اپنا یہ سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے"۔ (لذتِ سنگ)

مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا۔ لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکھٹے ہوئے تھے۔ غپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب کی سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کیے، گھٹنوں کو باہوں میں دبائے، اکڑوں بیٹھا تھا۔ راشد، قدوسی اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے ہوئے تھے۔ (اختر الایمان اور میرا جی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے یا شاید تھے، مجھے یاد نہیں۔) حفیظ جاوید نیچے دری پر، دیوار سے پیٹھ لگائے، گھٹنوں پر ٹانگ رکھے، ادھ لیٹے ادھ بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی اس لیے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چیسٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا۔ تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کاٹا: ''لیکن 'نئے دیوتا' تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔''

''واہ!'' کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سنتے ہی چوکنا ہو بیٹھا تھا اور کرشن کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

تب کسی نے منٹو سے کہا: ''ارے یار ستیارتھی کیا کھا کر ویسا افسانہ لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔''

''بیدی کا تو نہیں۔'' تیسرے نے کہا، ''لکھا تو ستیارتھی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پتے لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے۔''

''ہم نے سنا ہے فیض کا بھی ہاتھ ہے......''

اس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کیے، سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا:

''بیدی اور فیض کیا اس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، تبسم کا ہاتھ ہے، سنت سنگھ سیکھوں اور موہن سنگھ کا ہاتھ ہے، منٹو از این انسٹی ٹیوشن......''

تب مجھے نہ جانے کیا سوجھا، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقع دیئے بغیر میں نے کہا:

''اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ وہ شیام لال کپور تھانہ، ''گورو گھنٹال'' کا ایڈیٹر، وہ

بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا......"

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا منٹو جھنجلا کر اٹھا اور اس نے غصے سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیئے۔

کوئی دوسرا موقع ہوتا، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جما دیتا، لیکن لڑنے کی طرح مذاق کا بھی ایک فن ہے۔ مذاق مذاق میں جو چڑ جاتا ہے، گالی دیتا ہے یا ہاتھ اٹھاتا ہے دراصل وہی پٹ جاتا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زیادہ زور سے ہنس دیئے۔ کرشن نہیں ہنسا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا: "کیا کرتے ہو؟" اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے اوپر قابو پالیا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا:

"ڈونٹ مائنڈ اٹ۔"

اس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا لیکن دوسری بار، مجھے یاد ہے، منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

فلمستان کے زمانے کی بات ہے۔ "آٹھ دن" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا مزاحیہ رول لے لیا تھا۔ چونکہ دن کو سٹوڈیو خالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لیے 'آٹھ دن' کی بیشتر شوٹنگ رات کو ہوتی۔ منٹو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اس کے اشغال دوسرے تھے۔ لیکن جب سے میں نے بکرم بڑھا کر 'آٹھ دن' میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں ردوبدل کرنے لگا تھا۔۔۔ منٹو رات کو بھی سیٹ پر آ جاتا تھا۔ رات کو وہ پیا پلایا کرتا تھا اور سیٹ پر آنا اسے بے حد شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں اس کے مکالموں کو 'مسخ' نہ کر دوں، اس بات کا اسے ڈر تھا۔

اشوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اس نے جو زیادتی کی تھی اس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا اور اس کو تنگ کرنے کے درپے تھا۔ لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شاذ ہی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر رہے۔ اس موقعے پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھا، لیکن سننے والوں کو غلطی اسی کی معلوم ہوئی۔

'آٹھ دن' کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر پنج گنی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا، مجھے پنڈت کی حیثیت سے

ہیرو کی شادی کرتا تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے، ننگے بدن پر جنیو پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے، سر پر پنڈتوں سی پگڑی سجائے ویدی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے (یہ پارٹ لیلا مصرا کر رہی تھیں۔) میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آ گیا: ''تو کیا میں جھک مار رہا ہوں؟''

یا شاید یہ فقرہ تھا:

''میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا۔''

بہر حال، جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا۔ اشوک ہدایات دے رہے تھے۔ منٹو چپ ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا:

''میں یہ ڈائی لاگ نہیں بول سکتا۔''

''کیوں؟'' اشوک نے پوچھا۔

''جھک مارنا ہنسا بھرا شبد ہے۔ ویدی پر بیٹھا ہوا، ویدوں کا دکتا، دھرم پرائن برہمن ایسا واکیہ کبھی نہیں بول سکتا۔''

''لیکن یہ محاورہ ہے۔'' منٹو تمک کر اٹھا۔

''بہت سے ایسے محاورے بھی ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں لیکن شریف لوگ نہیں بولتے۔ اسی طرح ویدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔'' میں بولا۔

''لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں۔''

''جھک کیا ہے، مچھلی۔ جھک مارنا، مچھلی مارنا۔۔۔ مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا۔''

''بنگال کے لوگ مچھلی مارتے ہی نہیں بلکہ کھاتے بھی ہیں۔''

''لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے۔''

''تم بکواس کرتے ہو۔'' منٹو جھلا اٹھا، ''تمہیں یہ فقرہ بولنا ہوگا۔''

''میں یہ فقرہ نہیں بول سکتا، میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔''

''میں بھی برہمن ہوں۔'' منٹو گرجا۔

''برہمن تمہارے اجداد ہوں گے۔ اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔''

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اس وقت بھی ہنسی آ رہی تھی لیکن اوپرسے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت ویدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت لچر تھا لیکن جو لوگ فلمی دنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے لچر اعتراض وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں۔ اعتراض کے لچر ہونے کے باوجود، برہمن اسے بول سکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال نے اسے ایک دم وزن عطا کر دیا۔ فلمی دنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ناستک وہاں مہورت کرتا ہے۔ (حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثات ہوتے ہیں، فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر خسارہ اٹھاتے ہیں) میری بات اشوک اور واچا کو ٹھیک لگی۔ منٹو نے گالی دی تو میرا پلہ اور بھی بھاری ہو گیا۔ اور چونکہ میں محض مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا:

"دیکھو منٹو، میں پہلوان نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلوان نہیں ہو اور تم نے لب بھی کھولے تو میں تمہیں اٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دوں گا۔"

معاملے نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے۔ شوٹنگ رک گئی۔ انہیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈز پڑ جائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے۔ (یا شاید مجھے لے گئے، یہ مجھے یاد نہیں۔) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ پھر کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے ہی نہیں مناظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے (سالے والے تو وہ کہتا ہی رہتا تھا۔) لیکن کرشن کبھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا تھا۔ دو موقعوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے مجھے گالی دی۔ ان دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا۔ (مکرجی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لیے سنتوشی کو پھر بلا لیا تھا اور 'آٹھ دن' کے لیے اس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن منٹو سنتوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا، اس لئے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا۔) ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے کہ سیڑھیاں

چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم نت نئی گالیاں تصنیف کرنے میں یکتا تھے۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں ''بھیشم'' لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا اور اپنے سینئر ایڈیٹر جناب ساگر چند گورکھا کے ساتھ (جو بعد میں روزنامہ ''پرتاپ'' کے مزاحیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبے میں گم نامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔) ریلوے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا لڑکپن کا دوست کلونت سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ دور ہی سے اس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال چال پوچھا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اس سے بغل گیر ہو گیا۔ (آج یہ بات ایک خواب کی سی معلوم ہوتی ہے اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے لیکن جالندھر سے لاہور جانے والے اشک اور الٰہ آباد کے اشک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔) گورکھا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے انہیں سمجھایا کہ وہ میرا لنگوٹیا یار تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں خیر مقدم کی یہ پرانی رسم ہے...... کاش منٹو میں اور مجھ میں ایسا یارانہ ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالی دے سکتے۔ لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی اس میں بے تکلفی نہ تھی، یارانہ نہ تھا، سرپرستی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے باعث میں گالی نہ دے سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا:

''دیکھو منٹو، تم امرتسر کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں۔ میں گالیاں دوں گا تو تمہاری طبیعت صاف ہو جائے گی۔۔۔۔ دوبارہ تم مجھے کبھی گالی مت دینا۔''

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کپال کریا کرنے کی خواہش میں ضرور ظاہر ہوئی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا۔

منٹو جب گالی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا مادہ اس میں تھا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے؟ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا اور ہم لڑنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں برابر مل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما، ایک دوسرے کے پینترے کو کاٹ کر شہ دینے والے مہروں کی طرح۔

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو، ایسی بات نہیں۔ لیکن ہماری 'انا' یا احتیاط مخل کر ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تنا رہا، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تنا رہا۔ ٹھیک سنہ مجھے یاد نہیں لیکن کرشن لکھنؤ جا چکا تھا، راشد پروگرام ڈائریکٹر کی کرسی پر جا براجے تھے۔ چوپڑا صاحب کو ابھی منٹو نے پھانسا نہیں تھا۔ منٹو کو مخالفت کا حلقہ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا، دیے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی لکھ رہا تھا۔ کوشلیا اندباورچی خانے میں کھانا پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی: ''اشک''

منٹو!۔۔۔ مجھے خیال آیا۔۔۔ اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر (۹۔ حسن بلڈنگز، کشمیری گیٹ) میں تین چار بار گیا تھا لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا حالانکہ میں تیس ہزاری میں بھیرو کے مندر کے سامنے رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو دور رہا وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے۔ (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا۔)

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا، نہ اٹھ کر دروازہ کھولا کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوئی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے۔

''اشک!'' وہی کرخت، تیکھی، قدرے چڑچڑی آواز۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ منٹو، صفیہ بھابھی اور ان کے ساتھ ایک گورا چٹا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور تیکھے ناک نقشے والا نوجوان۔۔۔ تینوں اندر آئے۔

منٹو نے تعارف کرایا:

''یہ مسعود پرویز ہے۔ (میرا بھتیجا یا میرا دوست، منٹو نے کیا کہا، مجھے یاد نہیں۔) تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا چلو ملا لائیں۔''

میرے پاس اس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منوہر لال بھارگو، میونسپل کمشنر دہلی، نے کمال مہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لیے بارکوں جیسے ۲۶ کوارٹر بنا رکھے تھے۔ جس وقت کا ذکر ہے راشد ایک نمبر میں، میں تین نمبر میں اور کرشن پانچ نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں ایک طرف ایک کرسی میز کام کرنے کے لیے لگی تھی اور دوسری طرف ایک دری اور جاجم فرش پر بچھی تھی۔۔۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں

نے کہا: "بیٹھو بیٹھو" اور کوشلیا کو آواز دی کہ دیکھو منٹو اور صفیہ بھابھی آئے ہیں۔ منٹو اور پرویز بیٹھ گئے، صفیہ بھابھی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک صفیہ، کوشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آ گئیں۔

مجھے اس ملاقات کی کوئی بات یاد نہیں، سوا اس کے کہ مسعود پرویز کی آنکھیں بڑی خوب صورت تھیں۔ اس کا ناک نقشہ بے حد دل کش تھا۔ میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہوگا۔ (شاید وہ اس وقت کسی فلم کمپنی میں نوکر تھا یا جانے کی کوشش کر رہا تھا۔) منٹو ادھر ادھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنا بیٹھا رہا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پرویز سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس نے میری کون سی چیز پڑھی ہے؟ وہ کب دہلی آیا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ کب تک رہے گا؟ بات چیت کو میں نے ذاتی پیچ نہیں دیا۔ منٹو کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا، بلکہ جب کوشلیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا؟ جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پرویز مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنے شام کے شغل مے نوشی کو چھوڑ کر اسے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا۔ صفیہ بھابھی کوشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی۔ صفیہ، کوشلیا کو چاہتی تھیں اور کوشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی۔ لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اس نے بنایا اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں، اس کے اس طرح آواز دینے میں، میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آ کر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکرگزار ہونا چاہیے تھا۔ باتوں میں اس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی کبھی نہیں آیا، اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ میں پھکو آدمی ہوں، منٹو بھی اول درجے کا پھکو رہا ہے لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا اور پاس دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود، صفیہ بھابھی اور کوشلیا باتیں کر رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا؟ جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہیے اور چونکہ میں منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا، جسے اس نے احساس برتری کے زیر اثر

دبا رکھا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ ہلکا سا رحم کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے ذرا نیچے اترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا۔ لیکن ان بلندیوں سے اسے اتارنے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی۔

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا۔۔۔ دہلی میں بھی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں۔ اور اس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اترنا اسے منظور نہ ہوا۔

بمبئی میں جب ۱۹۴۵ء کے اگست میں میرے گھر لڑکا پیدا ہوا تو مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اچانک ایک دن منٹو نے سٹوڈیو میں کہا:

''صفیہ آئی ہے۔ وہ کوشلیا سے ملنا چاہتی ہے۔ تم ذرا اسے لے جاؤ۔''

میں ''مزدور'' کے ڈائیلاگ لکھ رہا تھا اور منٹو اور مجھ میں کوئی مقابلہ نہ تھا تو بھی مجھ سے بات کرتے وقت اسے جھلاہٹ ہوتی تھی۔ فلمستان کی کار آ گئی تو منٹو، صفیہ بھابھی کو اوپر سے لے آیا۔ منٹو دفتر کے پورچ تک انہیں چھوڑنے آیا۔ جب وہ کار میں بیٹھ گئیں تو (حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں جائے گا۔) میں نے کہا: ''تم بھی چلو۔''

''نہیں، تم جاؤ!'' منٹو نے تیور چڑھاتے ہوئے کہا اور پیٹھ موڑ کر چلا گیا۔ کار کے سٹارٹ ہونے کا بھی اس نے انتظار نہ کیا۔

میں نے کہا نا کہ ہمارے لیے کردار پہلے سے ڈھل گئے اور ہم انہیں کھیلنے کو مجبور تھے۔ اس میں ہمارے بھکوپنے، انانیت اور ضد ہی کا قصور نہ تھا، خارجی حالات بھی ایسے تھے۔ دوستوں نے ہمیں ایک دوسرے کا حریف مان لیا تو ہماری ہر بات کو وہ اسی روشنی میں دیکھنے لگے۔ ہمارا مطلب ایک دوسرے کو چڑانا ہو یا نہ ہو لیکن دوست ضرور ہماری باتوں کا یہ مطلب نکال لیتے۔ مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آتا ہے۔ منٹو یوں کھادی کا کرتا پاجامہ پہننے کا عادی تھا لیکن ریڈیو کی زندگی میں سوٹ بھی پہنتا تھا۔ اس نے کوئی فلمی کہانی بیچی تھی۔ اس کے روپے آئے تھے یا یوں ہی اس نے ایک بڑھیا سوٹ سلوایا تھا۔ دس یا گیارہ روپے گز کا کپڑا تھا۔ (جو اس زمانے میں کافی مہنگا سمجھا جاتا تھا۔) انہیں دنوں کوشلیا نے نوکری چھوڑ دی۔ تنخواہ اور سال بھر کے پراویڈنٹ فنڈ کے اسے تین سو روپے ملے جس میں سے اس نے میرے لیے ایک عمدہ سوٹ اور شیروانی بنوا دی۔ میں سوٹ پہن کر دفتر میں آیا۔ اتفاق سے میٹنگ کے وقت میں اور منٹو کرشن کے دائیں بائیں بیٹھے۔ کرشن نے پوچھا: ''کہو بھئی، کتنے گز آیا ہے؟'' میں نے کہا: ''بارہ

روپے۔" کرشن، منٹو کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا: "یہ تمھیں کسی میدان میں جتنے نہیں دے گا۔" اس سے پہلے کہ منٹو کوئی جلی کٹی بات کہتا میٹنگ شروع ہوگئی۔

کرشن چندر نے "نئے معمار" کے سلسلے میں منٹو پر لکھتے ہوئے ٹائپ رائٹروں کا ذکر کیا ہے اور اس واقعے کو اچھا خاصا افسانوی رنگ دے دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ منٹو کے پاس دو ٹائپ رائٹر تھے اور میں نے تین لیے تھے۔ بلکہ منٹو کے پاس اردو کا ٹائپ رائٹر تھا اور میں نے اردو، ہندی دونوں کے ٹائپ رائٹر خریدے تھے۔ میرا یہ اقدام کسی طرح منٹو کے مقابلے کے لیے نہیں تھا۔ ہاں دوستوں نے اسے وہ رنگ ضرور دیا اور میرے دو ٹائپ رائٹروں کو لے کر منٹو کو خوب چڑایا۔

بات یہ ہے کہ میں کسی زمانے میں ہولڈر دوات سے فل سکیپ کاغذ پر افسانے لکھتا تھا۔ چونکہ مجھے قطع و برید کا مرض ہے اس لیے کئی بار نصف صفحہ لکھ چکا ہوتا اور چند فقرے کٹ جاتے تو سارے صفحے کو پھر سے لکھنا پڑتا۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے میں نے فل سکیپ کی آدھی سلپوں پر لکھنا شروع کیا کہ اگر کوئی سلپ خراب ہو جائے تو پورا فل سکیپ کاغذ دوبارہ لکھنے کے بجائے نصف لکھنا پڑے۔ اس طرح کہانی لکھ کر میں اخبار میں دے دیتا اور، جیسا کہ میں نے سدرشن جی کو دیکھا تھا، اخبار یا رسالے میں چھپتے ہی اس کی کٹنگ کاٹ کر فائل میں رکھ لیتا۔ اس سے رسالہ خراب ہو جاتا لیکن اپنے پاس افسانے کی کاپی رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا۔ ۱۹۳۵ء میں میں ہندی میں لکھنے لگا۔ انہیں دنوں میں نے ایک غیر معروف جرنلسٹ کو دیکھا کہ وہ پنسل ربڑ لے کر بیٹھتے، جو لفظ، فقرہ یا تشبیہ اچھی نہ لگتی اسے ربڑ سے مٹا کر دوبارہ لکھتے۔ میں Receptive آدمی ہوں۔ جو چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے اسے اپنا لیتا ہوں۔ میں نے سلپوں کا طریقہ ہٹا کر یہ ربڑ اور پنسل والا طریقہ اپنا لیا۔ پہلا مسودہ میں اس طرح اردو میں تیار کرتا، دوسرا ہندی میں لکھ کر کسی پرچے کو بھیج دیتا۔ لیکن ہندی میں ترجمہ کرتے وقت میں کئی بار بڑی خوب صورت ترمیمیں کر دیتا اور جب افسانہ ہندی میں چھپ کر آ جاتا تو ان ترمیموں کو اردو مسودے میں بھی شامل کر لیتا۔ انہیں دنوں دو بار ایسا ہوا کہ میرے ہندی افسانے رسالے کے دفتر میں نہیں پہنچے۔ میں ان دنوں "وشوامتر"، کلکتہ میں لکھا کرتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسالے والوں نے افسانے گم کر دیے ہوں اور اپنی نااہلی کا الزام ڈاک کے سر تھوپ دیا ہو۔ اردو کاپی میرے پاس تھی، لیکن اسے پھر ہندی کرنے میں مجھے بڑی قباحت ہوئی۔ اس کے علاوہ ہندی مسودہ تیار کرتے وقت جو ترمیمیں میں نے کی تھیں وہ میں یکسر بھول گیا اور مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں پنسل اور کاربن سے تین کاپیاں کیا کروں

گا: ایک رسالے کو بھیجا کروں گا، ایک اپنی فائل میں رکھا کروں گا اور ایک فالتو اس غرض سے رکھوں گا کہ اگر کبھی کوئی افسانہ گم ہو جائے یا اسے رسالے کا ایڈیٹر واپس نہ کرے تو میں اسے کسی دوسرے پرچے کو بھیج سکوں۔ ۱۹۳۷ء سے دہلی آنے تک میں برابر افسانوں اور ڈراموں کی تین تین کاپیاں کرتا رہا۔ کام میں ہمیشہ باقاعدگی سے کرتا ہوں، کچھ نہ کچھ لکھتا بھی رہتا ہوں، اس لئے لگاتار تین تین کاپیاں کرنے سے میرے انگوٹھے پر گٹا پڑ گیا اور اگرچہ ادھر برسوں سے میں نے پنسل سے کام نہیں کیا تو بھی وہ گٹا ابھی تک موجود ہے۔ منٹو کو اردو میں ٹائپ کرتے دیکھ کر مجھے وہ طریقہ بہت پسند آیا اور مجھے خواہش ہوئی کہ ایک ٹائپ رائٹر میں بھی خریدلوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کرشن اور دوسرے دوست ٹائپ رائٹر پر ڈرامہ لکھا جاتا دیکھ کر بڑے متاثر اور مرعوب ہوتے تھے۔ بار بار اس کی تعریف کرتے تھے۔ منٹو کو خود بھی اس بات کا زعم تھا کہ وہ جب چاہے، جس موضوع پر چاہے براہ راست ٹائپ رائٹر پر کھٹا کھٹ ٹائپ کر سکتا ہے۔ عام طور پر وہ کرشن سے پوچھتا:

''بولو بھئی کرشن، کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟''

لیکن کئی بار ایسا ہوتا کہ کوئی ریڈیو آرٹسٹ ہی موضوع تجویز کر دیتا۔ ایک بار غلام محمد نے کہا:

''منٹو صاحب! آپ رندھیر پر ڈرامہ لکھیے۔''

اور منٹو نے فوراً ٹائپ رائٹر پر انگلیاں رکھیں اور کاغذ پر الفاظ بننے لگے:

۸۶۷۔ پھر عنوان...... ''رندھیر پہلوان''۔ پھر:

(ڈھور ڈنگروں کے ہانکنے کی آواز۔۔۔ گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ وغیرہ۔۔۔ ان کے ساتھ یہ آواز بھی آتی ہے: اے تجھے سانپ کاٹے۔۔۔ تیری ٹانگ ٹوٹ جائے۔۔۔ ذیل کا گیت شروع ہو، جس کے عقب میں گائے بیلوں کے ڈکارنے اور ان کی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے۔)

پھر کسی نے ایک دن کہا:

''منٹو صاحب! کبوتری پر ڈرامہ لکھیے۔''

اور منٹو نے فوراً ٹائپ رائٹر کھٹکھٹانا شروع کر دیا:

(مرغ کی اذان...... پتھریلے زینے پر قدموں کی آواز...... پھر مرغ کی آواز...... قدموں کی آواز...... دو لڑکیوں کے گنگنانے کی آوازیں، جیسے وہ زیرلب پوجن کر رہی ہیں...... یہ گنگناہٹ چند لمحوں تک جاری

رہے.....اس کے بعد آرتی شروع..... آرتی ختم ہو جاتی ہے..... وقفہ..... گھنٹہ ایک بار بجتا ہے......
وقفہ..... دوسری بار بجتا ہے..... پتھریلے زینے پر قدموں کی آواز..... یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ دونوں
لڑکیاں مندر سے باہر نکل رہی ہیں۔)

یہ لمبے ڈیش اور وقفے، جو منٹو کے تمام ریڈیائی ڈراموں میں بکثرت موجود ہیں، اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ساتھ ساتھ سوچتا رہتا تھا۔ بہر حال ایک بار شروع کر کے، ایک آدھ پیرا ٹائپ کرنے کے بعد، وہ سگریٹ سلگا لیتا۔ کچھ لمحوں کے لیے پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ جاتا اور پھر لکھنا شروع کر دیتا۔ ایک بار منٹو نے مجھے بھی یہ گر بتایا تھا کہ کچھ نہ سوجھے تو کوئی شعر یا گیت لکھ دو، اتنے میں اگلے ڈائیلاگ سوچ لو اور کچھ نہ ہو تو نثر میں شاعری شروع کر دو۔

لیکن آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہونے سے پیشتر میں اپنے چند کامیاب ڈرامے جیسے...... ''لکشمی کا سواگت''، ''حقوق کا محافظ''، ''پاپی''، ''سمجھوتہ''، ''چھٹا بیٹا'' وغیرہ لکھ چکا تھا اور ڈرامے کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ ڈرامہ وہی اچھا ہے جو کھیلا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیائی ڈرامے کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور اس کے سننے والوں کی تعداد اس وقت بھی سٹیج کا ناٹک دیکھنے والوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ دس برس پہلے تو یہ بُعد اور بھی گہرا تھا، کیونکہ اب تو آزادی کے بعد لوگ سٹیج کانشس (Stage Conscious) ہوتے جا رہے ہیں اور سکولوں، کالجوں اور ایمچر سٹیج پر ناٹک دھڑا دھڑ کھیلے جا رہے ہیں۔ اس وقت شاذ ہی کبھی ناٹک کھیلا جاتا تھا۔ کبھی ہوتا بھی تھا تو کسی انگریزی ناٹک کا ترجمہ۔ لیکن چونکہ مجھے لڑکپن ہی سے سٹیج کے ساتھ دل بستگی تھی اس لیے میں اس کے احیاء کے لیے شروع سے کوشاں تھا اور میری یہ کوشش تھی کہ میں ایسے ڈرامے لکھوں جو آسانی سے کم خرچ پر کھیلے جائیں اور جب کوئی ایمچر کلب یا سکول ڈرامہ کھیلنا چاہے تو انگریزی سے ترجمہ کرنے کے بجائے اسے ہندوستانی ڈرامہ مل سکے۔ میرا یہ خیال کتنا صحیح تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج میرے ناٹک کشمیر سے ترویندرم اور پنجاب سے بنگال تک کھیلے جاتے ہیں، پڑھے جاتے ہیں، پڑھائے جاتے ہیں اور میرے ڈراموں کے مجموعے افسانوں یا ناولوں سے زیادہ بکتے ہیں۔

منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا مجھ پر کچھ بھی رعب نہیں پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک ریڈیائی ڈرامے کا تعلق ہے منٹو نے تکنیک کے نئے اور کامیاب تجربے کیے اور ریڈیو تکنیک کے امکانات کا پورا پورا فائدہ اٹھایا، لیکن منٹو کے کچھ ڈرامے دیکھنے اور سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سٹیج ناٹک کو تھوڑی سی

ترمیم کے بعد ریڈیو ناٹک میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور وہ وقت، جگہ اور ایکشن کے ایجاز کی وجہ سے ریڈیو سننے والوں کے لیے محض ریڈیائی ناٹکوں کے مقابلے میں اگر زیادہ نہیں تو کم دل چسپ بھی ثابت نہ ہوگا۔ اس طرح ہم دونوں کے ناٹکوں کی تکنیک مختلف تھی۔ کرشن، منٹو کے ڈراموں کا قائل تھا۔ لیکن انصار ناصری کو میرے اور بیدی کے ناٹک پسند تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں منٹو نے اور میں نے چند بہت اچھے ناٹک لکھے...... "چوراہے" اور "ازلی راستے" کے بیشتر ڈرامے اسی دور میں لکھے گئے۔

منٹو کے ڈراموں سے میں مرعوب نہیں ہوا، لیکن یہ خواہش ضرور ہوئی کہ ایک دو ناٹک براہ راست ٹائپ رائٹر پر لکھوں اور کرشن کو دکھلا دوں کہ نہ اس طرح کے ریڈیائی فیچر لکھنا مشکل ہیں نہ انھیں براہ راست ٹائپ کرنا۔ اور میں نے ایک دن منٹو کے سامنے ٹائپ رائٹر خریدنے کا ذکر کیا۔ منٹو نے اپنا ٹائپ رائٹر قسطوں سے خریدا تھا۔ شاید ایجنٹ اس کا واقف تھا۔ یوں منٹو کا گھر ریمنگٹن اینڈ کمپنی، کشمیری گیٹ کے نزدیک ہی تھا۔ ایک دن ایجنٹ دفتر میں آیا۔ میں نے کانٹریکٹ بھر دیا۔ وہ کانٹریکٹ اب بھی میرے پاس موجود ہے اور اس پر گواہ کے طور پر منٹو کے دستخط ہیں۔ منٹو یہ چاہتا تھا کہ میں بھی اسی کی طرح قسطوں پر ٹائپ رائٹر لے لوں۔ میں نے کانٹریکٹ کیا بھی، لیکن قسطوں پر لینے میں ۲۳۳ روپے کے ٹائپ رائٹر کے تین، سوا تین سو روپے مجھے دینے پڑتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سال ڈیڑھ سال کا عرصہ اور چھوٹی قسط تھی، لیکن مجھے اتنی تھوڑی رقم کا ۷۵ روپے سود بہت زیادہ معلوم ہوا۔ اس لیے جب ایجنٹ پہلی قسط لینے آیا تو میں نے اسے سارے کا سارا روپیہ دے دیا اور یوں دوستوں کے دل میں اپنے لیے نفرت کا ایک اور جواز پیدا کر لیا۔ منٹو ہو، کرشن ہو یا راشد...... تینوں پیسہ جوڑنے کے سخت خلاف تھے۔ جو آیا اڑا دیا، بلکہ اگر قرض مل گیا تو اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ میں ڈھائی سو روپے ٹائپ رائٹر کے لیے یک مشت دے سکتا ہوں، جب کہ وہ قسطوں پر مل جاتا ہے۔ یہ بات منٹو کو اچھی نہ لگی۔ پیسہ دراصل میں بھی نہ جوڑتا تھا، لیکن پہلی بیوی کی وفات کے بعد ساٹھ روپے کی حقیر رقم کے لیے (جو میں نے ایک عزیز سے ادھار لی تھی۔) مجھے خاصا ذلیل ہونا پڑا تھا اور میں نے طے کیا تھا کہ میں کبھی کسی سے ادھار نہ لوں گا اور جس طرح بھی ہو کچھ نہ کچھ پس انداز کروں گا۔ جب میں نے ریڈیو کی ملازمت کی تو میرے پاس ڈیڑھ ہزار روپے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس طرح ٹائپ رائٹر پر منٹو کے ڈرامے لکھنے کو لے کر دوست مجھے چڑایا کرتے تھے اسی طرح میرے یک مشت روپیہ دے دینے پر انھوں نے منٹو کو چڑایا۔ اور جب ایک آدھ ماہ ٹائپ رائٹر پر پریکٹس کرنے کے بعد (مجھے زیادہ وقت پیش نہیں آئی کیونکہ انگریزی ٹائپ کرنا مجھے آتا تھا۔) میں

نے براہ راست ٹائپ رائٹر پر ایک فیچر تیار کر کے کرشن کو دیا تو دوستوں نے منٹو سے کہا:

"لو بھئی منٹو، تمہارا اجارا ختم ہوا۔"

لیکن چونکہ اس وقت تک میں اردو میں بھی برابر لکھتا تھا اور ڈرامے ہندی رسم الخط میں کم اور اردو میں زیادہ لکھتا تھا اس لیے میں نے کئی دوستوں سے کہہ رکھا تھا کہ ریمنگٹن کے پاس تو اس وقت اردو کا ٹائپ رائٹر نہیں ہے لیکن اگر کسی دوست کے پاس اردو ٹائپ رائٹر برائے فروخت ہو تو مجھے بتا دیں۔ ان دوستوں میں ایک جرنلسٹ دوست بھی تھے جو آج آل انڈیا ریڈیو کے بڑے عہدے پر فائز ہیں لیکن اس وقت ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے ہاں پبلسٹی افسر تھے ان کے کسی دوست کے پاس ایک ٹائپ رائٹر تھا۔ انہوں نے منٹو سے کہا کہ بھئی اشک کو ضرورت ہے، ایک سو دس روپے میں یہ دینے کو تیار ہیں، تم اشک کو لے دو۔ ان صاحب نے شوق میں ٹائپ رائٹر لے لیا تھا لیکن اسے استعمال نہ کر سکے تھے اور اس میں زنگ لگ گیا تھا۔۔۔ منٹو ٹائپ رائٹر کو گھر لے گیا۔ وہ مشین کو کھولنا اور صاف کرنا جانتا تھا۔ اس نے اس مشین کو بھی اچھی طرح صاف کیا۔ پٹرول کی پوری بوتل اس میں صرف کر دی اور دوسرے دن مجھے لا کر مشین دکھائی کہ اس کے ایک دوست کی ہے، بالکل چلی نہیں، تم چاہو تو خرید لو۔

میں نے مشین کو چلا کر دیکھا تو مجھے وہ بہت پسند آئی۔ میری ہندی والی مشین نئی ہونے کے باوجود بہت بھاری تھی اور یہ اردو والی مشین پرانی تھی لیکن بڑی رواں تھی۔ میں نے منٹو سے دام پوچھے۔ اس نے کہا:

"میرے دوست نے تو تین سو میں خریدی تھی لیکن وہ ڈیڑھ سو میں دے دے گا۔"

میں نے چپراسی کے ہاتھ چیک بک منگائی، لیکن جب میں چیک کاٹنے لگا تو منٹو نے کہا:

"تم ابھی ایک سو دس روپے کا چیک کاٹ دو، چالیس روپے نقد اگلے ماہ دے دینا۔"

مجھے یہ بات عجیب تو معلوم ہوئی لیکن میں نے اس وقت ایک سو دس روپے کا ایک چیک کاٹ دیا اور دوسرے مہینے تنخواہ کے دن منٹو کو چالیس روپے نقد دے دیے۔

کئی ماہ بعد اچانک وہ جرنلسٹ دوست مجھ سے دفتر میں ملنے آئے۔ میں نے اردو مشین کا کوئی ذکر نہ کیا چنانچہ انہوں نے خود ہی کہا:

"بھئی وہ مشین ایک سو دس روپے میں میں نے بھجوائی تھی۔"

"کون سی مشین؟"

"اردو مشین، جو تم نے مانگی تھی۔"

"لیکن وہ تو منٹو نے اپنے دوست سے خرید کردی تھی۔"

"میرے دوست کے پاس تھی۔ وہ تو ڈیڑھ سو مانگ رہا تھا لیکن میں نے ایک سو دس میں فیصلہ کردیا تھا۔"

"مگر منٹو نے تو مجھ سے ڈیڑھ سو روپے لیے۔"

دوست کو بڑا افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا:

"میں باہر جا رہا تھا اور منٹو سے کہہ گیا تھا کہ اشک نے ایک بار مشین کا ذکر کیا تھا، یہ اسے دلا دو، اور بات ایک سو دس کی ہوئی تھی۔"

ان کے جانے کے بعد میں نیچے گیا تو میں نے منٹو سے کہا:

"تم نے مجھ سے ٹھیک بات کیوں نہیں کہی۔ چالیس روپے کے لیے جھوٹ کیوں بولا؟"

"میں نے کہا یہ اشک سب سے سودا کرتا ہے، ہم بھی اس سے ایک سودا کرلیں۔"

منٹو نے آنکھیں نکال کر کہا، لیکن اس کے چہرے پر اچانک آ جانے والے کھسیانے پن کو اس کی آنکھیں نہ چھپا سکیں!

"یہ تم نے اس وقت کیوں نہ کہا؟" میں بولا، "اگر تم کہتے، دیکھو بھائی، یہ مشین خواہ میں نے مفت لی ہو لیکن تمہیں اس کے ڈیڑھ سو روپے دینے ہوں گے تو میں اس صورت میں بھی مشین لے لیتا۔ لیکن تم چالیس روپے کے لیے جھوٹ بولے، اس کا مجھے رنج ہے۔"

چونکہ اس وقت تک منٹو سے میرے تعلقات کافی بگڑ چکے تھے اس لیے اس سے زیادہ بات نہ ہوئی۔

بہرحال، اردو کا ٹائپ رائٹر آ گیا تو میں دونوں ٹائپ رائٹر لے کر دفتر آنے لگا اور دوست منٹو کو چڑانے لگے۔ مجھے ایک شام یاد ہے۔ ہم دونوں دفتر سے ایک ساتھ نکلے۔ منٹو کے دائیں ہاتھ میں ٹائپ رائٹر اور بائیں ہاتھ میں نفیس چمڑے کا بیگ تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ٹائپ رائٹر تھے۔ (ہم لوگ ایکسچینج بلڈنگ تک پیدل آتے تھے اور وہاں سے تانگہ لیتے تھے۔) اس شام کو دوستوں نے منٹو کو اتنا چڑایا کہ وہ جھلا کر بولا:

"میں یہ ٹائپ رائٹر سالا بیچ دوں گا اور پن سے لکھا کروں گا۔"

لیکن منٹو نے ڈرامہ کبھی پن سے نہیں لکھا اور نہ اپنا اردو کا ٹائپ رائٹر فروخت کیا۔ حالانکہ ''نئے ادب کے معمار'' کے سلسلے میں کرشن چندر نے ایسا لکھا ہے۔ منٹو جب تک دہلی کے ریڈیو سٹیشن پر رہا ڈرامہ ہمیشہ ٹائپ کرتا رہا۔ جب میں اس کی دعوت پر بمبئی گیا اور اسی کے گھر ٹھہرا اس وقت بھی ٹائپ رائٹر اس کے پاس تھا حالانکہ منٹو نے اسے برس بھر سے استعمال نہ کیا تھا۔ فلستان کے سٹوڈیو میں میں نے کبھی اسے ٹائپ رائٹر لاتے نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ریڈیو سٹیشن پر منٹو ہفتے میں ایک ڈرامہ دیتا تھا۔ خاصی جلدی میں اسے ڈرامے لکھنے پڑتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنی جلدی ڈرامہ لکھنا ہو، اس میں سٹیج کی ضروریات کو ملحوظ نہ رکھنا ہو تو ٹائپ رائٹر سے بہتر کوئی دوسری چیز نہیں۔ بمبئی میں ایسی کوئی جلدی نہ تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ سین ہوتا تھا اور اس کے لیے بیس میل سے ٹائپ رائٹر اٹھائے لانا بالکل بے معنی تھا۔

ٹائپ رائٹروں کی یاد آتے ہی کیموس لیدر کے بڑے سے سفید ٹکڑے اور برش کی یاد آتی ہے جو منٹو ہمیشہ اپنے ٹائپ رائٹر کے اندر رکھتا تھا۔ صبح آتے ہی میٹنگ کے بعد وہ جب اپنی میز پر کیس سے ٹائپ رائٹر نکال کر رکھتا تو پہلے برش سے ٹائپ کے حروف صاف کرتا، پھر لیدر کے اس ٹکڑے سے اسے صاف کر کے چمکا دیتا اور پھر اپنے چمڑے کے خوب صورت بیگ سے کاغذوں کی فائل نکالتا اور ڈراما ٹائپ کرنے بیٹھتا۔ منٹو میں سعادت تھی یا نہیں؟ یہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا، لیکن نفاست ضرور تھی اور اس لحاظ سے ستیارتھی نے اپنی کہانی ''نئے دیوتا'' میں اس کا نام نفاست حسن ٹھیک ہی رکھا تھا۔ منٹو گندے غلیظ ہوٹلوں یا ریستورانوں میں شراب پی لیتا تھا، میں نے خود اسے دو بار خاصے گندے ہوٹلوں میں شراب پیتے دیکھا، لیکن اس کے گھر کی ہر چیز میں اس کی نفاست پسندی عیاں تھی۔ اس کی بیوی باہر گئی ہو تو اسے خود گھر کی صفائی کرنے میں عار نہ ہوتا۔ جس صبر سے وہ اپنی مشین صاف کرتا تھا اسی طرح، وقت پڑنے پر، اپنا گھر بھی خود ہی صاف کر لیتا تھا۔ ایک بار میں دہلی، کی ملازمت کے اوائل میں کرشن چندر کے ساتھ اس کے گھر، نمبر ۹۔ حسن بلڈنگز، نکلسن روڈ، دہلی گیا تو اسے ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے کمرے صاف کرتے پایا۔۔۔ کھادی کا کرتا پاجامہ دھول سے قدرے میلا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کے چھوٹے کمرے کو صاف کر کے مٹی دہلیز کے باہر نکال رہا تھا۔ غالباً کچھ تھک بھی گیا تھا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گڑھوں سے ایک دم باہر نکالتے ہوئے اس نے ہماری طرف دیکھا اور اشارہ کیا کہ بیٹھک میں چلو۔ اس کی وہ باہر کو نکلی ہوئی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ میں آج تک ان کی یاد فراموش نہ کر سکا۔

حسن بلڈنگز میں دو منزلیں ہیں اور پندرہ بیس ایک جیسے فلیٹ ہیں۔ پہلی منزل میں آنگن آدھا چھتا

اور کشادہ ہے، اوپر کی منزل میں آنگن اتنا ہی ہے جتنا نیچے چھتا ہوا۔ منٹو پہلی منزل میں رہتا تھا۔ دو بڑے اور ایک چھوٹا کمرہ۔ کچن الگ۔ منٹو نے ایک ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا، ایک سونے کا کمرہ۔ چھوٹا کمرہ غالباً سامان کا تھا۔ کھانے کی میز باہر چھت کے نیچے ایک طرف لگی رہتی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر منٹو آ گیا۔ کرشن کو شاید نئے ڈرامے کا مسودہ درکار تھا۔ منٹو نے ایک دراز سے بڑی خوب صورت فائلیں نکالیں جن میں پیتل کے چمچماتے پیپر کلپ لگے تھے۔ دراصل ریڈیو سے جو فائلیں ملتی تھیں منٹو انہیں درمیان سے کاٹ کر ان کے دونوں صفحے الگ الگ کر لیتا تھا، پھر مسودہ دونوں صفحوں میں رکھ کر فائل میں دائیں بائیں طرف اوپر، درمیان میں اور نیچے پیتل کے تین پیپر کلپ لگا لیتا تھا۔ ہر ناٹک اس نے اسی طرح سنوار کر پیلی، نیلی یا گلابی فائل میں لگا رکھا تھا۔ میں منٹو کی کسی اور چیز سے مرعوب ہوا یا نہیں لیکن اس نفاست پسندی اور باقاعدگی سے ضرور متاثر ہوا۔۔۔ اپنے مسودوں کو اس کا یوں سنبھال کر رکھنا مجھے بہت بھایا اور گھر آ کر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ بازار گیا، ڈھونڈ ڈھانڈ کر کہیں سے سو پیپر کلپ لایا اور دفتر کی فائلوں کو دو حصوں میں منقسم کر کے اوپر کے صفحے پر ٹائپ رائٹر سے کہانی یا ناٹک کا نام لکھ کر منٹو ہی کی طرح میں نے اپنے مسودے پیتل کے چمکتے ہوئے پیپر کلپوں سے باندھ دیئے۔ اس طرح نہ صرف کاربن اور پنسل سے لکھ کر تین تین کاپیاں کرنے سے نجات ملی بلکہ رسالے کو پھاڑ کر افسانے کی کاپی رکھنے اور یوں کتاب مرتب کرنے کی کوفت سے مکتی پائی۔

منٹو نے اپنی کہانی کا کیا معاوضہ لیا؟ اپنی کتابوں کی کیا رائلٹی لی؟ اس کا مجھے کچھ زیادہ علم نہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ جو بھی مل جائے لے کر افسانہ، ڈرامہ یا ان کے مجموعے ناشر کو دے سکتا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس نے اپنے بیس اکیس افسانوں کے پہلے مجموعے کا دائمی حق اشاعت دو تین سو روپے میں ناشر کو دے دیا تھا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ بغیر کچھ معاوضہ لیے وہ افسانہ دینے کے خلاف تھا۔ اس کے برعکس کرشن نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی۔ اب کی بات میں نہیں جانتا، اس وقت وہ بغیر پہلے کچھ لیے افسانہ دے دیتا تھا۔ (ایک افسانے کی بات دور رہی، اس نے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''طلسم خیال'' بغیر کچھ پیشگی لیے دے دیا تھا۔) اور چونکہ وہ اپنے افسانے کے لیے معاوضہ نہ لیتا تھا اس لیے رسالوں کے ایڈیٹر اس کی تعریف میں نوٹ چھاپتے تھے، اس کی تصویریں شائع کرتے تھے۔ کرشن کا معاوضہ لینے کا طریقہ مختلف تھا۔ وہ چیز دیتے وقت کچھ نہ طلب کرتا، البتہ بعد میں کسی نہ کسی اشد ضرورت کے پیش نظر کچھ نہ کچھ لے لیتا تھا۔ اس طرح ایڈیٹر کو اپنے اوپر احسان کرنے کا موقع دے دیتا تھا۔ میرا

طریقہ دونوں سے مختلف تھا۔ میں نے آج تک کبھی افسانہ مفت نہیں دیا۔ کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ افسانہ شروع میں چھپتا ہے یا آخر میں۔ حتی الامکان میں نے اس کی پوری قیمت وصول کی۔ ظاہر ہے کہ چودھری نذیر ہوں، مولانا صلاح الدین یا شاہد صاحب، کوئی مجھ سے خوش نہیں رہا۔۔۔ بہر حال منٹو میں اور مجھ میں ایک بات مشترک تھی۔۔۔ وہ بھی افسانہ دیتے وقت معاوضہ (کم یا زیادہ) چاہتا تھا اور میں بھی۔ اسی سلسلے میں دہلی کا ایک دل چسپ واقعہ مجھے یاد ہے۔ دہلی میں ایک صاحب تھے آغا سرخوش۔ اپنے مرحوم والد کی یاد میں، جو مشہور شاعر تھے، ایک رسالہ نکالتے تھے۔ نام بھول رہا ہوں، شاید ''چمنستان''۔ ان کی چھوٹی بہن ریڈیو میں کبھی کبھی ڈراموں میں کام کیا کرتی تھیں اور بعد میں مستقل آرٹسٹ ہوگئی تھیں۔ نام بھلا سا تھا، حجاب یا سحاب قزلباش۔ سرخوش صاحب نے 'چمنستان' میں کرشن کی افسانہ نگاری پر کوئی مضمون شائع کیا تھا۔ کرشن کے افسانے بھی شائع کیے تھے۔ ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔ اور جب کرشن دہلی سے چلے گئے تو کرشن کے خلاف (کرشن نے راشد کی ''ماوراء'' پر جو دیباچہ لکھا تھا، اس میں کسی مغربی شاعر کے تنقیدی مضمون سے لفظ بہ لفظ پیرے چرا لیے تھے، اس سلسلے میں) ایک مضمون بھی شائع کیا تھا۔ بہر حال، آغا سرخوش صاحب ایک دن دفتر میں آئے۔ پست قد کے نوجوان، اور مفت خورے ایڈیٹروں کی بات چیت میں جو مسکینی اور جھجک ہوتی ہے وہ ان کے ہاں بھی تھی۔ میں اوپر کمرے میں بیٹھا تھا۔ انگریزی پروگراموں کے انچارج مسٹر نوبل کلارک حالانکہ پرلے درجے کے پھکو آدمی تھے لیکن تھے وہ انگریز! اور انگریز کا دبدبہ تھا۔ سرخوش جھجکتے جھجکتے اجازت لے کر اندر آئے اور انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ میں ان کو جانتا تھا۔ کرشن کے کمرے میں چوروں کی طرح آتے اور ان کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتے ہوئے میں نے انہیں دیکھا تھا۔ بہر حال میں نے کرسی پیش کی۔ وہ بیٹھے نہیں، کھڑے کھڑے ہی انہوں نے کہا کہ دہلی کے مشہور شاعر اور اپنے بزرگوار کی یاد میں وہ 'چمنستان' کا آغا شاعر قزلباش نمبر نکالنے جا رہے ہیں۔ کرشن نے ایک افسانہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں بھی ایک افسانہ انہیں عنایت کروں۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو بغیر پیشگی معاوضہ لیے افسانہ دیتا نہیں، لیکن چونکہ آپ بڑے کار خیر کے سلسلے میں نمبر نکال رہے ہیں اس لیے اگر منٹو بھی اس میں افسانہ دینے کو تیار ہو تو میں بھی دے دوں گا۔ کرشن تو کبھی پیسے لیتا نہیں اس لیے اس کے افسانہ دینے کی سند نہیں۔

سرخوش صاحب نے کہا:

"میں نے منٹو صاحب سے پوچھا نہیں، لیکن میں ان سے ضرور ملوں گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنا افسانہ مرحمت فرمادیں گے۔"

"ٹھیک!" میں نے کہا، "وہ مرحمت فرمائیں گے تو میں بھی فرمادوں گا۔"

آغا سرخوش کیا کہتے؟ چپ چاپ آداب کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہ ایک طرف سے گئے میں دوسری طرف سے نیچے پہنچا۔ میوزک روم میں اِس سے اس سے باتیں کرتا اس بات کی تاک میں رہا کہ کب وہ منٹو کے کمرے میں جاتے ہیں لیکن وہ کرشن کے کمرے میں ایسے داخل ہوئے کہ نکلنے ہی میں نہ آئے۔ تب میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ کوئی ڈرامہ ٹائپ کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اس نے سر اٹھایا۔

"آغا سرخوش نہیں آئے؟"

"سرخوش؟"

"چمنستان" کے ایڈیٹر آغا شاعر قزلباش کے فرزند ارجمند! کرشن عموماً ان کے رسالے کے لیے کہانیاں لکھا کرتا ہے لیکن اس بار وہ اپنے والد بزرگوار کی یاد میں رسالے کا خاص نمبر نکال رہے ہیں۔ میرے پاس افسانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے تو بغیر معاوضہ لیے افسانہ دیتا نہیں، سو میں نے کہا کہ تم دو تو میں بھی دے دوں گا۔"

میں نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ آغا صاحب جھجکتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے اپنے آنے کی غرض وغایت بیان کی۔

"کتنے روپے دیں گے؟" منٹو نے کہا، "افسانہ آج ہی لکھ دوں گا۔"

اس پر آغا صاحب نے کھیسیں نکال دیں:

"یہ نمبر تو، منٹو صاحب، میں نے اپنے مرحوم والد صاحب کی یاد میں نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ دہلی کے مشہور شاعر۔۔۔"

لیکن منٹو نے انہیں بات ختم نہیں کرنے دی:

"صاحب، آپ اپنے والد کی یاد میں نمبر نکال رہے ہیں، مجھے بھی کچھ پیسے چاہئیں کہ میں اپنے والد کی قبر پر کچھ پھول چڑھاؤں اور نمبر نہیں نکال سکتا تو ایک آدھ پھل دار درخت ہی لگاؤں۔"

اور منٹو نے کچھ اس طرح آنکھیں نکال کر ان کی طرف دیکھا کہ وہ لحظہ بھر کو بھی وہاں نہیں رکے۔ میں اگرچہ ان کے ساتھ ہی باہر آیا لیکن پھر انہیں مجھ سے افسانہ مانگنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

میں اور منٹو ہمیشہ لڑتے ہی نہیں رہے، ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا بھی موقع ملا۔ دہلی میں تو خیر پہلی ہی بات ٹھیک ہے لیکن بمبئی میں، جب منٹو نے مجھے فلمستان میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے بلایا، تو میں آٹھ دس دن اسی کے ہاں رہا اور بعد میں جب میں نے اس بات کا انتظام کرلیا کہ منٹو اور میں ایک یونٹ میں کام نہ کریں، ہم دونوں کئی بار اکٹھے بھی بیٹھے، اکٹھے ہم نے کئی کوشعر اور لطیفے سنائے، رفیع مہدی علی خاں کی غپیں سنیں۔۔۔ اور اگرچہ میں نے تو منٹو کو کبھی اپنی کوئی چیز نہیں سنائی لیکن میں نے اس کی دو تین کہانیاں اس کے منہ سے سنیں اور ''سوراج کے لیے'' تو اس نے میرے سامنے ہی لکھی۔ نصف لکھ کر منٹو نے اسے چھوڑ دیا اور پھر جب دو تین ماہ بعد اسے ختم کیا تو اس نے ساری کہانی مجھے نئے سرے سے سنائی۔

منٹو کلیر روڈ پر رہتا تھا۔ دوسرے مالے پر اس کا فلیٹ تھا۔ مکان پرانی طرز کا تھا اس لیے اس میں کیڈل روڈ یا چوپاٹی یا میرین لائنز جیسے فلیٹ نہ تھے۔ ایک کافی بڑا کمرہ تھا جو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کا کام دیتا تھا۔ ایک دوسرا قدرے چھوٹا کمرہ تھا جس میں ایک پارٹیشن تھی۔ اس کے اس طرف پلنگ بچھا ہوا تھا اور دوسری طرف باورچی خانہ تھا۔ چولہے پر تو بمبئی میں بہت کم کھانا پکتا ہے، لکڑی کی انگیٹھی پر سب کام ہوتا ہے۔

سونے کے کمرے میں سجاوٹ کی اتنی گنجائش نہ تھی حالانکہ پلنگ اور ڈریسنگ ٹیبل خوب صورت تھی، لیکن باہر کا بڑا کمرہ صوفہ سیٹ، میز اور کرسیوں سے خوب سجا ہوا تھا۔ ادھر کے کونے میں چھوٹی سی کھانے کی میز تھی جس کے اردگرد چار یا چھ کرسیاں تھیں۔ اس کے ایک کونے میں الماری تھی جس میں منٹو کے کپڑے اور جوتے تھے۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر ہر چیز قرینے سے بچی تھی۔

منٹو مجھے سٹیشن پر لینے آیا تھا۔ بمبئی سنٹرل پر فرنٹیر میل رکی۔ منٹو سیکنڈ کلاس کے آگے ہی کھڑا تھا۔ اترتے ہی اس نے مجھے بغل میں لے لیا۔ کوشلیا کو چونکہ 'ایڈمرل ہاؤس' جانا تھا اس لیے اس نے وہاں فون کر کے ایک پک اپ منگوانے کے لیے کہا۔ یہ جان کر منٹو کو کچھ جھلاہٹ ہوئی، لیکن اس نے اس کا انتظام کر دیا۔ کوشلیا ایڈمرل ہاؤس چلی گئی اور میں منٹو کے ساتھ کلیر روڈ پہنچا۔ میں اس کے بعد دہلی نہیں گیا۔

پہلے سات دس دن منٹو کے ہاں رہا، پھر کیڈل کورٹ، کیڈل روڈ پر ایک رشتے دار کے ہاں اٹھ گیا۔

ان سات دنوں میں پہلی یاد بمبئی کے مچھر، منٹو کے فلیٹ کے باہر کا شور اور منٹو کا صبح چار بجے اٹھ کر پانی بھرنا ہے۔

پہلی رات منٹو نے میرا بستر بڑے کمرے میں لگا دیا۔ چار پائیاں اور پلنگ بمبئی میں زیادہ نہیں ہوتے۔ لوگ زمین پر سوتے ہیں یا فولڈنگ چار پائیوں پر۔ ایک فولڈنگ بیڈ منٹو نے میرے لیے بچھوا دیا تھا۔ حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا تو بھی اندر کمرے میں گرمی تھی۔ مجھے بمبئی کی آب و ہوا کا علم نہ تھا۔ دلی میں سخت سردی تھی۔ میں بھاری بستر ساتھ لے گیا تھا۔ نئی جگہ، گرم لحاف، فولڈنگ بیڈ اور پھر مچھر۔ بڑی رات تک مجھے نیند نہ آئی۔ اس وقت، جب مجھے محسوس ہوا کہ ابھی آنکھ لگی ہے، اندر کمرے میں کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ میں جاگ گیا۔ سوچتا رہا کہ کیا بات ہے؟ کہیں منٹو کو یا بھابھی کو کوئی تکلیف تو نہیں؟ ایک بار اٹھ کر اندر کے دروازے تک گیا، پھر واپس آ گیا۔ تقریباً آدھ ایک گھنٹے تک یہ آواز آتی رہی۔ میں اتنا پریشان ہوا کہ دوسرے دن جب منٹو نے فولڈنگ بیڈ بچھایا تو میں نے کہا ''یار اندر مجھے نیند نہیں آتی۔ بیڈ بالکونی میں لگا دو۔''

اور منٹو نے بیڈ بالکونی میں لگا دیا۔

لیکن نیند مجھے تب بھی نہ آئی۔ اندر اگر گرمی کی وجہ سے بے چینی رہی تو بالکونی پر شور کی وجہ سے۔ منٹو کا مکان سڑک کے نزدیک تھا اور بمبئی میں ادھر آدھی رات تک موٹریں، بسیں، ٹرامیں کھڑکھڑاتی رہتی ہیں، ادھر علی الصبح ان کا شور شروع ہو جاتا ہے۔ میری نیند خاصی کچی ہے۔ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ بھی اس میں خلل ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ رات کو کئی بار جاگا اور جب بھی میری آنکھ کھلی میں نے کسی نہ کسی بس، ٹرام یا موٹر کو رات کے سناٹے کو چیرتے پایا۔ پھر نہ جانے کس طرح آنکھ لگی۔ جب اٹھا تو رات کا آخری پہر تھا، ہوا میں خنکی تھی، اندر کچن میں پھر پہلی رات کی طرح کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ سوچنے لگا کیا بات ہے؟ ضرور کسی کو کوئی تکلیف ہے۔ لیکن تکلیف ہوتی تو اس کے آثار منٹو یا بھابی کے چہرے پر دکھائی دیتے۔ اس لیے اٹھ کر استفسار کرنے کا ارادہ چھوڑ، چپ چاپ لیٹا رہا۔ جب تک وہ آواز آتی رہی میں نہ سو سکا۔ پھر ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ شاید پہلی ٹرام کلیر روڈ کے باسیوں کو صبح کی آمد آمد کی اطلاع دیتی ہوئی کہیں نزدیک سے نکل گئی اور پھر سونا مشکل ہو گیا۔ صبح اٹھا تو محسوس ہوا جیسے جسم کو کسی نے اوکھلی میں رکھ کر کوٹ دیا ہے۔

ناشتے کے وقت میں نے منٹو سے پوچھا کہ صبح کیا بات تھی، کیا تم اٹھے تھے؟ منٹو نے ایک بڑی سے گالی دیتے ہوئے کہا: ''پانی صبح ہی آتا ہے۔ جب ہم لوگ اٹھتے ہیں تو اوپر کی منزل ہونے کی وجہ سے اس کی بوند تک نہیں آتی اس لیے میں صبح چار بجے اٹھ کر دن بھر کی ضرورت کا پانی بھر لیتا ہوں۔'' اور میں جتنے

دن وہاں رہا اگر چہ ٹراموں اور بسوں کی آوازوں سے مانوس ہو گیا، جب منٹو صبح چار بجے اٹھ کر پانی بھرتا تو ایک بار ضرور میری آنکھ کھل جاتی۔

ان سات دنوں کی یاد کے طور پر دوسری بات جو میرے دماغ میں محفوظ ہے وہ تھا منٹو کا دستر خوان۔ دستر خوان کی جگہ یوں تو وہاں ڈائننگ ٹیبل تھا، لیکن آداب، قاعدہ اس کا دستر خوان ہی کا تھا۔ چھری کانٹے کا وہاں فقدان تھا۔ زمین پر بیٹھنے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور بس۔ صفیہ بھابی کے ہاتھوں کے پکائے ہوئے مرغن پراٹھوں اور سالنوں کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی۔ منٹو بہت کم کھاتا تھا۔ زیادہ پینے کی وجہ سے شاید اس کی بھوک کم ہو گئی تھی۔ لیکن، گھر میں ہو یا سٹوڈیو میں، کھانا اس کے ہاں کا بہت پر تکلف ہوتا تھا۔ اگر چہ میرا معدہ خراب نہیں لیکن ان دنوں مجھے وہم تھا کہ وہ خراب ہے اور میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ میں زیادہ نہ کھا جاؤں، لیکن اس احتیاط کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میں نے ہمیشہ زیادہ کھایا۔

ان سات دنوں کی تیسری یاد یہ ہے کہ گھر میں شاذ ہی منٹو کبھی ادب کے بارے میں بات کرتا تھا۔ دوسروں کا تجربہ کیا ہے؟ میں یہ نہیں جانتا، لیکن میں نے کبھی اسے صفیہ بھابی سے اپنی کسی کہانی یا ناٹک کی بات کرتے نہیں دیکھا۔ منٹو گھر میں خاموش رہتا ہو، یہ بات نہیں۔ ادھر ادھر کی بیسیوں باتیں، مذاق، لطیفے، چٹکلے اس کی زبان سے جھڑتے رہتے۔ مذاق۔۔۔ جن میں طنز ہوتا، باتیں۔۔۔ جن سے اور باتیں نکلتیں اور جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا۔۔۔ اور میں سوچا کرتا، اتنی فروعی اور سطحی باتیں کرنے والا کس طرح 'نیا قانون' اور 'ہتک' جیسے گہرے افسانے لکھ سکتا ہے؟ لیکن جس طرح چیخوف کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا لیکن اپنے ادب کی بات آنے پر ٹال جاتا تھا، اسی طرح منٹو بھی اپنے ادب کی سنگینی کو اپنی بذلہ سنجی میں چھپائے رکھتا تھا۔۔۔ اس سمندر کی طرح جس کے سینے میں بھیانک طوفان مچلتے ہوں لیکن سطح پر ہلکی ہلکی لہروں کے چھینٹوں کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتا ہو!

اور اسی طرح منٹو اپنی انسانیت اور انسان دوستی کو اپنی بے تکی، ٹیڑھی ترچھی باتوں، سوقیانہ لطیفوں، گالیوں اور شراب نوشی میں چھپائے رکھتا تھا۔ مجھے منٹو سے ذاتی شکر رنجی کے باعث کئی بار نفرت ہوئی لیکن میں نے جب جب اس کے افسانے پڑھے میں ہمیشہ اس کی طرف کھنچا۔ منٹو کو اپنے افسانے کی تکنیک پر ناز تھا۔ کرشن نے لکھا ہے:

''منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے۔ ان میں کہیں جھول نہیں آتا، کہیں کچے ٹانکے نہیں ہوتے۔۔۔ استری شدہ، صاف ستھرے افسانے، زبان منجھی ہوئی، سلیس اور سادہ...... '' لیکن

مجھے منٹو کے افسانے تکنیک کے اس کمال کی وجہ سے اچھے نہ لگتے تھے۔ کوئی زمانہ تھا جب ماپا ساں کے افسانے پسند آتے تھے لیکن جوں جوں شعور پختہ ہوتا گیا معلوم ہوتا گیا کہ ان افسانوں کی تکنیک کے کمال میں دراصل بناوٹ مضمر ہے۔ اور جب ویسے دس بیس افسانے ایک ساتھ پڑھے تو وہ بناوٹ، جو افسانے کے انجام میں نہاں رہتی ہے، گراں گزرنے لگی اور تب میں چیخوف کو پڑھا اور محسوس ہوا جیسے اس کے افسانے ماپا ساں، ماہم یا او۔ ہنری کی تکنیک سے یکسر محروم ہیں لیکن اس کے باوجود کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔ افسانہ ختم کرنے پر معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم نے افسانہ پڑھا ہے۔ میں نہیں جانتا منٹو پر چیخوف کا اثر تھا یا نہیں لیکن ایک طرف گورکی اور دوسری طرف ماہم اور اس کی وساطت سے ماپا ساں کا اثر اس پر ضرور تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تکنیک اس کی اپنی تھی۔ گورکی سے اس نے انسان دوستی اور پس ماندہ لوگوں کی محبت اور ترقی پسند نقطہ نظر لیا اور ماہم یا ماپا ساں سے تکنیک کا کمال۔ لیکن منٹو اگر زندہ رہے گا تو تکنیک کے اس کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس انسان دوستی کی وجہ سے جو اس کے افسانوں کے رگ وپے میں رچی ہوئی ہے۔ تکنیک کا وہ کمال، جس کا اسے زعم تھا اور جس کا ذکر کرشن نے کیا ہے، اس کے افسانوں کو کمزور کر دیتا ہے۔ مجھے اس کے افسانے۔۔۔ 'ہتک'، 'سوراج کے لیے' اور 'ننگی آوازیں'۔۔۔ تینوں بہت اچھے لگے۔ تینوں کا نقطہ نظر ترقی پسند ہے اور تینوں میں منٹو کی بے پناہ انسان دوستی نہاں ہے، لیکن تینوں کے انجام میں تصنع ہے۔

'ہتک' ہی کو لیجئے۔ 'ہتک' اس لیے عظیم نہیں کہ ماپا ساں کے 'نکلس' کی طرح اس کا انجام عظیم ہے۔ 'نکلس' کی وہ آخری لائن کاٹ دیجئے افسانہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جائے گا۔ لیکن 'ہتک' میں یہ بات نہیں۔ جب سیٹھ سوگندھی کو ناپسند کر کے بے زاری کی ایک ''اونہہ'' کرتا ہوا موٹر دوڑا کر لے جاتا ہے اور سوگندھی چونکتی ہے، اس کے اندر کی عورت چونکتی ہے۔۔۔ عورت۔۔۔ جو غیر ملوث رہی ہے تو اس کے بعد افسانہ کہیں بھی ختم ہوسکتا ہے۔

اس لیے سوگندھی گھر آ کر جب مادھو کو دیکھتی ہے تو اس بے پناہ غصے کے بعد، جسے منٹو نے چار صفحوں میں بیان کیا ہے، ایک سخت فقرہ، گالی یا ''اونہہ'' جیسی ہی کوئی ہتک آمیز بات کافی تھی۔ وہ اسے کمرے سے باہر کر کے اس کے منہ پر تھوک کر دروازہ بند کرتے ہوئے اسے اسی طرح محو حیرت چھوڑ سکتی تھی جیسے وہ سیٹھ اسے چھوڑ گیا تھا۔ یہ انجام ماہم یا ماپا ساں کا ہوتا۔ منٹو ماہم یا ماپا ساں نہیں۔ اسے ڈرامائی انجام پسند ہیں۔ سو وہ باری باری ایک ایک تصویر اتار کر نیچے بازار میں پھینکتی ہے۔ (حالانکہ حقیقی زندگی میں

پہلی تصویر ہی دو منزل اوپر سے کسی کے سر پر گر کر سارا معاملہ گڑ گوبر کر سکتی تھی۔)

سوگندھی کو معلوم نہیں کہ مادھو اس کے ہاں بیٹھا ہے۔ معلوم ہوتا تو وہ اس سے بدلہ لینے کی اسکیم بناتی کہ وہ پہلے اس کے کیس کی بات پوچھے گی، پھر اس کی تصویر باہر پھینکے گی، پھر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے باہر نکالے گی۔ (منٹو نے یہ ساری اسکیم اپنے دماغ میں بنائی تھی، بالکل اسی طرح جیسے 'خوشیا' میں) سوگندھی کے دماغ میں یہ اسکیم نہ تھی لیکن وہ اسی طرح کرتی گئی جیسے مصنف نے چاہا کہ وہ کرے۔ حقیقی زندگی میں غصہ جب اپنے عروج پر ہوتا ہے اس طرح پھیل کر نہیں نکلتا۔ پھیلنے اور اسکیم بنانے کے لیے وقت چاہیے۔

لیکن انجام کی اس کمزوری کے باوجود 'ہتک' کی عظمت میں شک نہیں۔ اور وہ عظمت اس کے کنٹنٹ (Content) کی عظمت ہے۔ دو تین سال پہلے الہ آباد کے ترقی پسند مصنفین کی ایک میٹنگ میں نقاد ممتاز حسین نے جب 'ہتک' کے خلاف یہ فتویٰ صادر کیا کہ یہ ترقی پسند افسانہ نہیں تو میں نے مخالفت کی تھی۔ 'ہتک' ''نئے زاویے'' کی پہلی جلد میں شائع ہوا تھا اور ترقی پسند افسانوں میں ممتاز سمجھا گیا تھا۔ ایک وقت جو چیز ترقی پسند سمجھی جائے وہ دوسرے وقت رجعت پسند کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ممتاز حسین صاحب کے سمجھانے کے باوجود! سوگندھی جب گھر کی طرف لوٹتی ہے تو سوچتی ہے:

''اسے صرف میری شکل پسند نہیں آئی۔۔۔ نہیں آئی تو کیا ہوا؟۔۔۔ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی۔۔۔ وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا، کتنی بری صورت تھی اس کی۔۔۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟... کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟۔۔۔ ٹھیک ہے، پر سوگندھی، تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا۔۔۔''

نہیں ٹھکرایا تھا، اس لیے کہ وہ ٹھکرا نہ سکتی تھی۔ وہ غلیظ سے غلیظ مرد کے ہاتھ بھی اپنا تن بیچنے پر مجبور تھی اور اسی لیے اسے نہ اپنے آپ پر غصہ تھا نہ رام لال پر بلکہ سیٹھ پر غصہ تھا۔ (اور یہ غصہ وہی ہے جو مصنف کو ہے۔ مصنف سوگندھی اور رام لال کو اس مہاجنی دور کا شکار سمجھتا ہے اس لیے انہیں بے بس اور مجبور سمجھتا ہے اور ان کے درد و غم سے تلملاتا ہے اور اس سیٹھ کے خلاف اپنے تمام غصے کا اظہار کرتا ہے کیونکہ اسے وہ اس تہذیب کا سمبل سمجھتا ہے۔)

'ہتک' کا یہ پیرا افسانے کو انسان کا زبردست المیہ بنا دیتا ہے۔ جب تک یہ نظام رہے گا، جس میں عورت کی یوں ہتک ہوتی رہے گی، وہ اپنا تن چند سکوں کے عوض غلیظ سے غلیظ شخص کے ہاتھ بیچنے پر مجبور رہے گی۔ 'ہتک' کی ترقی پسندی قائم رہے گی۔ خام ترقی پسند نقادوں کے فتوؤں کے باوجود! یہ نظام بدل جائے گا تو 'ہتک' ایک تاریخی حیثیت حاصل کر لے گا، جسے آنے والی نسلیں بربریت اور بہیمیت کی یاد کے طور پر پڑھا کریں گی۔

''سوراج کے لیے'' کا بنیادی خیال بھی انسان کے غیر فطری عزائم اور اس کے ڈھونگ کے خلاف ایک طنز ہے۔ منٹو نے اس ڈھونگ کا پول نہایت چابک دستی سے کھولا ہے۔ اس کی ایک ایک پرت ادھیڑ کر رکھ دی ہے۔ لیکن اس افسانے کا انجام بھی کمزور ہے۔ یہ اشارہ، کہ شہزادہ غلام علی ایک فطری فعل کو جس غیر فطری طریقے پر سرانجام دیتا رہا اس کے ردعمل کے طور پر اس نے ربڑ کی چیزیں نہ بیچنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اپنی جگہ کافی ہے اور منٹو جس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے وہ اچھی طرح اجاگر ہو جاتی ہے۔ لیکن منٹو اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ جس طرح سوگندھی کو غصے میں اس نے ننگی بنا دیا اسی طرح وہ شہزادہ غلام علی کو ترش انسان بناتے بناتے ننگی بنا دیتا ہے اور اس افسانے کا اختتام یوں کرتا ہے۔

''غلام علی اس کے آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ اس کا نوکر اندر داخل ہوا۔ اس کی گود میں شاید غلام علی کا دوسرا بچہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک خوشنما بیلون تھا۔ غلام علی دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹا۔۔۔ پٹاخے کی سی آواز آئی۔۔۔ بیلون پھٹ گیا اور بچے کے ہاتھ میں دھاگے کے ساتھ ربڑ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹکتا رہ گیا۔۔۔ غلام علی نے دو انگلیوں سے اس ٹکڑے کو چھین کر یوں پھینکا جیسے وہ کوئی مکروہ چیز تھی۔''

یہ انجام افسانے کو مکروہ بنا دیتا ہے اور غیر ضروری ہے۔ غلام علی کو ربڑ کی جس چیز سے نفرت تھی اس کی طرف منٹو نے ناظر کا دھیان پہلے ہی اس بات کا ذکر کر کے دلا دیا تھا کہ وہ ربڑ کی چیزیں فروخت نہیں کرتا۔ ربڑ کے غبارے کو دیکھتے ہی اس پر اس کا جھپٹنا اسے ننگی بنا دیتا ہے۔ اگر یہ واضح اشارہ دینا ضروری تھا تو پہلے اشارے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلے اشارے کے بعد یہ دوسرا اشارہ افسانے کو خام اور شہزادہ غلام علی کو ننگی قرار دیتا ہے۔

لیکن اس خامی کے باوجود یہ افسانہ منٹو کے افسانوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ بنیادی خیال کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ منٹو نے اس وقت کی سیاسی زندگی کی ایسی حقیقی تصویر کھینچی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شہزادہ غلام علی کوئی حقیقی کردار ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا

لیکن منٹو نے جس دن یہ افسانہ لکھنا شروع کیا اس سے کچھ دن پہلے یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی تھی کہ مہاتما گاندھی نے اپنے آشرم میں ایک جوڑے کی شادی اپنے ہاتھوں سرانجام دی اور اس جوڑے نے شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہوگا وہ دوستوں کی طرح رہیں گے۔ مجھے یاد نہیں منٹو نے اس خبر کو پڑھ کر کیا کہا تھا۔ وہ استہزاء سے مسکرایا تھا، اس چغدیت پر اس نے کوئی گالی اس جوڑے کو دی تھی؟ اس کے کچھ دن بعد وہ یہ افسانہ لکھنے لگا تھا۔

اس افسانے کے بنیادی خیال پر منٹو پہلے بھی ایک افسانہ ''پانچ دن'' کے عنوان سے لکھ چکا تھا۔ 'پانچ دن' میں پروفیسر کہتا ہے۔۔۔ پروفیسر۔۔۔ جو اپنی طالبات کو اپنی بچیاں سمجھتا تھا:

''میں ایک جھوٹ ہوں، بہت بڑا جھوٹ۔ میری ساری زندگی اپنے آپ سے جھوٹ بولنے اور پھر اسے سچ بنانے میں گزری ہے۔۔۔ اف! کتنا تکلیف دہ، غیر فطری اور غیر انسانی کام تھا۔ میں نے ایک خواہش کو مارا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس قتل کے بعد مجھے اور بہت سے خون کرنے پڑیں گے۔ میں سمجھتا تھا ایک مسام کو بند کر دینے سے کیا ہوگا؟ لیکن مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ مجھے اپنے جسم کے سارے دروازے بند کر دینے پڑیں گے۔''

اسی بنیادی خیال کو اور بھی ابھار کر منٹو نے ''سوراج کے لیے'' میں بیان کیا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جب ان کے والد بیمار تھے وہ اپنی نئی بیاہی بیوی کے ساتھ فرائض زندگی سرانجام دے رہے تھے۔ حیرت ہے اس حقیقت کو جاننے کے باوجود انہوں نے کیوں دوسروں کے لیے فطری راستوں کو مسدود کرنا مناسب سمجھا؟ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا (جو ان کے دوست کی بیٹی کو چاہتا تھا) کہ اگر تم پانچ سال بعد بھی اس لڑکی کو چاہو گے تو تمہاری شادی کر دی جائے گی اور انہوں نے اپنے بیٹے کو کسی دور دراز علاقے میں آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ ایک دوسرے آشرم واسی اور آشرم واسنی میں جب محبت ہوئی اور انہوں نے مہاتما گاندھی کا آشیرواد چاہا تو مہاتما گاندھی نے وہی پانچ سال کی قید لگا دی کہ آزادی کے یگیہ میں پانچ سال تک اپنے جذبات کی آہوتی دینے کے بعد بھی اگر تم ثابت قدم رہے تو میں اپنے ہاتھوں تمہاری شادی کر دوں گا۔

ان کے بیٹے پانچ برس تک ثابت قدم رہے اور مہاتما گاندھی نے ان کو اپنی محبوبہ سے شادی کی اجازت دے دی۔ دوسرے بھگت یہ قید برداشت نہ کر سکے اور وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ بھاگ گئے۔

(منٹو کو ان واقعات کا علم نہ تھا ورنہ مجھے یقین ہے کہ وہ ان پر بھی 'سوراج کے لیے' جیسے طنزیہ

افسانے لکھتا۔ جیسا کہ میں اسے جانتا ہوں، پہلے افسانے میں مہاتما گاندھی یا ان کے بدل کے طور پر کسی روحانی یا سیاسی گرو کے اس فیصلے کے بعد وہ دکھاتا کہ نوجوان پانچ سال اس لڑکی سے محبت کیے جاتا ہے، کیونکہ محبت تشنگی میں پلتی ہے، لیکن چھٹے برس جب اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اس لڑکی کو روحانی آنکھوں سے نہیں حقیقی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو وہ اس سے سخت نفرت کرنے لگتا ہے۔ دوسرے قصے پر شاید وہ افسانہ لکھنا پسند نہ کرتا یا جوں کا توں اسے لکھ دیتا اور دونوں آشرم واسیوں کو بھگا دیتا کہ یہ فطرت کے عین مطابق تھا۔)

نہ جانے مہاتما گاندھی میں یہ سادیت پسندی کیوں تھی؟ اپنی جوانی کی یاد کرتے وقت وہ دوسروں کی جوانی کی بات کیوں بھول جاتے تھے؟ لیکن وہ شاید عوام کی نفسیات کے زبردست عالم تھے اور ہندوستانی عوام کے دلوں کو کس طرح جیتا جا سکتا تھا، اسے بخوبی جانتے تھے۔ لیکن منٹو سیاست دان نہیں تھا اور وہ جہاں کہیں انسان کے فطری جذبوں کا خون ہوتے دیکھتا تھا تلملا جاتا تھا۔ 'سوراج کے لیے' میں اس کی تلملاہٹ دیکھیے۔ شہزادہ غلام علی کے منہ سے وہ کہلواتا ہے:

''دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں، ان کی تعلیم کو لوگ بھول چکے ہیں لیکن صلیبیں، دھاگے، داڑھیاں، کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں۔ ایک ہزار برس پہلے جو لوگ یہاں بستے تھے ہم ان سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آج کے مصلح کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ انسان کی شکل مسخ کر رہے ہیں۔ جی میں کئی دفعہ آتا ہے، بلند آواز میں چلانا شروع کر دوں۔ خدا کے لیے انسان کو انسان رہنے دو۔ اس کی صورت تم بگاڑ چکے ہو، ٹھیک ہے۔ اب اس کے حال پر رحم کرو۔ تم اس کو خدا بنانے کی کوشش کرتے رہے ہو لیکن وہ غریب اپنی انسانیت بھی کھو رہا ہے۔ نفس ہزاروں میں ایک دو آدمی ماریں گے۔ سب نے اپنا نفس مار لیا تو، میں پوچھتا ہوں، یہ کشتہ کس کام آئے گا؟''

اور جوں ہی انسان کے ان اساسی جذبات کو منوا نے اس افسانے میں اجاگر کرتا ہے افسانہ عظمت حاصل کر لیتا ہے۔

''ننگی آوازیں'' کا اختتام بھی 'ہتک' اور 'سوراج کے لیے' کے اختتام سے مختلف نہیں۔ افسانے کا بنیادی خیال بھی 'ہتک' کی طرح انسان کا ایک دوسرا المیہ بیان کرتا ہے۔ ایک لمبی چھت پر مہاجرین اپنی اپنی چارپائیوں کے گرد ٹاٹ باندھ کر یعنی اپنی طرف سے پردہ کر کے سوتے ہیں لیکن ان کے دائیں بائیں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لوگوں کے سونے سے ان کنواروں پر کیا گزرتی ہے جو اس طرح سونے پر

مجبور ہیں؟ اسی کا خاکہ منٹو نے اس افسانے میں کھینچا ہے۔۔۔ 'ننگی آوازیں' کا بھولو بھی خوشیا کی طرح حساس ہے کیونکہ وہ حساس نہ ہوتا تو اسے اس ماحول میں اپنی نئی بیاہی بیوی کے ساتھ سونے میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ نہ ہوتی۔ (ظاہر ہے خوشیا کی طرح بھولو کے قالب میں بھی منٹو نے اپنی حساس طبع کو ڈال دیا ہے۔) لیکن افسانہ وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں بھولو کی بھاوج اپنے دیور کی تکلیف کی اصل ماہیت کو نہ سمجھ کر اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ وہ فرائض خاوندی سرانجام دینے سے قاصر ہے۔۔۔ افسانے کا المیہ وہاں مکمل ہو جاتا ہے۔

ماپاساں اس کے بعد ایک لفظ بھی لکھنا گناہ خیال کرتا ہے لیکن منٹو ماپاساں نہیں۔ وہ اپنا غصہ اس طرح قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ اور اس لیے جہاں اس نے سوگندھی اور شہزادہ غلام علی کو غصے میں نیم دیوانہ دکھایا تھا وہاں بھولو کو بالکل دیوانہ بنا چھوڑا ہے۔۔۔ جو غصے کی اس انتہا پر پہنچ کر کوٹھے پر لگے ہوئے ٹاٹوں کو اکھاڑنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ سر پر کلن کے بانس کی ضرب کھا کر بالکل پاگل ہو جاتا ہے اور منٹو اس افسانے کو یوں ختم کرتا ہے:

''اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے، کہیں ٹاٹ لٹکتا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔''

لیکن اختتام کی اس خامی کے باوجود اس کہانی کا درد منٹو کی ایک دوسری کہانی ''شریفن'' کی طرح ناقابل فراموش ہے۔ منٹو کو غصہ ہے۔۔۔ بے پناہ غصہ۔۔۔ کہ انسان، جو احساس کی دولت سے مالا مال ہیں، کیوں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اور جب منٹو کو غصہ آئے تو قابو میں رکھنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اسی غصے میں وہ بارہا کہانی کے فن کو بھول کر نکی ہو جاتا ہے۔ 'ہتک'، 'سوراج کے لیے' اور 'ننگی آوازیں' کے یہ ایک جیسے اختتام اس کے اسی بے پناہ غصے کی چغلی کھاتے ہیں۔ لیکن شاید اسی غصے کی وجہ سے ان کہانیوں میں وہ دردمندی آ گئی ہے جو انہیں زندہ جاوید بناتی ہے!

منٹو اپنے غصے میں ہمیشہ تکنیک کو فراموش کر دیتا ہو، یہ بات نہیں۔ 'شریفن' میں اس کا غصہ اور دردمندی وہی ہے اور تکنیک سر سے پیر تک درست ہے۔ پنجاب کے فسادات اور بربریت کو دیکھ کر ہر کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ کیسے مہذب لوگ، ایک دوسرے کو چاہنے والے، ایک دوسرے کو پیار کرنے والے، ایک ساتھ کھانا کھانے اور رہنے والے اس قدر وحشی ہو گئے کہ جنہیں وہ اپنی مائیں اور بہنیں سمجھتے تھے انہیں کی عصمت دری پر اتر آئے؟ منٹو نے 'شریفن' میں اس کا جواب دیا ہے اور افسانے کی آخری

لائن لوہے کی گرم سلاخ کی طرح دل ودماغ پر ہمیشہ کے لیے ایک نشان بنا دیتی ہے۔

میں منٹو کی کہانیوں کو ہمیشہ پسند کرتا رہا ہوں۔ اس کے غصے اور جھنجھلاہٹ کے لیے میرے دل میں ہمیشہ ہمدردی رہی ہے۔ حالانکہ انسان کے بارے میں اس کے نقطہ نظر سے مجھے اتفاق نہیں رہا۔ منٹو، مہاتما گاندھی، بدھ یا عیسیٰ مسیح پر طنز کر سکتا ہے۔ میں اس کے طنز کو پسند بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں کہ خود بھی وہ طنز کرنا پسند کروں۔ جب منٹو انسان کے اساسی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ غلط بات نہیں کرتا، کیونکہ ہماری حیوانیت، خام انسانیت، ہمارے پروشنز اور ہمارے کردار کی خامیوں کو بتانا غلط نہیں۔ لیکن جب وہ ان کا جواز دیتا ہوا ان پروشنز کو (کہیں کہیں) جائز سمجھتا ہے اور انسان کے بنیادی جذبات پر کسی طرح کی قید پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اس کے بنیادی جذبوں کو کھل کھیلنے کا موقع دینا ہی اسے انسان بنائے رکھنا ہے (منٹو کی کئی کہانیاں۔ "ممی"، "بڑھیے کلمہ" وغیرہ اس بات کی نظیر ہیں۔) تو میری رائے میں وہ غلطی پر ہے۔ انسان کے بنیادی جذبے وہی ہیں جو اس کے جد امجد کے! بنیادی طور پر وہ حیوان تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب تہذیب و تمدن کی قیود اس کے ان بنیادی جذبوں کے اوپر سے ہٹ جاتی ہیں تو وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آ جاتا ہے۔۔۔ خودغرض، خود پرست، کمینہ، لالچی، غصہ ور، نفس پرست، حیوان! اپنے ان بنیادی جذبوں کو دبا کر یا انہیں سدھار کر وہ انسان بنا ہے۔ جس چیز کو آج ہم انسانیت کہتے ہیں۔۔۔ جو بربریت کی متضاد ہے۔۔۔ اسے اس حیوان نے (جسے ہم آج انسان کہتے ہیں) صدیوں کی محنت سے حاصل کیا ہے اور اس کے حصول میں ان بے شمار پیغمبروں، مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کا ہاتھ ہے جنہوں نے اپنے بنیادی جذبات کے باوجود فکر و عمل کی وہ راہیں نکالی جن پر چل کر وہ حیوان انسان بنا۔ منٹو انسانیت پرست ہے، اس لیے جب وہ انسانوں کو حیوانوں جیسے فعل کرتا دیکھتا ہے تو تلملا اٹھتا ہے۔ لیکن انسان کیوں ایسا کرتے ہیں؟ اسے کس پر غصہ کرنا چاہیے؟ کس پر اپنے قلم کا وار کرنا چاہیے؟ اسے معلوم نہیں۔ علی سردار جعفری نے "چغد" کے دیباچے میں منٹو کے کرداروں پر لکھتے ہوئے، اس کے اس غصے کا خوب تجزیہ کیا ہے:

"یہ (منٹو نے جن کرداروں کا خاکہ اپنی کہانیوں میں کھینچا ہے) کبھی انسان تھے یا ان میں انسان بننے کی صلاحیت تھی، لیکن اس سماج نے، جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ پر ہے، ان سب کو جانور بنا دیا ہے۔۔۔ وہ جانور۔۔۔ جن کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں۔۔۔ لیکن جو پھر بھی انسان نہیں ہیں۔ منٹو جھنجھلا جاتا ہے۔ وہ ان کی روح کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے

سینوں کے اندر انسانی دل دھڑک رہے ہیں۔

لیکن اسی سماج نے انسانی کردار بھی پیدا کیے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کو حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ ان کے چہرے بھی انسانوں کے سے ہیں، ان کی روح بھی انسانوں کی سی ہے اور ان کے دل بھی! جد و جہد نے انہیں ان کی دولت واپس دے دی ہے، لیکن منٹو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی دہشت پسندی پر اتر آتا ہے اور اگر اس کا بس چلے تو وہ سیاسی دہشت پسندی پر بھی آمادہ ہو جائے۔

''منٹو کے افسانے'' کے دیباچے میں منٹو لکھتا ہے:

''جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں دھڑکا نہ رہے گا کہ یہ خود بخود چل جائے گا تو میں اسے لہراتا ہوا نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا یا خود چھلنی ہو جاؤں گا۔ اس موت پر جب میرا کوئی نقاد کہے گا کہ پاگل تھا تو میری روح ان لفظوں کو ہی سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھا لے گی اور اپنے سر پر آویزاں کر لے گی۔''

لیکن منٹو کو یہ معلوم نہیں کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود انسان یعنی اس کے حیوانی جذبے ہیں۔ جنہوں نے بظاہر اس دور میں سرمایہ داری کی شکل لے لی ہے لیکن جو درحقیقت ہمیشہ اس کے اندر سے باہر نکلنے کو کھلبلی مچاتے رہتے ہیں۔ انسان کو اپنے اجداد کی طرح ہمیشہ نبرد آزما رہنا ہے۔ ایک شخص، کے سینے میں پستول کی ساری گولیاں ختم کرنے سے اس دشمن کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ لڑائی ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ انسان نظام کے بعد نظام بدلتا رہے گا اور آخر کار یا تو اپنے حیوانی جذبوں کو ختم کر کے دیوتا بن جائے گا یا خود ختم ہو جائے گا۔۔۔ لیکن جب تک دونوں میں سے ایک چیز نہیں ہو جاتی، وہ انسان بننے کی کوشش کرتا رہے گا۔ یہ مسلّم ہے۔ علی سردار جعفری نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

''منٹو اپنے اصلی دشمن کو نہیں پہچانتا اور خالی ہوا میں وار کرتا ہے جس کی چوٹ کسی پر نہیں پڑتی۔ اس لیے اس کی دہشت پسندی اپنے آخری تجزیے میں خود انسان کے خلاف دہشت پسندی بن جاتی ہے، جس سے منٹو کو بے انتہا محبت تھی۔''

لیکن منٹو کے بہترین افسانوں میں اس کی انسان دوستی، انسان پرستی اور دردمندی اپنے عروج پر ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر اس نے کہا ہوگا:

''سردار مسخرہ ہے، انسانی دل کی ان تاریکیوں کا اسے علم نہیں جن کا پتہ میں نے مدت ہوئی پالیا ہے۔''

فلمستان کی دو سال کی ملازمت میں چودہ پندرہ ہزار روپیہ میں نے اکٹھا کر لیا تھا۔ ارادہ تھا ہندی، اردو دونوں میں پبلشنگ شروع کر دوں گا۔ منٹو اور میں دونوں فلمستان سے الگ ہو رہے تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا:

''میں ہندی میں پبلشنگ شروع کروں گا تو تمہاری تیس بہترین کہانیاں چھاپوں گا۔ کتنے فی صدی رائلٹی لو گے؟''

''رائلٹی وائلٹی چھوڑو۔'' منٹو نے کہا ''تم پانچ سو آج نقد دے دو پھر چاہے قیامت تک افسانے شائع کرتے رہو۔''

میں منٹو کے افسانے ضرور شائع کرتا لیکن کچھ ہی دن بعد میں بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دیا اور میں لاہور جانے کے بجائے پنج گنی کے Bell Air سینی ٹوریم میں چلا گیا۔ گذشتہ پانچ سال سے میں اس کوشش میں ہوں کہ منٹو سے کیا اپنا وعدہ پورا کروں لیکن ابھی تک ممکن نہیں ہوا۔ حالانکہ افسانے ترجمہ کرائے پڑے ہیں۔ منٹو اتنی جلدی رفاقت یا عداوت چھوڑ کر چل دے گا، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اپنی کتابیں چھوڑ کر پہلے اس کے نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہندی میں شائع کر دیتا۔

منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے:

''بچپن اور لڑکپن میں میں نے جو کچھ چاہا وہ پورا نہ ہونے دیا گیا۔ یوں کہو کہ میری خواہشات کچھ اس طرح پوری کی گئیں کہ ان کی تکمیل میرے آنسوؤں اور میری ہچکیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں شروع ہی سے جلد باز اور زود رنج رہا ہوں۔ اگر میرا جی کسی مٹھائی کھانے کو چاہا ہے اور یہ چاہ عین وقت پر پوری نہیں ہوئی تو میرے لیے اس خاص مٹھائی میں کوئی لذت نہیں رہی۔ ان امور کی وجہ سے میں نے ہمیشہ اپنے حلق میں ایک تلخی سی محسوس کی ہے، اور اس تلخی کی شدت بڑھانے میں اس افسوس ناک حقیقت کا ہاتھ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی، جس کو اپنے دل میں جگہ دی اس نے نہ صرف میرے جذبات کو مجروح کیا بلکہ میری اس کمزوری (محبت) سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔

جب اس ضمن میں مجھے ہر طرف سے ناامیدی ہوئی۔۔۔ یعنی جس کو میں نے دل سے چاہا اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔۔۔ تو میری طبیعت بجھ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ میں ریگستان میں ایک بھونرے کی مانند ہوں جسے رس چوسنے کے لیے حد نظر تک کوئی پھول نظر نہیں آ سکتا، لیکن میں اس کے باوجود محبت

کرنے سے باز نہ رہا اور حسب معمول کسی نے بھی میرے اس جذبے کی قدر نہ کی۔ جب پانی سر سے گذر گیا اور مجھے میرے نام نہاد دوستوں کی بے وفائیاں اور سرد مہریاں یاد آنے لگیں تو میرے سینے کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ میرے جذباتی، سرمدی اور ناطق وجود میں ایک جنگ سی چھڑ گئی۔ ناطق وجود ان لوگوں کو ملعون و مطعون گردانتے ہوئے اور گذشتہ واقعات کی افسوس ناک تصویریں دکھاتے ہوئے اس بات کا طالب تھا کہ میں آئندہ سے اپنا دل پتھر کا بنا لوں اور محبت کو ہمیشہ کے لیے باہر نکال پھینکوں، لیکن جذباتی وجود ان افسوس ناک واقعات کو دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مجھے فخر کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ میں نے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں محبت کیے جاؤں کہ یہی کائنات کی روح رواں ہے۔

یہ جنگ خدا جانے کس نامبارک روز شروع ہوئی کہ اب میری زندگی کا ایک جزو بن کر رہ گئی ہے۔ دن ہو یا رات، جب کبھی مجھے فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہیں میرا ناطق اور جذباتی وجود ہتھیار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان لمحوں میں اگر میرے ساتھ کوئی ہم کلام ہو تو میرا لہجہ یقیناً کچھ اور قسم کا ہوتا ہے۔ میرے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی گھل رہی ہوتی ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ اپنے لہجے کو درشت نہ ہونے دوں اور بعض اوقات اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں لیکن اگر میرے کانوں کو کوئی ناگوار خبر سنائی جائے یا میں کوئی ایسی چیز محسوس کروں جو میری طبیعت کے یکسر خلاف ہو تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے سینے کی گہرائیوں سے جو کچھ بھی اٹھے زبان کے راستے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کی تلخی اور درشتی کا احساس مجھے اس وقت کبھی نہیں ہوا، اس لیے کہ میں اپنے اخلاص سے ہمیشہ اور ہر وقت باخبر رہتا ہوں اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں نے اپنے ملنے والوں میں سے یا کسی دوست کو ناخوش کیا ہے تو اس کا باعث میں نہیں ہوں بلکہ یہ خاص لمحات ہیں جب میں دیوانے سے کم نہیں ہوتا......"

منٹو کی کہانی، جس کا عنوان "ایک خط" ہے، پڑھتے پڑھتے جب یہ سطریں میری نظر سے گذریں تو مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں منٹو سے اس وقت کیوں نہ ملا جب اس کا ناطق وجود سویا ہوا تھا اور وہ دوستوں کی بے وفائیوں اور سرد مہریوں سے ناآشنا تھا کیونکہ دوستوں کی بے وفائیوں اور سرد مہریوں کا گلہ اسے ہی نہیں مجھے بھی ہے۔ ان سطروں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ منٹو اپنے بارے میں نہیں میرے بارے میں یہ لکھ رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے ناطق وجود نے مجھے کبھی اس طرح پریشان نہیں کیا۔ کسی دیرینہ

دوست نے بے وفائی کی، بے مہری کا سلوک کیا، تو خواہ تکلیف کتنی بھی کیوں نہ ہوئی، لہجے میں تلخی نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ جانے کہیں پڑھ کر یا اپنے والد کے اور اپنے تجربوں سے میں نے بہت پہلے دوستی اور محبت کے بارے میں ایک طرزِ عمل اپنا لیا تھا اور وہ یہ کہ دوستی اور محبت یکسر یک طرفہ چیز ہے۔ میں جسے اپنے دوست کے طور پر چاہتا ہوں، جس کی قربت سے مجھے سکھ ملتا ہے اس سے دوستی بنائے رکھنا، اس سے محبت کرنا میرا کام ہے۔ جب اس سے محبت کرتے کرتے اس بات کی آرزو ہونے لگتی ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے، اسی طرح جیسے کہ میں اس سے کرتا ہوں، اور جب ایسا نہیں ہوتا تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ پہلے یہ تکلیف بڑی شدت سے ہوتی تھی لیکن اب نہیں ہوتی۔ میں اس سے بدستور دل میں محبت کرتا رہتا ہوں لیکن بظاہر خاموش ہو جاتا ہوں۔ اور چونکہ بغیر محبت کیے نہیں رہا جاتا اس لیے دوستی نبھانے کے لیے کوئی دوسرا چن لیتا ہوں اور میں اپنے آپ کو ایسے پھول سا پاتا ہوں جو رس اور گندھ سے بھرا ہے۔ اسے کوئی بھونرا اچھا لگتا ہے تو اپنی خوشبو سے اسے بلا لیتا ہے۔ رس اور خوشبو پلاتا ہے، خوش ہوتا ہے، لیکن بھونرا چلا جاتا ہے۔ وہ اس کی یاد دل میں رکھتا ہے اور کسی دوسرے کو بلا لیتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو بے حد تنہا اور اداس پاتا ہے لیکن اس سکھ کی یاد اس کے دل کی اداسی کو دور کر دیتی ہے جو اس نے محبت کا رس اور خوشبو لٹانے میں پایا تھا......

منٹو نے یہ سطریں بڑے احساس کے ساتھ لکھی ہیں، اور چونکہ میں نے منٹو کو قریب سے دیکھا ہے اس لیے ان کی حقیقت سے مجھے انکار نہیں۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں منٹو سے اس وقت ملا جب اس کا ناطق وجود اس کے حلق کو تلخ اور لہجے کو درشت کر چکا تھا۔

منٹو ٹھیک کہتا ہے، وہ دانستہ کسی کو تکلیف نہ پہنچانا چاہتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب دو بار اس نے مجھے غصے کی شدت میں گالی دی تو فوراً اس پر افسوس کا اظہار کر دیا۔ دونوں بار مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہو سکتے ہیں، لیکن ہم بہت دیر میں ملے تھے۔ جوانی کے شروع میں ملے ہوتے تو یقیناً بہت اچھے دوست ہوتے۔

بمبئی سے آنے کے بعد منٹو کی زیادہ خبر نہیں ملی۔ اس کا ایک خط لاہور سے آیا تھا، مکتبہ جدید کے لیٹر پیڈ پر کہ وہ محمد حسن عسکری کے ساتھ مل کر ایک پرچہ نکال رہا ہے اور یہ کہ میں اس کے لیے افسانہ لکھوں۔ میں ان دنوں بیمار تھا۔ جن دوستوں کے بھروسے الہ آباد آیا تھا انہوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور سخت ذہنی اور جسمانی کش مکش میں مبتلا تھا۔ لیکن میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ میں افسانہ ضرور لکھوں

گا۔ پھر نہ جانے وہ پرچہ نکلا یا نہیں، نکلا تو مجھ تک نہیں پہنچا۔ اتنا یقین ہے کہ اس کے دو ایک نمبر آتے تو میں جیسے بھی ہوتا اس کے لیے ضرور افسانہ لکھتا۔

بس اس خط کے علاوہ بمبئی کی فلمی زندگی کے بعد منٹو سے کسی قسم کی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ ہاں، جب بھی اس کا کوئی نیا افسانہ آتا اس کا ذکر گھر میں ہوتا، دو ایک دن میں اور کوشلیا اس کی باتیں کرتے اور پھر زندگی کے تقاضے دوسری باتوں میں الجھا لیتے۔ پھر اچانک اسی جنوری میں سنا کہ منٹو رحلت کر گیا۔ یکبارگی یقین نہیں آیا۔ میرے دوست اور پڑوسی بھیرو پرشاد گپت نے مجھے یہ خبر دی۔ وہ منٹو کے بڑے بھگت ہیں۔ دس برس ہندی کے سب سے کثیر الاشاعت پرچے ''مایا'' کی ادارت کر کے اب ''کہانی'' میں آئے ہیں۔ وہ 'مایا' میں منٹو کے متعدد افسانوں کے ترجمے شائع کر چکے ہیں اور ابھی کچھ ہی دن پہلے انہوں نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو ماہانہ ''کہانی'' کے سالنامے میں شائع کیا تھا جس نے منٹو کا سکہ ہندی کے قارئین کے دلوں پر جما دیا۔

مجھے ناگہاں بھیرو کی بات کا یقین نہیں آیا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ''امرت پتریکا'' میں خبر چھپی ہے اور ریڈیو سے براڈ کاسٹ بھی ہوئی ہے۔ میں نے ریڈیو کے اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر گوپال داس کو فون کیا کہ آیا واقعی ایسی کوئی خبر نشر ہوئی ہے؟ ان کی لڑکی سخت بیمار تھی۔ انہوں نے خبریں نہ سنی تھیں۔ تب میں نے سٹوڈیو فون کیا۔ وہاں ڈیوٹی پر منیر صاحب رہتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں ضرور معلوم ہوگا، لیکن ابھی ٹرانسمشن شروع نہ ہوئی تھی اور منیر صاحب آئے نہ تھے۔ مگر مجھے چین نہ آیا، چراغ جلے میں نے پھر انہیں فون کیا۔ انہوں نے نہ صرف اس خبر کی تصدیق کر دی بلکہ کہا کہ پاکستان ریڈیو سے آدھ گھنٹے کا پروگرام بھی نشر ہوا ہے۔

تب میں نے آ کر کوشلیا کو بتایا کہ یہ خبر ٹھیک ہے۔ وہ بے ساختہ آنکھیں بھر لائی۔ میرے ہاں ان دنوں ہندی کی مشہور ادیبہ اور افسانہ نگار کماری کرشنا سوبتی آئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھانے کو بالکل جی نہ چاہتا تھا لیکن کچھ بچوں اور کچھ مہمان کے خیال سے کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد انہیں منٹو کے بارے میں بتاتا رہا۔

الہ آباد میں منٹو کے جاننے والوں میں میں اور محمود احمد ہنر تھے۔ کچھ لوگوں نے اس کا نام سنا تھا اور کچھ نے اس کے افسانے پڑھے تھے۔ بہر حال بھیرو پرشاد گپت اور ہنر نے مل کر طے کیا کہ منٹو کی اس بے وقت موت پر اظہارِ افسوس کے لیے اردو، ہندی ادیبوں کی ایک میٹنگ کی جائے۔

اگر چہ گذشتہ غلط روش کی وجہ سے ترقی پسند ادیبوں میں خاصا انتشار ہے لیکن الہ آباد میں بار ہا ترقی پسند کافی تعداد میں مل بیٹھتے ہیں اور خاصے اچھے جلسے ہو جاتے ہیں۔ علی سردار جعفری اور احتشام حسین اور راجندر سنگھ بیدی کے سلسلے میں جو جلسے ہوئے ان میں خاصے لوگ شامل ہوئے لیکن منٹو کی وفات کے سلسلے میں جو میٹنگ ہوئی وہ کچھ ایسی بے تکی ہوئی کہ اس کی تلخ یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

پہلے میٹنگ میرے یا فراق صاحب کے ہاں کرنے کا ارادہ تھا لیکن پھر، نہ جانے کیسے، جب اس کا اعلان ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ میٹنگ چوک کے ایک ایسے پبلشر کے ہاں ہو رہی ہے جو ہندی کے کئی جاسوسی پرچے ایک ساتھ نکالتے تھے اور اب سال بھر سے اردو میں ایک جاسوسی پرچہ نکال رہے ہیں۔ پڑھے لکھے تو خاک نہیں ہیں لیکن ادھر جب سے ان کے پاس پیسہ ہو گیا ہے ان کی بڑی خواہش رہتی ہے کہ دو ایک ادیب ان کی صحبت میں رہیں۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کبھی اس کو یا کبھی اس کو کافی ہاؤس میں مدعو کرتے رہتے تھے اور ہمیشہ جب بل آتا تو جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر طشتری میں رکھتے۔

ان دنوں ہنر صاحب غالباً ان کے ہاں کام کرتے تھے اس لیے میٹنگ وہیں کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن بدقسمتی سے صبح سے مطلع ابر آلود ہو گیا اور دس گیارہ بجے سے بارش ہونے لگی۔ جنوری کا مہینہ اور بارش۔ شام ہوتے ہوتے خوب سردی ہو گئی۔ چھاتے برساتیاں تانے رکشوں پر میں، کوشلیا، کماری کرشنا سوبتی اور کماری دیشی سیٹھ ان پبلشر صاحب کے یہاں پہنچے۔ سائیکلوں پر ہندی کے دو نوجوان افسانہ نگار کملیشور اور دشنیت بھی بھیگتے ہوئے ساتھ ہو لیے۔

دوسری منزل پر ان کا دفتر اور جائے رہائش ہے۔ بار جے پر ٹاٹ کے پردے لگا کر انہوں نے دفتر لگا رکھا ہے۔ پردوں کے باوجود سخت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ تین عورتوں کا ساتھ، میں کچھ دیر سے پہنچا تھا۔ لیکن یہ جان کر تسلی ہوئی کہ ابھی بہت لوگ نہیں آئے۔ صرف ''نیا ہند'' کے مجیب آئے تھے اور یہ جان کر کہ بارش کے باعث لوگ دیر سے آئیں گے، چلے گئے تھے۔

دفتر کی میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم اندر کے بڑے کمرے میں آئے جس میں کچھ جگہ تو چھت تک لگی کتابوں نے گھیر رکھی تھی، باقی حصے میں قالین بچھا تھا اور صوفے پڑے تھے جن کی پشت کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ دائیں طرف ایک میز پر ریڈیو پڑا تھا جسے بجانے کے لیے پبلشر صاحب بے چین نظر آتے تھے۔ درمیان میں ایک گول میز لگی تھی۔ کمرے کی ہر چیز زبانِ حال سے پکار پکار کر صاحب خانہ

کی کورزوتی کا اعلان کر رہی تھی لیکن باہر کی سردی کے مقابلے میں کمرہ گرم تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے باوجود ایک بھی اور ادیب نہ پہنچا اور بارش اور بھی زور سے شروع ہوگئی تو میٹنگ شروع ہوئی۔ میرا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا۔ موقعے کی سنگینی کے باوجود میں دل ہی دل میں ہنسا۔ اس میٹنگ میں ہم کیا کہیں گے، جو اپنے گھر میں نہ کہہ چکے تھے؟ کیونکہ صاحب خانہ اور ان کے صاحب زادے کو چھوڑ کر آٹھ میں سے سات لوگ تو میرے ہی ہاں سے آئے تھے!

لیکن میٹنگ شروع ہوئی۔ ہنر نے منٹو کے ایک مجموعے ''یزید'' کا آخری مضمون ''جیب کفن'' پڑھنا شروع کیا جو منٹو نے پاکستان میں اپنی ادبی کاوشوں اور وہاں کی ادبی زندگی کے بارے میں لکھا تھا:

''ملک کے بٹوارے سے جو انقلاب برپا ہوا اس سے میں ایک عرصے تک باغی رہا اور اب بھی ہوں لیکن بعد میں اس خوفناک حقیقت کو میں نے تسلیم کرلیا۔

میں نے اس خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں سے بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا: عرق انفعال کے، مشقت کے۔۔۔ جو اس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی، ان آنسوؤں کے جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ انسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کیوں ختم نہیں کر سکے......''

ہنر پڑھتے جا رہے تھے اور میری آنکھوں میں ''سیاہ حاشیے'' کے کئی موتی چمک اٹھے تھے۔ اپنے شوق کی سرگرمی میں کسی ترقی پسند نقاد نے ان کا مذاق یوں اڑایا تھا کہ ''سیاہ حاشیے'' میں منٹو نے لاشوں کی جیبوں سے سگریٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی چیزیں نکال کر جمع کی ہیں۔

میں محسوس کرسکتا ہوں کہ منٹو کو اس تنقید سے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ یقیناً اس نقاد نے منٹو کی اس روحانی تکلیف کو نہیں سمجھا جس کے زیر اثر اس نے وہ سب ''لطیفے'' لکھے۔ اس میں شک نہیں کہ ''سیاہ حاشیے'' کے بیشتر موتی آبدار نہیں، ان میں آنسوؤں کی نمی نہیں، شک پرستی کی بے آبی ہے لیکن 'حیوانیت'، 'جوتا'، 'کسر نفسی' اور 'صفائی پسندی' منٹو کی جھنجھلاہٹ، غصے، دردمندی اور انسان دوستی کے شاہد ہیں۔ یوں 'کرامات'، 'مناسب کارروائی'، 'صدقے اس کے' کا طنز بھی ناقابل فراموش ہے۔

''......میں انسان ہوں، مجھے غصہ آیا۔'' ہنر پڑھ رہے تھے، ''مجھے غصہ آیا۔ میں نے اس عالم میں اس کیچڑ کے جواب میں ایسی کیچڑ تیار کی جو بہت دیر تک میرے نام نہاد نقادوں کے چہروں پر جمی رہتی، لیکن میں

نے سوچا اور محسوس کیا کہ ایسا کرنا غلطی ہے۔اینٹ کا جواب پتھر سے دینا انسان کی خصلت ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن خاموش رہنا اس کی دانش مندی ہے، اس کا تحمل ہے، اس کی بردباری ہے......"

اور مجھے راشد کے مذاق کے جواب میں منٹو کا گالیاں دینا اور میری تنقید کے جواب میں اس کی تلملاہٹ یاد آئی۔اس وقت وہ انسان تھا۔۔۔اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والا لیکن زندگی کے تجربوں نے غالباً اسے بردبار اور تحمل مزاج بنادیا۔منٹو کی یہ جھانکی میرے لیے نئی تھی۔کاش ایسے میں اس سے میری ملاقات ہوئی ہوتی۔

اس مضمون کے بعد میں نے ریڈیو اور فلمی زندگی کے سلسلے میں اور منٹو کی کہانیوں کے بارے میں وہی سب کچھ کہا جو میں ہمیشہ کہا کرتا تھا اور جسے سب نے سن رکھا تھا۔حالانکہ کوشلیا وہ سب باتیں کئی بار سن چکی تھی لیکن نہ جانے کیوں پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔جب میں نے اپنی بات ختم کی تو میں دیکھا کہ اس کی آنکھیں پرنم ہیں اور ناک کچھ زیادہ لمبی لگ رہی ہے۔اگر پرمٹ کا جھگڑا نہ ہوتا اور ہم لاہور سے اتنی دور نہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ کوشلیا اپنی خواہش کے مطابق اس موقعے پر صفیہ بھابی کے پاس لاہور جا پہنچتی۔

وقت زیادہ ہونے لگا تھا۔میں اٹھا کہ صاحب خانہ کھیسیں نکالتے ہوئے ایک ہاتھ میں چائے کا پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کی طشتری لیے ہوئے آئے۔ان کے پیچھے پیچھے ان کے صاحبزادے اور نوکر چائے کے پیالے اور طشتریاں لیے ہوئے تھے۔

ایک طشتری انہوں نے میرے سامنے رکھی۔

"مجھے خواہش نہیں۔"

اور وہ چائے کا پیالہ لیے کوشلیا کی طرف بڑھے۔

غصے سے کوشلیا اٹھ کھڑی ہوئی۔رونے کی وجہ سے لال آنکھیں غصے سے تمتما رہی تھیں۔"یہ کوئی موقع ہے چائے پینے کا؟" اس نے کہا اور باہر کی طرف بڑھی۔

"آپ پہلی بار آئے تو کیا منہ بھی میٹھا نہ کیجئے گا......؟" ہیں، ہیں، کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

اور میں سوچنے لگا کہ منٹو ایسے موقعے پر ہوتا تو ان کے ایسے پرخچے اڑاتا کہ طبیعت صاف ہو جاتی، لیکن میں نے ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے سمجھایا کہ پھر کبھی میٹنگ رکھئے گا تو ڈٹ کر کھائیں گے۔

اور ہم سب چلے آئے۔ پانی کو جیسے اسی روز برسنا تھا۔ ایسا پڑ رہا تھا کہ پھر کبھی موقع نہ ملے گا۔

اس میٹنگ کے تین چار روز بعد کی بات ہے۔ صبح میں اپنی میز پر آ کر بیٹھا تو ۳۱ جنوری کا ''آئینہ'' میری میز پر پڑا تھا۔ صفحے پلٹتے ہوئے اچانک سیاہ حاشیوں سے گھرے کرشن چندر کے مضمون پر نظر گئی: سعادت حسن منٹو۔۔۔ خالی بوتل، بھرا ہوا دل۔ ایک ہی نظر میں سارا مضمون پڑھ گیا۔ بڑے احساس کے ساتھ کرشن نے مضمون لکھا ہے۔ اگر اس کا انجام افسانوی نہ ہوتا تو اور بھی اچھا لگتا۔ کرشن کی یہ عادت ہے، اور اس کے لیے اس کا بے پناہ تخیل ذمہ دار ہے، کہ وہ حقیقت کے ساتھ افسانہ ملا دیتا ہے۔ لیکن اس خامی کے باوجود مجھے مضمون بہت پسند آیا اور میں نے جا کر کوشلیا سے کہا: ''کرشن نے منٹو پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔'' کوشلیا کرشنا سوبتی کے ساتھ باہر باغیچے میں بیٹھی دھوپ لے رہی تھی۔ اس نے فرمائش کی کہ میں مضمون اسے سنا دوں۔

میں اندر سے ''آئینہ'' اٹھا لایا اور چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر مضمون سنانے لگا۔ اچانک جب آدھا مضمون ختم کر کے ان سطروں پر پہنچا: ''منٹو ۴۲ سال کی عمر میں مر گیا۔ ابھی اس کے کہنے اور سننے کے دن تھے۔ ابھی ابھی زندگی کے تلخ تجربوں نے، سماج کی بے رحمیوں نے، مروجہ نظام زندگی کے تضاد نے اس کی بے تحاشا انفرادیت اور ناطرفداری ختم کر کے اس سے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' جیسی کہانی لکھوائی تھی۔ غم منٹو کی موت کا نہیں۔۔۔ موت ناگزیر ہے۔۔۔ غم ان ناتخلیق کردہ شہ پاروں کا ہے جو صرف منٹو ہی لکھ سکتا تھا...... '' کہ میرے گلے میں عجیب سی بھراہٹ پیدا ہوئی اور پڑھنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ دراصل یہ بھراہٹ اسی وقت پیدا ہو گئی تھی جہاں کرشن نے لکھا ہے: ''آل انڈیا ریڈیو بھی کھلا ہے، میڈن ہوٹل کا بار بھی، اردو بازار بھی۔۔۔ کیونکہ منٹو ایک بہت معمولی آدمی تھا۔ وہ ایک غریب ادیب تھا۔ وہ وزیر نہ تھا کہ کہیں کوئی جھنڈا اس کے لیے سرنگوں ہوتا۔۔۔ وہ ایک ستائی ہوئی زبان کا غریب اور ستایا ہوا ادیب تھا۔'' لیکن میں بڑی کوشش سے اس بھراہٹ کو روک کر مضمون سنائے جا رہا تھا۔ مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے اچانک پڑھنا مشکل ہو گیا۔ میں پڑھ رہا تھا: ''اردو ادب میں اچھے اچھے افسانہ نگار پیدا ہوئے لیکن منٹو دوبارہ پیدا نہیں ہوگا اور کوئی اس کی جگہ لینے نہیں آئے گا۔ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور راجندر سنگھ بیدی بھی، عصمت چغتائی بھی، خواجہ احمد عباس بھی اور اوپندر ناتھ اشک بھی۔۔۔'' اور آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ کچھ اور سطریں اسی حالت میں میں نے پڑھیں: ''ہم سب لوگ۔۔۔ اس کے رقیب،

اس کے چاہنے والے، اس سے جھگڑا کرنے والے، اس سے پیار کرنے والے، اس سے نفرت کرنے والے، اس سے محبت کرنے والے۔۔۔رفیق اور ہم سفر تھے اور آج، جب وہ ہم میں نہیں ہے، ہم میں سے ہر ایک نے موت کے شہتیر کو اپنے شانے پر محسوس کیا ہے۔" آنسوؤں نے بینائی کو ڈھک لیا۔ اخبار کو وہیں پھینک کر میں اندر اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر شام تک باہر نہیں آیا۔

آج جب میں اس دن کی یاد کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ میرے والد نے میرے دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند کی تھیں، میں نہ رویا تھا۔ والد سے تو خیر مجھے محبت نہ تھی، لیکن میری ماں جب مریں تو بھی آنسو میری آنکھوں میں نہ آئے اور اب اس مضمون کو پڑھتے ہوئے، جسے میں خام سمجھتا تھا، بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔اور منٹو میرا رشتہ دار نہ تھا، بھائی نہ تھا، دوست نہ تھا۔ میرا دشمن تھا!

۵۔اپریل ۱۹۵۵ء